

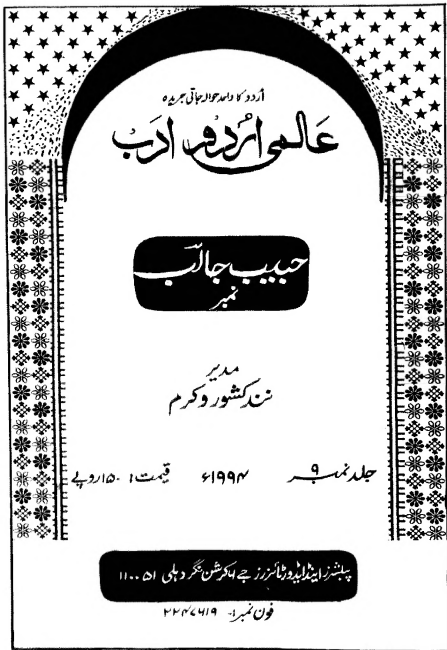
حبیب جالب

شخصیت اور شاعری

عالمی ترغیب آئینہ



مدیر
نزد کشور و کرم



جاری کنندہ

ویڈیو پرنٹ میڈیا ہے۔ ہاکرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

دار پہنچے کھنڈ والے انسانوں کے نام
طالب علموں محنت کا اور دستاویز کا نام
دنیا بھر کے اپنے جیسے دیرالو کا نام
حالیہ

ترتیب

نند کشور و کرم

پیش لفظ

اعتراف

- ۷ احمد بشیر
۱۱ احمد ندیم قاسمی
۱۴ انتظار حسین
۲۰ انور سدید
۲۴ توقیر حقیقتی
۲۸ زاہدہ جانا
۳۳ زہرہ نگاہ
۳۷ سبط حسن
۳۹ سلیم اختر
۴۳ شاہد شیدائی
۵۳ عبادت بریلوی
۵۴ عبدالقادر حسن
۵۹ عبداللہ ملک
۶۲ فارغ بناری
۶۴ فردوس حیدر
۶۸ محسن احسان
۷۰ محمد حسن
۷۹ وزیر آغا
۸۱ وحید قریشی
۹۳

- میں نہیں ماننا
جالب کی انفرادیت
آج کا نظیر اکبر آبادی
جالب۔۔ انقلابی حقیقت کی ایک مثال
اختلاف کا شاعر
یہ عشق نہیں آساں
روداد و فادار پہ
سچا عوامی شاعر
اجبوت شاعر
روداد
نظر سے کا شاعر
یہ جرم ہے مرا کہ مجھے ہو گئی خبر
گر یہاں جاگ جالب
ایک سچا عوامی شاعر حبیب جالب
مخالف، ہواؤں کا شاعر
دل در پردہ، سرکشیدہ
حبیب جالب۔ ایک جاترہ
حبیب جالب
حبیب جالب کا شعری سفر
غزلیں
کلام جالب

۱۴۴	سید حفیظ احمد	حالب کا ایک یادگار انٹرویو
۱۷۹	سعید پرویز	میراجانی میرا باب
۱۸۳	منظور اے چوہدری	وہ حالب ہم کو چھوڑ گیا

بیاد حالب

۱۹۲	احمد ندیم قاسمی	حبیب حالب
۱۹۵	افضل توصیف	زمین کا آدمی
۲۰۲	سعید انجم	حالب کے دو کبوتر
۲۰۷	سلیمان اطہر جاوید	حبیب حالب: ایک یادگار سلاقات
۲۱۴	فہیم الغامری	نوک نشتر
۲۲۰	عابد بریلوی	عوامی شاعر حبیب حالب
۲۲۴	مشرف عالم ذوقی	اک پنہارہ عوامی شاعر
۲۳۰	نند کشور وکر	عوام کا محبوب شاعر حبیب حالب
۲۳۵	وحید الؤر	مرحوم حبیب حالب

نظیں کلام حالب

دیباچے پیش لفظ

۲۴۱	الطاف گوہر	حرف سردار
۳۲۶	امین مغل	انسان دوست
۳۳۱	سعیدہ گزدر	شوقی آوارگی
۳۳۴	عندلیب شادانی	برگ آوارہ
۳۵۲	قصور گردیزی	قفص در قفس
۳۶۶	مخدوم علی خان	روشن مستقبل شاعر
۳۷۳	ہمایوں گوہر	پیش نامہ

متفرق کلام

۳۷۶		آر دو کلام
۴۰۲		پنجابی کلام

جالب کی چند تحریریں اور خطوط

۴۱۴	خط جالب
۴۱۵	سر آغاز
۴۱۷	چند خطوط۔ منو بھائی افضل صدیقی کے نام
۴۲۳	حبیب جالب بحیثیت فلمی نغمہ نگار
۴۲۶	فلمی اور غیر فلمی نغمے

نذر جالب

۴۵۷	نذر جالب
۴۵۸	حبیب جالب
۴۵۹	نذر جالب (پہلی)
۴۶۰	نذر جالب
۴۶۰	نذر جالب
۴۶۱	صرف .. یوم سید آتش پر
۴۶۲	نذر جالب
۴۶۳	قطرہ تاریخ وفات حبیب جالب
۴۶۳	نذر جالب
۴۶۴	آنظم
۴۶۵	آزکیا آید -----
۴۶۶	برجیشن حبیب جالب
۴۶۷	ابھی تو موسم ہے .. (نوحہ)
۴۶۸	نذر جالب
۴۶۹	نذر جالب
۴۷۰	حبیب جالب کی نذر

تخریج عقیدت

الطاف حسین قریشی، رشید مصباح، منیاء علیگ، فیروز مکرچی، قتیل شفائی، شوکت چوہدری، قمر یورش، یوسف حسن۔ یونس ادیب۔

پیش لفظ

عوام کے محبوب شاعر۔ حبیب جالب کی پہلی برسی کے موقع پر اس خصوصی شمارے کی صورت میں ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

حبیب جالب جمہوریت کے حق میں اور آمریت کے خلاف ایک ایسے مرد مجاہد تھے جن کے کلام کو پاکستان کے اربابِ حل و عقد بے حد خطرناک تصور کرتے تھے لہذا ان کے کچھ شعری مجموعوں پر صرف پابندیاں ہی عائد نہیں کی گئیں۔ بلکہ انہیں کئی غزلیں اور نظمیں لکھنے کی پاداش میں پابند سلاسل بھی ہونا پڑا لیکن قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک عوام کی بہتری اور جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے نبرد آزما رہے۔ عوام کے لئے ان کی اس ناقابل فراموش جدوجہد کی وجہ سے ہی عوام انہیں بے حد پیار کرتے تھے اس لئے جب کبھی بھی وہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کے لئے مدعو کئے جاتے، انہیں سننے کے لئے سامعین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے۔ مشاعروں میں ان کی اسی مقبولیت کے پیش نظر مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ مشاعروں میں جتنے سامعین انہیں نصیب ہوتے ہیں اتنے دلی دکنی سے لے کر آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ بڑے لکھے اور دانشور طبقے کے علاوہ کھیت مزدور، صنعتی کارکن اور کسان بھی ان کے کلام کے گرد بڑھتے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کی مسکون خاصیت ہی کی وجہ سے انہیں چماڑ مہم میں بھی اکثر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔

عوام میں ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے کارن ہی اکثر ناقدین نے انہیں نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو کا سب سے بڑا عوامی شاعر کہا ہے۔ اور مزاحمت اور احتجاج کی سب سے بلند آواز۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ دونوں ملکوں میں آمد و رفت کی پابندیوں اور اخبارات و رسائل اور کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے پاکستان کے اتنے مقبول و معروف شاعر کو یہاں کے اہل اردو بہت کم جانتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اردو کے بڑے بڑے ادیب، ہر دیرِ نقد اور شاعر بھی ان کی شاعرانہ عظمت سے پوری طرح واقف نہیں اور بعض نے تو ان کا نام تک نہیں سنا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعنیفات اور ان سے متعلق لڑچھپندوستان کے دوسرے شہروں میں

توجھوڑیے۔ اردو کے اہم مرکز دہلی میں بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

ہاں اُن کی وفات پر ہندوستان کے اخبارات میں اس سانحہ احوال سے متعلق کچھ خبریں شائع ہوئیں اور انگریزی اور ہندی میں چند مختصر معنائیں اشاعت پذیر ہوئے۔ اسی موقع پر خیال تھا کہ پاکستان میں اُن کی شاعری اور فن سے متعلق اخبارات و رسائل میں بہت کچھ لکھا جائے گا اور شاید کسی رسالے کا خصوصی نمبر بھی منظر عام پر آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ صرف چند اخبارات و رسائل میں ہی اکادکا مضامین دیکھنے کو ملے۔ ایسے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی اُن سے متعلق خصوصی شمارہ پیش کرنے کا خیال آیا تاکہ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں، فنی عظمت اور قدر و قیمت سے اردو قارئین خصوصاً ہندوستان میں رہنے والے اہل اردو کو روشناس کرایا جاسکے۔

لیکن خصوصی نمبر کا ناکافی آسان کام تو ہے نہیں۔ ہم نے اس شمارے کی تیاری کے دوران ہندو پاک کے متعدد ادیبوں اور حبیب جالب کے پرستاروں کو خطوط لکھے لیکن اکثر نے توجواب تک نہیں دیا اور چند نے امداد تعاون کا وعدہ کر کے بھی اسے پورا نہ کیا تاہم ہم ماہنامہ منشور کراچی کے ڈکی عباس صاحب کا اور دہلی کے شفیق الرحمن صاحب کا جو کہ جالب کے بہت بڑے پرستار ہیں شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے جالب سے متعلق دستیاب کچھ مواد فراہم کرنے کی زحمت کی۔ اس کے علاوہ ہم ان ادباء و شعراء کے بھی شکریہ گزار ہیں۔ جن کے مختلف رسائل و کتب میں شائع معنائیں اور نظموں کو زیر نظر شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔

اور ہاں اس شمارے میں شامل معنائیں کی تفصیلات نہیں کی گئی بلکہ حبیب جالب سے متعلق جتنے بھی معنائیں دستیاب ہوئے ان میں سے زیادہ تر شامل کرنے گئے حالانکہ ان میں سے اکثر میں نکتہ اڑ پائی جاتی ہے اور ان میں حبیب جالب کی مقبول عام نظموں کے اشعار کا بار بار حوالہ اچھا نہیں لگتا۔ ان اشعار کو ترتیب و تدوین کے دوران قلمزد کیا جاسکتا تھا لیکن شاید ایسا کرنا معنیوں نگار حضرات کو اچھا نہ لگتا لہذا انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

زیر نظر شمارے میں دستیاب معنائیں کو شامل اشاعت کرنے کے ساتھ حبیب جالب کا جنسا بھی کلام ہمیں حاصل ہو سکا اُسے بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ حبیب جالب میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اور مستقبل کے محققین کو زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا جاسکے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ ہمیں اس خصوصی شمارے سے متعلق اپنی قیمتی آراء سے مطلع کریں اور لکھیں کہ انہیں یہ شمارہ کیسا لگا ہے۔

جے ۶۴ کرشن نگر دہلی ۵۱ ۱۱۰۰

۱۲ مارچ ۱۹۹۴ء

مند کشور وکرم

اعتراف

حبیب جالب کی زندگی میں مختلف رسائل و کتب میں شائع مضامین

احمد بشیر میں نہیں مانتا

پاکستان میں عوامی بیداری کی جو لہر چلی اس کے نغمہ خوانوں میں حبیب جالب سب سے آگے ہیں اور اگر لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا تو اپنے فرض کو پہچانا۔ حبیب جالب کے ساتھ ایک شام صرف حبیب جالب ہی کو خراج نہیں بلکہ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی خدمت میں خراج ہے جو فن کو زندگی کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور عوامی زندگی کو اپنے تخلیقی عمل کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ حبیب جالب کی شعری سیمائی کے ہم شروع سے قائل تھے مگر ان کا نغمہ جمور ہم نے پہلی بار صدر ایوب کی انتخابی مہم کے درمیان سنا۔ پھر انہوں نے لائیاں کھائیں۔ قید خانے دیکھے ان کا مجموعہ کلام بھی تجنی سرکاری ضبط ہوا، یہ الگ بات ہے کہ ان کی پوری کتاب لوگوں کو زبانی یاد ہے۔ یہ کتاب دراصل حبیب جالب کی نہیں ان کی اپنی زندگی کی کتاب ہے۔ اب اس پر نئے مصلحوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صدر ایوب کی انتخابی مہم کے دوران ان کے سفر و حرکت پر پابندیاں لگیں تو ان کی نظموں کے ٹیپ ریکارڈز لاکھوں کے اجتماعات نے بار بار سنے۔ ادب و شعر سے جن فنکاروں نے عوام کا شعور بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ایک محدود عرصے میں اتنی موثر اور ہمہ گیر کامیابی حاصل کی ہو۔ حبیب جالب خالص عوامی شاعر ہیں اور اسی لئے اردو اور پنجابی میں ایک ساتھ لکھتے ہیں۔ وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہیں کیونکہ سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے پروگرام اور نظم و ضبط کی پابند ہوتی ہیں۔ حبیب جالب کی اپنی سیاسی پارٹی کا نام عوام ہے اور وہ ہر اس پارٹی کے ساتھ ہیں جو عوام کے مسائل کو سمجھتی ہے اور اسے عوام کے حوالے سے دور کرنا چاہتی ہے شلّا حبیب جالب صاحب کہتے ہیں کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ حد کلیت پر پابندی لگانے کا جھڑا حقائق سے گریز ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کے ایک عام فرد کا کم سے کم معیار ذہنت کیا ہو کوئی جمہوریت کوئی نظام حکومت یا دیگر

نہیں ہو سکتا۔ اقتصادی میدان میں یہی لا الہ کا مقصد ہے اور یہی پاکستان کا مقصد ہے۔

حبیب جالب کے جلسے کی ابتداء رفیق احمد خاں بکاش کی مختصر تقریر سے ہوئی۔ انہوں نے شاعرانہ انداز میں کہا کہ حبیب جالب کی شام اس وقت سنائی جا رہی ہے جب صبح کے آثار افق پر ہوئے ہیں مگر غیبت ہے۔ ان کے بعد افتخار جالب نے ان کے بارے میں تاثرات پیش کئے اور کہا کہ حبیب جالب کروڑوں پاکستانیوں کی قوت کی آواز ہیں۔ وہ ایک علامت ہیں۔ یہ آواز سماجی جبر و تشدد سے نجات اور ابھرتی ہوئی قوتوں کے حق میں نعرہ حماسہ ہے۔ انہوں نے عملی طور پر اردو کو نئی توقیر دی اور بتایا کہ اردو ہی پورے پاکستان کے عوام کی صدا بن سکتی ہے۔ ایک زمانے میں لوگ ترقی پسند مصنفوں کی تعبیر فن میں گمیرے ڈالتے تھے مگر زندگی کے تجربے نے سب کو سمجھا دیا ہے کہ خالی افراد کے داخلی واپس اور ان کا اٹھنا اوسب کا منصب نہیں ہے۔ جمیعت علما اسلام مزدور اور کسان تحریکیں اور بھٹو اور بھاشانی کی جملہ مساوات ابوزر غفاری اوسب کے منصب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور حبیب جالب جشن عوام میں مشعل بردار ہیں۔ ان کی مشورہ نظم پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ اس دور کی نمائندہ نظم ہے۔

تقریروں کے بعد حبیب جالب نے کچھ پرانی اور ایک نئی نظم سنائی۔ اسلام خطرے میں ہمیں۔ سب سے پہلے انہوں نے پاکستان کا مطلب کیا سنائی۔ لاہور میں آخری بار انہوں نے یہ نظم کوستان کے صحافیوں کے جلوس میں سنائی جو گزشتہ ماہ انجمن صحافیان کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا۔ ایک بند آپ بھی سن لیں

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

گھر رہنے کو چھوٹا سا

مفت مجھے تعلیم دلا

میں مسلمان ہوں واللہ

لا الہ الا اللہ

یہ نظم جب جلوس میں پڑھی گئی تو لوگوں کے دل دھڑکنے لگے اور بے غور روؤں کے لوگ انٹرنیڈوں میں آکڑے ہوئے۔ اتنے میں صفدر صدیقی صاحب جو چند مزدور لے کر کوستان کے محلے کی ہمدردی میں شریک جلوس ہوئے تھے۔ بھاگے بھاگے آئے اور کہا کہ صاحب یہ نظم بند کر دیجئے۔ اس کا یہ مطلب ہماری سیاسی پالیسی کے خلاف ہے۔ چنانچہ

حبیب جالب صاحب کی یہ نظم نہ صرف بند کراوی مچی بلکہ ان کو لاؤڈ اسپیکر والی گاڑی سے اتار دیا گیا مگر اس نظم کو گاڑی سے کون اتار سکتا ہے۔

شام کے جلے میں یہ نظم اسی اشتیاق سے سنی گئی۔ جس اشتیاق سے یہ موبی دروازے میں سنی جاسکتی ہے کیونکہ ادیب اب اپنے حجرے سے نکل کر موبی دروازے میں بجلی ہمارا ہے تاکہ وہ عوام کے ساتھ مرے اور جئے۔ حبیب جالب نے اور نظمیں بھی سنائیں۔

لوگوں نے عوامی تحریک کو الجھاؤ میں ڈالنے کے لئے اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگانا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ اس کا دین ہے اور وہ خود اس کا محافظ ہے۔ خطرہ اگر ہے تو چند خاندانوں کے لامحدود منافعوں کو۔ یہ حبیب جالب کی تازہ نظم کا موضوع ہے۔ ”اسلام خطرے میں نہیں۔“

(یہ کالم ۱۹۶۰ء میں روزنامہ امروز میں چھپا تھا جب جالب صاحب پہلی بار ایوب

خان کے زمانے میں رہا ہوئے تھے)



احمد ندیم قاسمی جالب کی انفرادیت

دوامی موضوعات کی دوامی شاعری کی اہمیت مسلم ہے۔ مگر بعض صورتوں میں ہنگامی اور لمحائی شاعری بھی دوام حاصل کرنے کی توانائیوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور اس طرح لمحے فن میں ڈھل کر صدیوں بن جاتے ہیں۔ جیب جالب نے شاعری کا آغاز دوامی موضوعات سے کیا اور کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی انفرادیت پر تسلیم کرا لی کہ اس شاعری کو سہل منتہی کی ایک یلغ مثالی کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ سلاستِ اظہار بہت مشکل فن ہے، خاص طور سے جب اظہار ایسے جذبات و تصورات کا ہر جہت کو فن میں متغزل کرتے ہوئے بیشتر اردو شاعروں نے طویل تراکیب اور پے در پے اضافتوں اور عربی فارسی کے بھاری بھر کم الفاظ کی بھرمار کر دی ہو۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ سلاستِ اظہار اردو شاعری کی ایک تہیم روایت سے باقاعدہ بغاوت ہے اور جالب نے ابتدائی دور کی غنیمتوں میں اپنے آپ کو اس طرح کا ایک کامیاب باقی ثابت کیا ہے۔

اس کے بعد جالب نے اپنے فن میں اظہار کی ایک اور صفت کو اتنی خوبی اور تسلسل سے برتا کہ وہ پاکستان کی گذشتہ تیس برس کی تاریخ میں آزادی اظہار اور جرأت کی ایک علامت بن گیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادی و جرأت کے اظہار میں بھی وہ سلاستِ اظہار سے دست کش نہ ہوا۔ بلکہ میری رائے کے مطابق اس دور میں جالب کی ملک گیر مقبولیت

میں اس کے موضوعات کی اہمیت اور ہر گیری کے علاوہ اس کی سلاست اظہار کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جو بھی کہتا ہے، کچھ اس طرح عام بول چال کے انداز میں کہتا ہے کہ اس کا کلام پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں براہِ راست اتر کر اُس کی شخصیت میں شرح پس جاتا ہے۔

حبیب جالب ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار ہے مگر گذشتہ میں برس کے ادبی منظر میں اس کی شخصیت شاندار واحد شخصیت ہے جس نے بجائے خود ایک تحریک کا منصب ادا کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک تو اب تک بے لعل و لعل ہے مگر اس کی تنظیم آج سے رتبہ صدی پہلے انتشار کا شکار ہو گئی تھی اور تنظیم کی غیر موجودگی میں کسی واحد شاعر کا ایک تحریک ساز بن کر نمایاں ہونا بہت ہی دشوار مرملہ ہے۔ حبیب جالب نے یہ مرملہ کمال پارہی سے طے کیا ہے اور اس لئے وہ معلمِ اردو شاعری میں حق گوئی اور میاں گوئی کی ایک علامت بن گیا ہے ہر فرد اپنی اپنی معاشرتی عبوریوں کا اسیر ہوتا ہے اور شعرا بھی معاشرے ہی کے افراد ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اس اسیری سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ حبیب جالب بھی آپ کی اور پہلی طرح اس معاشرے کا ایک رکن ہے۔ مگر اُس کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اس طرح کی کسی عبوری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا تھا۔ اس نے نہ تو علامت کا سہارا لے کر خود کو وطن کے پیچھے چھپایا اور نہ استعارے کو پھیلا کر اپنے ماضی الغیر کو فنی مینتروں کے غلاظت میں پسٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہِ راست کی اور قطعی طور پر غیر مبہم اور دو دو کوک الفاظ میں کی اور یہ سب کچھ اُس دور میں کیا جب لوحِ اپنا سر کاٹ کر تجھیلی پر دھریے کے مترادف تھا۔

بے شک علامہ اقبال اور اُن کے بعد متعدد ترقی پسند شعرا، مغزل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابلِ قدر کام کر چکے تھے اور مغزل کو قدیم دور کے معین موضوعات کے جس سے نکالنے کے لئے زمیں ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں

بھی دیرانوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس دور میں صرف جالب ہی ایک شاعر ہے جس نے ٹھپ ٹھپا کر نہیں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے ان منور زمینوں کا رخ کیا اور ان میں حق و صداقت اور وصلہ و جرأت کی ایسی فصلیں کاشت کیں کہ خود اس کے جیسے میں توقید و بند کی مستویں آئیں مگر اس نے آنے والی نسلوں کے لئے سچ بولنا آسان بنا دیا۔

اس کے سیاسی رجحانات سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بعض شخصیات کی تنقید سے بھی اس کے ساتھ متفق ہوں مگر یہ طے ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا، حیرت انگیز وصلے اور خلوص کے ساتھ کہا۔ یہ وصلہ اسے صداقت کے اعتماد نے بھی دیا اور ملک کے ان عوام کی حمایت نے بھی جن کی محرومیاں اور جن کے بنیادی حقوق کی پامالی جالب کی شاعری کا موضوع بنی اور اس نے اپنی مقبولیت حاصل کی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک LEGEND بن گیا۔ یہ شہرت اور مقبولیت اور عزت اس پر آسمان سے نہیں پھٹ پڑی، اس نے یہ سب کچھ بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے کہ اس کی عظیم جدوجہد ہی اس کا استحقاق ہے۔



انتظار حسین آج کا نظیر اکبر آبادی

ہمارے یہاں شاعر دو ہی راستوں سے ادب کی اقلیم میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں ادبی
رسالے کے راستے یا مشاعرے کے راستے۔ حبیب جالب تیسرے راستے سے آئے۔ قومی
سیاست کے راستے سے۔

میں نے پوچھا کہ حضرت مروجہ دو راستوں میں کیا قباحت تھی۔ جواب دیا کہ جتنے
بندوں نے وہ دونوں رستے مجھ پر بند کر دیئے تھے۔

اصل میں حبیب جالب اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی نوع کا دوسرا واقعہ ہیں۔ ان سے
پہلے ایک بڑا واقعہ نظیر اکبر آبادی کی صورت میں گزر چکا ہے۔ اس زمانے کے نقد شاعروں
اور تذکرہ نگاروں نے نظیر کو ملیوں، فلیوں اور کھلی کوچوں میں لگم سناتے دیکھا اور لمبے
مبتدل شاعری کہہ کر رو کر دیا تھا۔ حبیب جالب کی شاعری پر بھی آج کل کے نقد ادیبوں
نے کم بات کہی نہیں چڑھائی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ نظیر کی شاعری کو ملیوں، فلیوں میں
پر لگے تھے۔ حبیب جالب کی شاعری کو سیاسی مجلسوں میں پر لگے۔ ان کی شاعری کو پہلے
قبول عام حاصل ہوا۔ پھر خواص نے چار و ناچار انہیں قبول کیا۔

یوں میں نے حبیب جالب سے کبھی نظیر اکبر آبادی کا نام نہیں سنا تھا۔ میں ان سے
پوچھ رہا تھا کہ جس قسم کی شاعری آپ کر رہے ہیں اس کے سلسلہ میں کسی پچھلے استاد سے
بھی فیض حاصل کیا اور میرا گمان یہ تھا کہ وہ مولانا ظفر علی خاں کا نام لیں گے۔ مگر انہوں
نے مولانا ظفر علی خاں اور حسرت موہانی دونوں کا نام بعد میں لیا۔ پہلے تو چھوٹے ہی نظیر
اکبر آبادی کا نام لیا۔ پورے کہ میں نے نظیر کو بہت پڑھا ہے۔

دیئے یہ مت سمجھئے کہ روایتی شاعری کی فضا حبیب جالب نے نہیں دیکھی۔ یہ فضا
بھی بہت دیکھی ہے اور وہاں سے اچھی خاصی تربیت حاصل کی ہے۔ مزاج تو لڑکپن ہی
سے شاعرانہ تھا ساتویں جماعت میں استاد نے کہا کہ وقت سحر کو جملہ میں استعمال کرو۔

انہوں نے اسے شعر میں استعمال کر ڈالا۔

دعہ کیا تھا آئیں گے اشب ضرور ہم
دعہ شکن کو دیکھتے وقت سحر مہما

بس اسی زمانے میں حبیب جالب نے ہوشیار پور کو چھوڑا اور دلی کی راہ لی۔ چندے جتنا کا پانی پیا۔ پھر ۷۴۵ ہجری۔ اور حبیب جالب دلی سے کراچی میں 'کراچی میں پہنچنے والے مشاعرے اپنے ساتھ لے کر پہنچے۔ حبیب جالب نے اس شعر میں مشاعرے دیکھے، استاد دیکھے، استادوں کی جتہ بندیاں دیکھیں۔ تھوڑے دنوں راجب مراد آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعرے میں غزل حبیب جالب پڑھتے اور داد راجب مراد آبادی وصول کرتے۔ کہتے ہیں کہ کلموں میں اور داد و سرا وصول کرے۔ بس میں اس حصار کو توڑ کر باہر نکل آیا۔

بس پھر تو حبیب جالب حصار توڑتے ہی چلے گئے۔ غزل کے حصار کو توڑا اور نظم میں آگئے، 'مشاعرے کے حصار کو توڑا اور سیاسی جملے کے اسٹیج پر پہنچ گئے۔

راجب مراد آبادی سے محترمہ فاطمہ جناح کے جملے کے اسٹیج تک کی مسافت معمولی مسافت تو نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہ عائشہ غزل کہتے کہتے اس راہ پر کیسے پڑ گئے۔ بولے کہ تصور میں یہ بات تھی کہ پاکستان ہمارے خوابوں کی تعمیر بنے گا۔ مگر خواب ایک ایک کر کے ٹوٹنے چلے گئے۔ اور میرے یہاں روحانیت کم ہوتی چلی گئی دکھ پیدا ہوتا چلا گیا۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی معرفت مزدوروں اور کسانوں سے رابطہ پیدا ہوا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ میں ۱۹۵۶ء میں نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ بہتی بہتی پھرنا، عام لوگوں کے مسائل کو سمجھنا اور شعر کہنا۔

بس اسی عمل میں حبیب جالب کی شاعری نے عوامی رنگ پکڑا اور ایسا رنگ نکالا کہ ترقی پسند شاعری سے نظریاتی اعتبار ہم رشتہ ہونے کے باوجود اس سے بالکل الگ نظر آتی ہے۔ ترقی پسند شاعر تو ایک گروہ کی صورت میں ہمارے سامنے آئے تھے۔ حبیب جالب جب ہمارے سامنے آئے تو اکیلے تھے میں نے کہا جالب صاحب ۳۶ کے ترقی پسند شاعر کو جس طرح پوری کہی لی تھی آپ کو کوئی کہی نہیں لی۔ کیوں؟

بولے کہ میں سادہ دل، 'یار لوگ مجھے اس رستے پر لگا گئے اور خود اور راستوں پر نکل گئے۔ جس نظام کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے مجھے اکسایا تھا خود اس کے کانٹوں کے

شیریں گئے۔ میں حیران کہ ہم سڑجھے کس کرلا میں چھوڑ گئے۔ انیس بہت پکارا، واپس نہیں آئے۔ مجھے اکیلے وہ کام کرنا پڑا جو ان سب کے ساتھ مل کر انجام دینا تھا۔ اب وہ بس وچس کر رہے ہیں کہ مجھے قبول کیسے کریں۔ میری مجوزہ پچاسویں سالگرہ بھی اسی وجہ سے ان کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے میرے بارے میں کچھ کہیں گے تو اپنے بارے میں بھی تو کچھ کہنا پڑے گا۔

”جالب صاحب! آج کل کس پارٹی سے آپ کا تعلق ہے؟“
 ”کسی سے نہیں۔ میرے ہم عصر پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ جالب! پارٹی کو چھوڑو اور آزاد ہو جاؤ۔ اب میں آزاد ہو گیا ہوں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرے ہم عصر باندھ ہو گئے ہیں۔“
 نئی شامی کے بارے میں پوچھا تو بولے کہ یہ نئے شاعر شاکی ہیں کہ ان کی شامی پڑھی نہیں جاتی۔ پڑھی کیسے جائے، سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ لوگوں کی بات ہو تو لوگ اسے سمجھیں۔ میں کہتا ہوں کہ عشق کی بھی بات کرو تو ایسے کرو کہ لوگوں کو وہ اپنی بات نظر آئے۔

میں نے کہا کہ پھر عشق کی بات ہو جائے۔ آخر آپ نے سیاسی شامی ہی تو نہیں کی ہے عاشقانہ کلام بھی کہا ہے۔ اس پر ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے کہ عشق بھی ’روپے پیسے والا‘ ہو تب ہی کامیاب ہوتا ہے۔ فروت میں کسی کو عشق کا عارضہ لاحق نہ ہو۔ مجھے تیس تیس سطحوں کے رشتے بھی موصول ہوئے۔ کوئے میں یہ لکھ کر واپس کر دتا کہ شکریہ! مگر اپنے والدین سے بھی تو ملاؤ کہ پھر ہم اکٹھے ہی ملیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم حدود ہی میں رہے۔ احرام احرام ہی میں مارے گئے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا، کہا کہ یہ ایسی بات ہے کہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے۔



انورسید انقلابی حقیقت کی ایک مثال۔ جواب

حبیب جالب کے ہاں جذبہ سمور اتا نمایاں ہے کہ ان کے معاصرین کے ایک طبقے نے ان کی شاعری کو سیاست کا بلا واسطہ رد عمل کہہ کر اس کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی ہے ایک اور طبقے نے حبیب جالب کے احساس کی شدت کا اعتراف تو کیا لیکن اسے انہمی کی زور کار قبا میں یوں لپیٹا کہ معصومیت میں کمی ہوئی اس بات سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ حبیب جالب کی اساسی عطا ان کی شاعری ہے یا صرف انہمی..... چنانچہ حبیب جالب پر کام کرنے والوں کو جو مشکلات درپیش ہیں وہ درحقیقت حبیب جالب کے محض دوستوں کی ہی پیدا کردہ ہیں اور اگر کوئی محض ذرا بحث کر کے ان مشکلات کو سر کرنے اور حبیب جالب کی انقلابی آواز کے عقب سے ان کے دل کی واردات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو حبیب جالب کے تذکرہ دوست اس پر طعن و تشنیع کے ساتھ یوں بھینٹتے ہیں جیسے یہ اقدام خود ان کے خلاف ہو۔

حبیب جالب شاعری کے افق پر اس وقت نمایاں ہوئے جب ترقی پسند تحریک اپنی بے ساخت لپیٹ رہی تھی اور اس کے باقیات الصالحات اپنی مبینہ خدمات اور قربانیوں کے منہم پیٹارے اٹھائے اس جابر سلطان کو تلاش کر رہے تھے جو مناسب قیمت چکا کر ان کے قلم خرید لے۔

اس زمانے میں جس بحث نے سب سے زیادہ توجہ کھینچی وہ ”ادب اور انقلاب“ کی بحث تھی۔ چنانچہ وہ لوگ جو ادب کے تخلیق اور تعمیری پہلو کے حامی تھے ادب کو زندگی اور حسن کے ایک نئے توازن کی تلاش کا وسیلہ قرار دیتے اور ادب میں تخریب کا عنصر شامل کرنے والوں پر شدید نکتہ چینی کرتے۔ اسی زمانے میں اس حقیقت کو بھی اہمیت حاصل ہوئی کہ تخریب برائے تخریب بڑا ادب پیدا نہیں کرتی اور اس پر نہ صرف ہر طبقہ خیال کے ادبا نے نور کرنا ضروری سمجھا بلکہ حد یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعض ثقہ ادبا نے بھی

اس نکتہ کی تائید کی۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک ممتاز نقاد ممتاز حسین نے ”ذکران نامہ“ اور ”دست تہہ سنگ“ کے غائر مطالعہ کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ”کسی فنکار کے ساتھ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو براہ راست یا بالواسطہ کسی نظریہ کے لئے قربان کر دیئے..... شاعری محض نغمہ یا محض جذبہ یا محض الفاظ کی بازی گری نہیں۔“

افکار - فیض نمبر ۳۷

اور اسی مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا کہ :

”فیض صاحب کو ابھی غزل کے گیسو سنوارنے کا اور موقع ملے گا اور ان کے اس دور کی غزلیں بھی غزل کے ایک نئے دور کی ترجمان ثابت ہوں گی۔“

فیض صاحب کو نئے دور میں غزل کے گیسو سنوارنے کا موقع ملا ہے یا نہیں فی الوقت یہ میرا موضوع نہیں۔ البتہ اس بات سے افکار ممکن نہیں کہ ان کے رفیقان تحریک نے بیشتر نئے حالات سے مناسبت کر لی اور غزل کو چھوڑ کر اپنے گیسو سنوارنا شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی انقلابی آواز ”خود تقریبی“ کی گونج میں ایسی کم ہوئی کہ وہ خارجی جبر کا احتیاج تک محسوس نہ کر سکے۔ اور اپنے عہد کی شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کا احترام اور تبدیلی حالات کا عمل ایک ایسے شاعر کو سونپ دیا جس نے انقلاب کے ایک مخصوص تصور کو تو اپنے ذہن میں جگہ دی تھی لیکن جماعتی ضرورتوں اور ذاتی سہولتوں کو قریب بھی سمجھنے نہیں دیا تھا۔ یہ شاعر حبیب جالب تھا اور اس کی ابتدائی ادبی تربیت غزل کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب حبیب جالب نے اک نہتہ اہتاب کو اپنی قیمت بنا رکھا تھا اور اک نازش خورشید کے پائے زر نگار پر اپنی آنکھوں کی جہنم قربان کر دی تھی۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حبیب جالب کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اپنے گرد و پیش کو نہ صرف حیرت سے نگہ رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ پر اسرار طور اس کے خلاف اپنے دل میں رد عمل بھی مرتب کر رہا تھا۔

گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے

کہتے ہیں بار بار کا ساں ہے

بکھری ہوئی پتیاں ی دل کی ٹوٹی ہوئی شاخ آشیان ہے

حبیب جالب کی یہ حیرت اس لئے بجا تھی کہ ان کے بیشتر معاصر جو عرصے سے عقلت انسان کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے اب آنکھیں نیچے کئے حاکم وقت کے سامنے سنسناتی ہوئی آواز میں مدح سرا تھے اور حاکم وقت کی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے راج سنگھان کو مغربزد

کرنے کے لئے جہاں استبداد کے پسندوں کو سبز اور سرخ رنگ کی نظر افروز جمنڈیوں سے آراستہ کر رہا تھا۔ حبیب جالب نے اس گھٹی ہوئی فضا میں اختباس اور تنہائی کی کیفیت محسوس کی اور اپنا رشتہ غالب اور یگانہ جیسے لوگوں سے قائم کر لیا جو.... اپنے زمانے میں حبیب جالب کی طرح کے ہی ODD MAN OUT تھے۔

غالب و یگانہ سے لوگ بھی تھے جب تھا
ہم سے ملے نہ ہوگی کیا منزل ادب تھا
نظرِ اجمن کس کو ، کیسی اجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچنے تو سب تھا
سن رکھو زمانے کی کل زبانی ہوگی
ہم جو بات کہتے ہیں آج زیرِ لب تھا

اس اجمال سے ایک بات تو واضح ہوتی ہے کہ حبیب جالب جب غزل میں شاعری کر رہے تھے۔ تب بھی وہ روایتی قسم کے مضامین کو گل و بلبل کے اشعار میں ہاندھنے سے گریزاں تھے۔

ان کی فکر خارج کی طرف تھی۔ جہاں خوں بہت آنکھیں فلم و جور کا نظام تو کرتی تھیں لیکن اس پر انگ خوں بامیں نکلتی تھیں۔ اس دور میں حبیب جالب نے خود اپنے آپ سے جنگ لڑی اور جب ادب کے بیشتر سرور آورہ لوگ سرمازارِ بیلام ہو رہے تھے تو حبیب جالب نے اپنی تنہائی کو راہنما بنایا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ، ہو گئے جو اب تھا

دوسری بات یہ کہ غزل کے تذکرہ دور میں بھی حبیب جالب کا سیاسی شعور بیدار تھا اور ان کی تجسس روح انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ موجود سیاسی حقیقت کے معنوی غزل کو توڑ کر کسی ایسی صحت مند تبدیلی کو روپ عمل لائیں جس سے صادق اقدار کی راہ ہموار اور پاکستانی معاشرہ جسے ارہاب سیاست کی سالفورہ ذہنیت نے دنگ آلود کر دیا تھا ترقی کی طرف صحت مند قدم اٹھا سکے۔ ذہنی اضطراب کی اس منزل پر نشہ ترقی پسند شعراء کی طرح حبیب جالب نے وطن کو محبوب بنا کر پیش نہیں کیا کہ ارہاب نقد ان کے صادق جذبے سے جنسی الجھنوں کو سراغ لگانے کی سعی قراتے بلکہ انہوں نے غزل کی بیخودی صورت سے

کنارہ کشی اختیار کر کے آتش فشانی اظہار کے لئے نظم کی ہیئت کا انتخاب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حبیب جالب کے داخل کی جگہ نے اب واضح طور پر خارج اختیار کر لیا اور وہ تمام مشاہدے، حقیقتیں اور تصویریں جنہیں وہ رمز کنایہ کے انداز میں غزل کی زیر لب کیفیت میں ظاہر کرتے تھے اب بلند بانگ انداز میں ان کی زبان پر آگئیں۔ چنانچہ ان کے ہاں خطابت پیدا ہوئی۔ آہنگ تبدیل ہو گیا۔ نفہ ہائے گل نے آوازہ انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔ اور وہ قاری جو پہلے نظر سے پوشیدہ تھا اب حبیب جالب کے رومبو بیٹھ کر اس کے ہندیات و احساسات پر مرصعہ دقیق ثبت کرنے لگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رابطہ عوام کی اس مہم میں حبیب جالب نے اپنے دھیمے لہجے، زبان کی لطافت اور گل آفرینی الفاظ کا بلیدان دیا اور ان کی شاعری کا مجموعی لہجہ خاما حاثہ ہوا۔ تاہم یہ کتنا درست نہیں کہ حبیب جالب اپنی اس فنی قربانی سے واقف نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی شعور کی زیر سطح لہر سے ابھر کر اظہار کی پلائی سطح پر آنے کی کوشش حبیب جالب کی شعوری کوشش تھی۔ اور یہ اس بے طبعانی کا بدیہی نتیجہ تھا جو گرد و پیش کی قومیت نے عرصے سے پیدا کر رکھی تھی اور جس کے خلاف کوئی موثر آواز اٹھ نہیں رہی تھی۔ اس دور میں حبیب جالب نے اپنے داخل سے خارج کی طرف شعوری مراجعت کی اور اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا کہ۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی دُخل مہی مہینوں میں
میں غزل کوں تو کیسے کہ نہدا ہیں میری راہیں
مرے اندر گرد آنسو، مرے آس پاس آہیں

شر غزل سے آہوں اور آنسوؤں کے در تک حبیب جالب کے راستے میں جو ان گنت مشکل مقامات آئے ہیں یہاں ان کا تذکرہ اس لئے مقصود نہیں کہ حبیب جالب نے نہ ان کو اہمیت دی ہے اور نہ ان کا صلہ مانگا ہے۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ انہوں نے معاشرے کو جارحانہ انداز میں ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے صخر زنی، شمشیر آزمائی، خون چکانی اور آتش زنی پر آمادہ نہیں کیا۔ ان کے ہاں ترقی پسندوں جیسا کہ کوکھلا نموا انقلاب بھی نہیں ابھرا۔ وجہ یہ کہ حبیب جالب نہ صرف شاعر کے انتہائی کردار کو قبول کرتے ہیں بلکہ

اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ شاعر معاشرے کی تعمیر، تکمیل اور تخلیق کا ذمہ دار بھی ہے۔ بلاشبہ ایک شاعر کی حیثیت میں اس کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ زندگی اور حسن میں نیا توازن پیدا کرے تاہم ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت میں وہ اس توازن کا امین بھی ہے۔ چنانچہ حبیب جالب کی ایک منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے موخر الذکر فریضہ سر انجام دینے کے لئے جبری خاموشی کی فضا، بیہوشی میں احتجاج کی پہلی پر زور آواز بلند کی اور عوام کو سحراں طبع کے خلاف نصف آرام کرنے کے بجائے اس طبع کے جبر کا وار خود اپنی ذات پر قبول کر لیا۔ ایک ترقی پسند انقلابی اور حبیب جالب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ترقی پسند انقلابی پس منظر میں وہ کر عوام کو گولیوں کی ہاڑ کے سامنے سینہ سپر ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ جب کہ حبیب جالب نے اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائی اور دہر کے اندھیروں میں روشنی پھیلانے کے لئے وقت کے خداؤں کے خلاف انکار کی اولین آواز بلند کر دی۔

دب جس کا محلات ہی میں بٹے

چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر بٹے

وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے بٹے

ایسے دستور کو

صبح بے نور کو

میں نہیں جانتا..... میں نہیں جانتا

آج حکومت کے در پر

ہر شاہیں کا سر خم ہے

درس خودی دینے والوں کو

بحول مہنی اقبال کی یاد

صدر ایوب زندہ باد

حبیب جالب کی تذکرہ بلا حسم کی تحفوں کو ان کے سیاسی رد عمل کی فوری پیدوار کا جانا ہے۔ یہ تحفیں بلاشبہ دیکھی ہوئی حقیقت کو بے پاکانہ انداز میں بیان کرتی ہیں اور ایک مخصوص پس منظر کے بغیر معرض تخلیق نہیں آسکتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ایک مخصوص سماجی عمل کا نتیجہ ہیں تاہم حبیب جالب کی اس فنکارانہ خوبی سے انکار

ممکن نہیں کہ انہوں نے معروضی انداز اختیار کرنے کے باوجود شاعری کی بالواسطہ زبان ترک نہیں کی۔ اور معاشرے کی گہنائی تصویر پیش کر کے انسان اور انسانی معنویت کو بھروسہ نہیں کیا۔ بلکہ نظم کی طرف مراجعت کر کے انہوں نے شاعری کی زبان میں ہی اس بڑے خطرے کی طرف متوجہ کیا جو معاشرے کو ویک کی طرف چاٹ گیا تھا اور جس کے تدارک کے لئے تحرک ضروری تھا۔ اسی مقصد کے لئے حبیب جالب نے عوامی لہجہ اختیار کیا۔ شعر کے باطن سے نیکی کو اہارا، رواں دواں بحروں کو ٹکڑوں میں پائنا، ردیف قافیہ کی آہنگ سے سرور نغمہ بیدار کیا اور حقیقت کے جراحت کو موثر بنانے کے لئے خطر کے اسالیب کو اس فنکارانہ خوبی سے استعمال کیا کہ اس سے عوامی شعور نہ صرف متاثر ہوا بلکہ تہذیبی کو روپہ عمل لانے کے لئے تیار بھی ہو گیا۔ یہ اہم فریضہ مصلح اور ترقی پسند دونوں ادا کر سکتے تھے لیکن ان دونوں نے مصلحت وقت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور لیوں پر خاموش اختیار غاری کر لی۔ لیکن حبیب جالب جنہیں سترام کا انجام اچھی طرح معلوم تھا اس صورت میں حالات کے ساتھ مفاہمت نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنی سرری غزل کا ریشمی لمبوس چاک کیا اور میدان عمل میں آکر اس قرض کو تیشہ عمل سے یوں ادا کیا کہ ان کی شاعری انتہائی حقیقت سے ہم آہنگ ہو گئی۔ حبیب جالب کی اس خدمت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے؟



توقیر حیدر اختلاف کا شاعر

عوامی شاعر حبیب جالب ہندوستان کے دورے پر گئے تو بہت سارے ہندوستانی اخبارات اور رسائل نے ان کے انٹرویوز چھاپے اور عوام نے ان کا اور ان کے کلام کا والہانہ استقبال کیا۔ زیر نظر مضمون ہندوستان کے مشہور ترقی پسند ادبی پرچے ”آر سی“ کے شکرے سے چھاپ رہے ہیں ”آر سی“ پچھلے تینتیس سال سے چھپ رہا ہے۔ اور پنجابی ادبی رسالوں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

پاکستانی شاعر حبیب جالب کچلے ہوئے لوگوں، معصوموں اور عروموں کی آواز ہے۔ اس نے اپنے دہس کی ہر سرکار کے خلاف اپنے جذبات اور لوگوں کے حق کے لئے نعرہ لگایا وہ تقریباً ۳۴ سال بعد اپنی جنم بھومی ہوشیار پور آئے۔ حبیب جالب کہتے ہیں۔

”مجھے کئی بار احساس ہوا کہ جیسے میں کسی پاگل کی طرح اکیلا ہی اپنے راستے پر گامزن ہوں۔ جب کے دوسرے تمام سوچ سمجھ رکھنے والے لوگ کسی اور کے ٹر میں بول رہے ہوں۔“

حبیب جالب کا انسانی دکھ اس شاعر کا دکھ ہے جس کو کوئی خرید نہیں سکتا، کوئی لالچ و دغا نہیں سکتا، کوئی ڈر اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔ وہ اپنے شعروں میں جس دکھ کو بیان کرتا ہے وہ عام دھکی لوگوں کی زبان بن جاتا ہے۔ شاید اس وجہ سے اس نے جنرل ایوب سے جنرل ضیاء الحق تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ مگر وہ تو پاکستانی عوام کا ضمیر ہے جس کو کوئی بھی طاقت نہیں دبا سکی

پچھلے دنوں دہلی کے دورے کے دوران جالب نے بتایا کہ اپنے لوگوں سے غداری اس کے ضمیر میں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا۔

”ہر حکومت نے مجھ سے کہا کہ اپنا ضمیر بیچ دے اور کہنیوں میں شامل ہو جا، مگر میں نہیں مانا۔“

اس دوران حبیب جالب نے بہت سارے شعر سنائے جو انقلاب کی لوٹ کھسوٹ کی اور عوام کی طاقت کی بات کرتے تھے۔

حبیب جالب میں کوئی بناوٹ نہیں۔ وہ بغیر کسی ہیر پھیر کے اپنی بات کہتا ہے، وہ دلیر ہے، سورا ہے، اس بارے میں کوئی شک نہیں۔ جالب کے بقول آج کل کا ریاستی نظام قاتل نفرت اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے۔ اور یہ چند لوگوں کے چینے کے لئے بنا ہوا ہے۔ وہ حق کی آواز بن کر بولتا ہے۔

چینے کا حق سامراج نے چھین لیا
افسوس کرنے کا حق استعمال کرو

حبیب جالب کو اگر ایک طرف سے طاقت کے دلالوں کے وار سننے پڑ رہے ہیں تو دوسری طرف غلاموں کے، مگر وہ بے دھڑک ہو کر قاتل اور قیروں پر ہتھوڑے چلاتا ہے۔ وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا اور سمجھوتہ کرنے والوں اور نازک مزاج شاعروں سے کہتا ہے کہ وہ سماج میں تبدیلی کرنے کے بجائے اپنی قلموں کو شلواریوں میں آزاد بند ڈالنے کے لئے استعمال کریں۔

اس کا پاسپورٹ ضبط ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنی جنم بھومی ہوشیار پور کو دیکھنے کے لئے آ نہیں سکا تھا۔ آج جمہوریت کی بحالی کے صدقے وہ ۳۳ سال کے بعد ہندوستان پر آیا ہے۔ وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ یہاں بہت کچھ بدلا ہے۔ دلی بہت بڑی نظر آتی ہے۔ سڑکیں اچھی ہیں۔ ”اجیری گیٹ“ جہاں میں نے تعلیم حاصل کی ہے پہچانا ہی نہیں جاتا۔ اس نے عام تبدیلیوں کی طرف دھیان دیتے ہوئے کہا۔

”اس تبدیلی کا مطلب بے شمار عمارتوں کا تعمیر ہونا ہے یا کہ جموں پڑیوں اور کھلیوں کو بھی پکا کیا جا رہا ہے؟“



زائدہ حنا یہ عشق نہیں آساں

عشق ابتداء ہے 'عشق انتہا ہے۔ کوئی انسان اس کی گھرو سے باہر نہیں۔ کسی کو اس کی عکرائی سے مفر نہیں۔ انسان کا اور عشق کا ساتھ پرانا ہے 'یہ دونوں جنگوں اور عارمل میں پہلو پہ پہلو رہے اور جب ستاروں پہ بتیاں بیس گی وہاں بھی 'انسان عشق کی رسائی سے باہر نہ ہوگا۔

عشق کے باب میں انسانوں کے اپنے دائرے اور اپنے زاویے ہیں۔ اپنی گھیاں 'بتیاں اور محلے ہیں 'اپنی تائیں اور اپنی اڑائیں ہیں۔ کچھ مہجینوں اور ناخنیوں کے عشق میں ہی زندگی بسر کر جاتے ہیں۔ انہیں چشم دایمہ اور لب و گیسو کے معاملات سے ہی فراغت میسر نہیں آتی کہ نگاہ کسی اور طرف بھی ڈالیں۔ اور کچھ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دل میں ساری خدائی کی سائی ہوتی ہے۔ جنہیں انسانوں سے عشق کا آزار اور زندگی سے پیار ہو جاتا ہے۔ اس عشق کے موسم کو زوال نہیں آتا اور آئے بھی کیسے کہ اس میں ہجر و ہجر کے معاملات ہیں اور جدائی در جدائی کے مرطے ہیں۔ اس اسیری سے رہائی نہیں ملتی 'اس کی کھٹک تا عمر چین سے نہیں رہنے دیتی اور اس کی بے قراری 'انہوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

اسی عشق کے بارے میں کہا گیا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں 'بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ذوب کے جانا ہے

جانب کی ماں نے اسے جنم دیتے ہوئے بھلا کب یہ خیال کیا ہوگا کہ اس کا بیٹا محلے اور ہستی کی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو 'سو ہو 'عشق بشر میں یوں گرے گا کہ پھر پایا نہ جائے گا۔ درد سے ترپتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جس کا نام وہ 'محبیب

رکھے گی۔ وہ اپنے نام کی تصویر بن جائے گا۔ اسے بے نو اور درماندہ انسانوں کی دوستی اور وفات یوں راس آئے گی کہ پھر وہ ان ہی کا یار بلی، سگی ساتھی رہے گا۔ آخری سانس تک کرب تخلیق سے تڑپے گا اور اس کا سینہ اپنے لوگوں کے غم میں ترے گا۔ لوگ اسے دیوانہ کہیں گے اور وہ دیوانہ کہنے والوں کے بارے میں لکھے گا۔

بے یلینے، ہمیں اس شر میں دیوانہ کہتا ہے
نہ جانے کیا خرابی ہے نری جان، عشق انساں میں

احباب جالب نے آج اس رمز شناس اور درد آشنا کی محفل آراستہ کی ہے جس کی آنکھوں میں عشق انساں نے، عشق بشر نے کیے کیے خوابوں کے چراغ رکھ دیئے۔ محرومی و محکومی سے آزادی، جبر و ظلم سے رہائی اور ناانصافی و نابرابری سے دشکاری کے خواب اور وہ ان خوابوں کے فراق میں قزو الحین طاہرہ کے شرکی تصویر بن گیا۔

ی زود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

اپنے لوگوں کے لئے اچھے دنوں کے خوابوں کے فراق میں، اپنی دو آنکھوں سے خون کی دھارا نہیں بہانے والے جالب کے ساتھ اسی شریں ہونے والا وہ جلسہ بھی مجھے یاد ہے۔ جب خیالوں اور خوابوں پر پرے تھے۔ اس وقت بھی اس کا نام بقاوت کی علامت تھا اور اس کے کلام کی اشاعت پر تقریریں تھیں۔ تب بھی اس کے چاہنے والے شرکی چاروں سمتوں سے اسی طور پر اُٹے تھے اور انہوں نے اسی دیوانگی سے، اس سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔

اس دن کی اور آج کی یہ وارفتگی یہ وابستگی جالب کے قالب سے نہیں، اس بیان وفا سے ہے جسے جالب نے اپنے لوگوں سے استوار کیا تو اسے ہانپنے کے لئے ہر مرطے سے سرخرو اور سرفراز گزر گیا۔ یہ عشق بشر تھا۔ مجبوروں اور مظلوموں سے بیان وفا تھا۔ جس نے جالب سے کہلوایا۔
ہماری قید سے لہی نہیں ہے ظلم کی عمر

یا پھر یہ کہ

شاہوں سے جو کچھ رہا نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا، کچھ اپنی ذہاں تھی
میا نے یونہی تو قلص میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی!

جالب ان خوش نصیبوں میں سے ہے جو خود بھی پابند سلاسل رہے اور جن کی تحریروں پر بھی قدغن رہی، اس زمانے کے آدمیوں کو شاید اس کا علم نہ تھا کہ صدیوں پہلے چٹاگل کے بندی خانے میں کتابیں بھی پابہ زنجیر کی جاتی تھیں۔ انہیں معلوم ہوتا تو بیرونی میں وہ بھی اس کی کتابوں کو کوٹ لکھت جیل میں یا شاہی قلعہ کے تہہ خانوں میں زنجیروں سے جکڑ کر رکھتے اور خوش ہوتے کہ وہ صرف جالب کو ہی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، انہوں نے اس کے لکھے ہوئے لفظوں کو بھی اپنی زنجیروں کا امیر کیا ہے خوشبو کو بیڑیاں پہنائی ہیں، روشنی کو ہتھکڑیاں ڈالی ہیں اور زندگی کے گلے میں طوق غلامی آویزاں کیا ہے۔

سچے لفظ آدمیوں اور عاصیوں کی راتوں کی نیندیں اڑا دیتے ہیں۔ ان کا چین چین لینے ہیں۔ سکون عادت کر دیتے ہیں۔ سچے لفظوں کی سچ پر خیال کی رنجیں آرام کرتی ہیں لیکن یہی سچ، عاصیوں کے لئے کانٹوں کا بستر ہوتی ہے۔

سچے لفظ شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، فن کاروں اور سیاست دانوں کے لبوں کی منڈیر سے اڑتے ہیں تو مظلوموں کے دلوں کی پھرتیوں پر اترتے ہیں، بندی خانوں کی سلاخوں پر سر رکھ کر سکتے ہیں۔ ان کی روشنی زندانیوں کے دلوں کو اجلاتی ہے اور سرا مکنہ انسانوں کے دلوں میں بہاوت کا شعلہ بن جاتی ہے۔

جالب نے ہر عہد میں روشن حرف لکھے ہیں، سچے بول بولے ہیں، اسی لئے اس نے اپنے لوگوں سے جو بیان وقابانہا، اس میں بیٹھ سکا رہا۔ اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے، اس نے جمونے لفظ نہیں لکھے، کھونے گیت نہیں گائے۔ وہ ان اہل صدق و معاف میں سے ہے۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان کے بے گناہ شہریوں پر وحشیانہ فوج کشی کے خلاف آواز بلند کی۔

محبت گولیوں سے بھر رہے ہو
دطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو

مکان تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یعنی مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

وہ ہر آمر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور ہر جاہل کو اس کی طرف سے دھڑکا رہا۔ وہ اس دھڑکی کے ان لکھنے والوں میں سے ہے جن کا رشتہ بیٹھ اپنے لوگوں کے دکھوں اور سکھوں سے استوار رہا۔ وہ ان سوداؤں میں سے ہے جو ان نٹالوں میں بھی شیر کی طرح ہونکتے رہے جب یہاں ہر طرف بھیڑیوں اور ککڑ بکھوں کا میڈروں اور گھڑیالوں کا راج تھا جب بہت سے لکھنے والے اپنے خاموش رہنے کے حق میں خوبصورت دلیلیں لاتے تھے اور کسی سولی کے سائے میں بچھائے جانے والے دسترخوان پر بیٹھ کر تر توالے کھاتے تھے اور اپنی شرکت کی سوسو تلویلیں بناتے تھے۔ جالب کے دم قدم سے کھٹک کی اور لکھنے والوں کی توقیر ہے۔ اس کے قلم نے جانے کتنے لکھنے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور تب ہی تو جالب نکلنے سے یہ کہہ سکا ہے۔

مجھ سے خفیف ہیں میرے ہم عصر اس لئے
میں داستان حمد ستم کھل کے کہہ گیا

جالب ان تخلیق کاروں میں سے ہے جنہوں نے لفظوں کے چراغ اپنے لو سے روشن کئے ہیں اور پھر ان چراغوں کو لیٹائے وطن کے چاہنے والوں نے اپنا لو دیا ہے۔ وہ چراغ جن میں لو جلا ہو وہ بجتے نہیں۔

لو کسی امیر المومنین کی مملکت میں کتوں سے نکلے والا تیل تو نہیں کہ خشک ہو جائے۔ یہ لو ہمارے نوجوانوں کی رگوں میں پھیلا ہے۔ ہماری عورتوں اور ہمارے مردوں کے بدن میں دھڑکتا ہے۔ ہمارے بچوں کی نسوں میں ہلکتا ہے۔ جب تک ہماری دھڑکی میں آزادی کا ایک بھی متوالا زندہ ہے اس وقت تک یہ چراغ جلنے رہیں گے اور رات کو دن سے بدلنے رہیں گے۔

رستہ کہاں سوچ کا کوئی روک سکا ہے

ہوتی ہے کہاں رات کے زندان میں عمر بند!

آج ہم جس زمانے میں جالب کو لفظوں کا خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں وہ جدوی جسوریت کا زمانہ ہے یہ زمانہ کسی کی عطا نہیں کسی عاٹنے کا نتیجہ نہیں یہاں تک پہنچنے کے لئے شاعروں اور دانشوروں نے جیلیں کٹی ہیں۔ نوجوان اور سیاست دان چٹائی چڑھے ہیں۔ اس زمین سے عشق کرنے والے جلاوطن ہوئے ہیں۔

اس زمانے کو پانے کے لئے اس علاقے کے ان گنت مردوں اور عورتوں 'جوانوں اور بچوں نے اپنی خوشیاں اور اپنی زندگیاں دان کی ہیں اس کے شہروں اور دیہاتوں میں گھج شہیداں آباد ہوئے ہیں۔ اچھ کے زندالوں کی دیواروں میں نہ جانے کتنی چھینیں اور کتنی کراہیں جذب ہوئی ہیں اور اس کی حقیرت گاہوں کے نزدیک گوشوں میں نہ جانے کتنے خوش خیال اور خوش جمال نوجوان اپنی تڑپ ہوئی ہڈیوں اور اپنے جلتے ہوئے زخموں کو سیٹھے۔ بے نام و نشان قبروں میں سوتے ہیں۔

جسوریت کی وہ مضمی سی کوئیل جو آج بھی طوفانوں کی زد میں ہے اسے جالب اور اس جیسے دوسرے لکھنے والوں نے اپنی بے باکی اور حق گوئی سے پرورش کیا ہے۔ جس طلوع صحر کے دھندلے سے آثار آج ہمیں نظر آرہے ہیں اسے آواز دینے کے لئے جالب کا سینہ خرچ ہوا ہے ' اس کے لب سوکھے ہیں ' اس کی توانائیاں لٹی ہیں ' اس کے پیادوں کی خوشیاں چھنی ہیں۔

اپنے شاعر سرکشیہ کے لئے ہم سب مل کر یہی خواہش کرتے ہیں کہ وہ شاد کام اور شاد خواب رہے۔ اس کی انگلیاں وقت کی دباہی کریں اور اس کا دل عشق بشر کے سمندر کی غواہی کرے۔ اس کے قدر شناسوں کی تعداد بڑھتی رہے۔ اس پر بارانِ خن ہوئی رہے۔ اس خست بدن اور بخت ذہن انسان نے اپنی تمام زندگی منصور کی شریعت پر بسر کی ہے اور ہمیں اس میں بھگ نہیں کہ اگر پھر کوئی بری گھڑی آئی تو جالب اسی شریعت پر چلے گا۔ میر نے آج سے صدیوں پہلے اسی قبیلے کے لوگوں کے لئے کہا تھا۔

موسم آیا تو گل دار پہ سیر
سر منصور ہی کا بار آیا!



کہاں سے۔ جو آئے دن نہایت مستعدی سے جیل چلے جاتے ہیں، پھر واپس آتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں جبکہ اس کوچے میں جانے کے بعد بڑے بڑے سفارشن کی پناہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کے سلسلے میں اور اس ہمت کی اساس تک پہنچنے کے لئے میں نے تمام تفصیلات مہیا کیں۔۔۔ آخر یہ کس پتلی کا پاپا کھاتے ہیں۔۔۔ اور کیا کھاتے ہیں کس اکھاڑے میں زور آزمائی کرتے ہیں۔ گلہ کاشی کے ہلاتے ہیں یا چاندی کے مظلوم ہوا غذا تو دی ہے جو عام طور سے سی کلاس کے قیدیوں کو ملتی ہے اکھاڑہ بھی جیل کی کوٹھری ہی ہے۔ مگر روٹی کی جگہ لوہے کی ہتھکڑی پہن لیتے ہیں جسے ہلاتے تو نہیں سکتے، مگر ہاتھ اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس پر نظم لکھ لیتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے جاننے کے بعد بھی اس سوال کا جواب نہ ملا تو پھر یہ طاقت آئی کہاں سے۔

خواتین و حضرات! جالب کی ہمت کی اصل ذمہ داری میں مجھے وقت نہیں ہوتی۔ ان کی ہمت اور حوصلے کی اساس تو دراصل آپ لوگ ہیں۔ وہ سب لوگ جو جالب کو چاہتے ہیں جسکی تعداد سینکڑوں سے گزر کر اب لاکھوں میں پہنچ گئی ہے۔ جالب کے کمزور جسم میں ان سب کی قوت سما گئی ہے جالب کی تسکین، بیڑ حال باتوں میں ان سب کا دم خرم ہے ان کی جلتی بجھتی آنکھوں میں لاکھوں کے خواب ہیں۔ ولادین اور معصوم خواب۔۔۔ جنہیں ان سب نے جالب کو سونپ دیا ہے جہی تو جالب ڈرتے نہیں جھکتے نہیں۔ جھکتے نہیں دیکھتے نہیں۔

جالب نے ایک زمانے میں بہت خوبصورت شاعری کی ہے۔ تک تک سے درست، دلہن کی طرح آراستہ، فنی خبیثوں سے مرقع، دلوں میں اتر جانے والی۔۔۔ شاعری کی یہ کمپوز راہ جالب پر بہت مہیاں تھی۔ مگر جالب نے دوسرے لمبائے والوں راستوں کی طرح اس راہ سے بھی اپنا رخ موڑ لیا۔ جان بوجھ کر اپنے طرز فکر کو ایک ایسا لہجہ دیا جو سب کا تھا۔ جسے سب نے اپنے دل کی آواز سمجھا اور جسے سمجھنے میں لاکھوں لوگوں کو کسی سارے کی ضرورت نہیں پڑی اور انکی ہر نظم مشاعرے کے اختتام پر ترانے کی شکل اختیار کرتی گئی۔ کیسی انجی بات ہے کہ اتنی ہر دلچسپی کے باوجود جالب برتری کے کسی عذاب میں مبتلا نہیں ہیں۔۔۔ نہ اس ابھرنے کا شکار ہیں کہ وہ بہت بڑے بڑے مشاعروں کے

پہنچے ازاں سکتے ہیں اور نہ ہی وہ زعم کی اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ جو درجہ بلند ان کو مل گیا اور کسی کو نہیں ملے گا۔ اللہ نے انہیں ایک بڑی نعمت بخش دی ہے اور وہ ہے ان کا فنی دل۔ جسکی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک بھولہ پن ہے ایک سادگی ہے۔ ایک فقیرانہ دلکشی ہے ایک درویشانہ ادا ہے جو ان کو ہر دشمن راستے پر سبک رکھتی ہے۔ شاید یہی سبب

ہے کہ درد امیری کا کوئی تہ نہ ان کے سینے پر سجا نظر نہیں آتا۔ جیل کی بات کیجئے تو یوں شرابے لگتے ہیں کہ نجانے کس علت میں جیل گئے تھے۔۔۔۔ میں جالب کے دکھوں کی داستان آپ کو نہیں سناؤں گی، اس لئے کہ جالب کو اچھا نہیں لگے گا۔ انہوں نے ظلم کی حکایت نہیں بتائی بلکہ اسے حقارت سے دیکھا ہے جس چیز کو حقارت سے دیکھا جائے اس کا تذکرہ بھی نہیں ہونا چاہئے۔۔۔

علاقہ اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر جالب نے کہا تھا۔ علامہ مرحوم میری ڈیوٹی لگا گئے تھے کہ ”اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو“ میں اس ڈیوٹی کو بھگتانے کے سلسلے میں پندرہ بار جیل جا چکا ہوں۔

علامہ مرحوم تو ہم سب کی ڈیوٹیاں اپنے مختلف مصرعوں میں لگا گئے تھے۔ ہم نے پہلے تو ان مصرعوں کو سکھ رائج الوقت کی طرح خوب چلایا۔ پھر سڑکوں پر لگے ہوئے اشتیادوں اور دفاتر میں لٹکی ہوئی جھنڈیوں کے سپرد کر دیا اس پر بھی میری نہ ہوئی تو سارے مصرع قوالوں کی نذر کر دیئے مجھے حیرت ہے جالب کو ان ترکیبوں میں سے کوئی ترکیب نہیں سوجھی۔ دیئے جالب نے حقیقتاً علامہ کے جس مصرع کی ڈیوٹی کی ہے وہ غریبوں کو جگانے والا مصرع نہیں ہے۔ (ایک تو غریب سو تا ہی نہیں ہے تو جاگے گا ہی کیا۔)

دراصل وہ مصرع ہے ”آئینِ جوانمردی حق گوئی و بیباکی“۔ بد قسمتی سے ہمارے یہاں آئین تو ہے نہیں چاہے اسکا تعلق جوانمردی میں کیوں نہ ہو؟

جوانمردی کے جوہر البتہ دکھائے جاتے ہیں مگر اسکے لئے بھی فرق غانی کا، مولن اور نستا ہوتا ضروری ہے۔ اس قسم کے جوہر آج سے دو ڈھائی سال قبل لاہور میں دکھائے گئے تھے جب پاکستانی خواتین نے اپنے حقوق کی پامانی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا تھا۔ اس جلوس میں بامیں، بےنیں، بیٹیاں بھی شامل تھیں اور جوانمردان پر دھڑا دھڑا لٹائیاں برسا رہے تھے، اور عورتوں کے ساتھ لٹائیاں کھانے والوں میں اور ان کو لٹائیوں سے بچانے والوں میں ایک کمزور دل حبیب جالب بھی شامل تھے۔ کبہنیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن حبیب جالب کے ساتھ ہر حکومت کا سلوک یکساں رہتا ہے صہنہیں کے منظر بدل جاتے ہیں جالب کا منظر نہیں بدلتا۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ آخر ہم سب جالب کو کس طرح یاد رکھیں گے۔ کس طرح اس جرات کا صلہ دے سکیں گے، کس طرح اس احسان کا بدلہ اتار سکیں گے! تو میرے ذہن میں ہلکے ہلکے دو ایک تصویریں ابھرتی ہیں۔

ایک تو یہی کہ ہم سب محفلوں میں اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھنے ان کی شجاعت اور

حوصلے کی داد دیتے رہیں ' اور اکیلے میں ان سے معافی مانگتے اور اپنے آپ سے شرمندہ ہوتے رہیں - لیکن دوسری تصویر جو میں سوچتی ہوں زیادہ واضح اور بہت خوبصورت ہے شاید ایک عورت کی آنکھیں ہی یہ متحرک کیے سکتی ہیں - کچھ اس طرح کہ ہو سکتا ہے اس اجتماعی جلوس میں کسی نو عمر لڑکی پر برسنے والی لاشی کو جالب نے اپنے ہاتھوں پر روک لیا ہو ' برساً برس بعد وہ لڑکی اپنے بچوں کو ایک کمائی منائے اور کے کہ "سنو یہ کمائی نہ کسی بادشاہ کی ہے نہ وزیر کی نہ کسی جنگ جیتنے والے کی نہ ہارنے والے کی --- یہ ایک سیدھے سادھے انسان کی کمائی ہے جس نے ظلم و جبر کا مقابلہ کرتے وقت --- میری مدد کی تھی - وہ ایک شاعر تھا - اور اسکا نام حبیب جالب --- مجھے یہ نام آج بھی یاد ہے اور میرے بچے تم بھی اس نام کو یاد رکھنا "

اس سے زیادہ میں جالب کے بارے میں آپ سے کیا کہوں -

(لندن کے ایک چلے میں کی جانے والی تقریر)



سبب حسن سچا عوامی شاعر

اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگرچہ بچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ بھی عوامی انسان ہیں ان کا رہن سخن عوامی ہے۔ ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے ان کی قدریں عوامی ہیں۔ ان کی محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں۔ اور وہ عوام کے دکھ درد، آرزوں اور اسگوں کی ترجمانی عوام ہی کی زبان میں کرتے ہیں یہ جو ہزاروں لاکھوں انسان حبیب جالب سے اتنا پیار کرتے ہیں اور ان کے اشعار سن کر فرط جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں تو ان کا پیار، ان کی وارفتگی بے سبب نہیں ہے۔

یونانی دیو مالا کے ہیرو پرویتسوس کا قصور یہ تھا کہ اس نے انسان کو آگ کا استعمال سکھایا تھا اور اس طرح دیوتاؤں کا راز آدمیوں پر افشا کر دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں دیوتاؤں نے پرویتسوس کو چٹان سے بندھوا دیا تھا جہاں ایک گدھ دن بھر اس کی بوئیاں فوج کرکھاتا تھا۔ اس اذیت ناک سزا کے باوجود جب دیوتا اس سے کہتے کہ معافی مانگ لو تا کہ اس عذاب سے چھٹکارہ پاؤ تو وہ جواب دیتا کہ مجھے یہ

..... اذیت منظور ہے مگر تمہاری غلامی نامنکور۔ ایک رمزیہ کہانی ہے ورنہ شعور و آگہی کی سماعت دیوتاؤں کے دربار سے کبھی نہیں آئی بلکہ انسان نے سدا اپنے تجربے، مشاہدے اور قوائے عقل کی مدد سے تحقیق و تخلیق کے مراحل طے کئے ہیں اور قسم و ادراک کی پلندہوں تک پہنچا ہے۔ البتہ تاریخ کے ہر دور میں ہم کو ایسے خطرہ پسند بھی ملے ہیں جنہوں نے ہمیں حسرت ذات کا درس دیا اور ہمارے سماجی شعور کی لو تیز کی۔ ایوب

خان کی آمریت اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس تاریک دور میں ہمیں کیانی مرحوم اور حبیب جالب ابھر کر سامنے آئے۔ جب کبھی اس ملک کی نئی تاریخ لکھی جائے گی تو

دنیا کو 'علوم ہو گا کہ خوف اور دہشت کی اس فضا میں جہاں سانس لیتے :۔ ممتا تھا انہوں نے قوم کی ذوقی نبض میں کس طرح زندگی کا خون دوڑایا۔

کانٹوں کی پیاس بجھانا جیب جالب کا مقدر بن گیا ہے اور چارہ فہمی نوبہ سنا ان کا مسلک زیست ' وہ اگر ایک آنکھ سے روتے اور دوسری آنکھ سے ہنستے ہیں تو ان کا یہ رونا اور ہنسا دونوں عوام ہی کے حوالے سے ہے وہ روتے ہیں ' عوام کے حال زار پر اور ہنستے ہیں ان کے روشن مستقبل پر۔ ان کی شاعری شکست دل کی صدا بھی ہے اور سوز یقین کی لگاکر بھی۔ وہ دل توڑنے والوں کے ثروت و اقدار سے کبھی نہیں ڈرے بلکہ اندھیرے کے پجاریوں نے شب خون مارنے کے بعد جو نقاب بھی اوڑھی جیب جالب نے اس کو فوج کر پھینک دیا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس درویش خاک کشیں میں یہ جرأت انکار کہاں سے آئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو اس نیک دل اور نرم خو انسان کو باطل سے لڑنے اور حق کا اقرار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ درحقیقت وہ قوت عوام کی محبت ہے اور وہ چہرہ خیال جو جیب جالب کو ولولہ اور جوش عطا کرتا ہے عوام کی طاقت ہے۔ جیب جالب نے اپنی شخصیت اور شاعری کو عوام کی خاطر وقف کر دیا ہے۔

لوگ اٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو دھکے
سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے
کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خدا نے
فرسودہ بہتانے، وہی افسانے پڑانے
اے شاعرِ مشرق، یہی جھوٹے ہی بد ذات
پیتے ہیں لہو بندہ مزدور کا دن رات

سلیم اختر اچھوت شاعر

شاعر کی صرف ایک قسم ہے اور وہ ہے شاعر۔ جہاں تک شعر اور مختلف لیبیل چسپاں کر کے انہیں مختلف کابکوں میں بند کرنے کے رجحان کا تعلق ہے تو یہ غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی، رومانی، اشتراکی یا اسلامی شاعر ہونے کے باوجود وہ اپنی اصلیت میں وہ شاعر ہی رہتا ہے۔ کسی خاص طرز احساس کی نمائندگی کسی دبستان سے وابستگی یا فکری تحریک سے تعلق اس بنا پر اضافی امور ہیں کہ یہ اس کی شاعری کو ایک خاص ہیچ تو عطا کرتے ہیں لیکن اسے شعر کہنے کی قوت نہیں عطا کر سکتے۔

اگر شعراء کی اقسام کرنی ہی ہوں تو اچھا اور بُرا شاعر کی صورت میں ان کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے اور بس۔

اس تمہید کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ حبیب جالب کی شاعری پر جس انداز کی آراء سننے کو ملتی ہیں ان کا تب لباب یہ ہے کہ حبیب جالب بہت اچھا شاعر ہے۔ کیونکہ اس نے سیاسی نظمیں لکھی ہیں۔ بالفاظ دیگر سیاست کی تلوار اس کے دفاع میں بھی استعمال ہوتی ہے اور اس پر واک کرنے کے لئے بھی!

جہاں تک حبیب جالب کے شاعر ہونے کا تعلق ہے تو یہ کوئی نزاعی بحث نہیں ہے لہذا اسے شاعر بلکہ بہت اچھا شاعر تسلیم کرانے کے لئے تنقیدی استدلال کی ضرورت

نہیں۔ لیکن اس کی سیاسی شاعری۔ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ اس کا اپنا سیاسی مسلک یقیناً باعث نزاع رہا ہے۔ اس حد تک کہ بعض اوقات تو اس نزاع میں اس کے شاعرانہ محاسن بھی دُب جاتے ہیں۔

اور پھر سیاسی شاعری کوئی آج کی نہیں بلکہ ایک قوی روایت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی ابتدائی صورت اکبر الہ آبادی کے طنزیہ اشعار میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد چکبست آئے ہیں جنہوں نے انگریزی سرپرستی میں ”ہوم رول“ مانگا۔ ان کے بعد اقبال آئے، جن کا اپنا ایک مخصوص سیاسی فلسفہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بعض مقبول سیاسی تصورات (جیسے وطنیت، قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت) وغیرہ کا ژرف نگاہی سے تجزیہ کر کے ہوئے ان کی خامیاں آجا کر کیں۔ ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک آئی ہے جس نے نہ صرف یہ کہ سیاست پر بطور خاص زور دیا بلکہ اس کے ڈانڈے اشتراکیت سے بھی ملادیتے۔

تقسیم ملک تک ہر مسلک کے حامل شعراء کی سیاست میں غلامی سے نجات فدرٹر تک تھی لیکن تقسیم ملک کے بعد کے حالات کا تقاضا کچھ اور ہی تھا۔ جسے کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے اور کچھ کھرچ رہے جبکہ بعض نہ سمجھ کر بولے! الغرض عجب ذہنی خلفشار کا عالم رہا۔ جن کا سب سے بڑا باعث ملک میں حقیقی جمہوریت کا فقدان تھا یہ اس ملک کی بد قسمتی ہے کہ اسے جب کبھی بھی سیاسی استحکام نصیب ہوا وہ ہمیشہ آدمروں کے ہاتھوں ہوا۔ یوں کہ ہر آواز دہادی گئی اور خوش آمدت مستقبل کا خواب دیکھنے والے عوام کا یہ حال رہا!

چلی بھی جا جس غنچہ کی صدا پر نسیم!

ہمارے شعراء کبھی بھی بے شعور نہیں رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خوف و لاؤچی مصلحتیں

لب و لہو ہونے دیں۔

حبیب جالب سب سے پہلے محترمہ فاطمہ جناح کی الیکشن مہم میں ایوب خان کے خلاف پُر جوش نظموں کے ذریعہ عوام کے سامنے آیا۔ اس سے قبل وہ ایک غزل گو کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی اس کے بارے میں یہ نزاعی بحث جاری تھی کہ اس کی مقبولیت میں کس حد تک ترقیم کا ہاتھ ہے اور کس حد تک اس کے اشعار کا احوالیت محض ترقیم کا شاعر ہونا تو وہ آج بھی مشاعرے لوٹنے والا شاعر ہوتا۔ لیکن بعد نظر یہ نہیں ہے یہ

تجسّس کے مصداق اس نے خود کو مشاعروں کی گھٹی فضا سے باہر نکالا اور سیاسی جلسوں میں تاحرنگہ پھیلے پاکستانی عوام سے ہر باوراست اُن کی زبان میں خطاب کیا۔ یہ تبدیلی کیسے آئی؟

حبیب جالب نے ایک عام روائتی غزل گو کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ چنانچہ ”برگ آوارہ“ کی غزلیں دیکھیں تو غزل کے مخصوص اسالیب و مہنامیں ہی ملتے ہیں۔ کسی طرح کی بغاوت یا احتجاج کا اندازہ روا نہیں رکھا گیا۔ اس دور کے کلام میں ایسے رجحانات عقائد جنہیں اس کی سیاسی شاعری کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکے۔

اگرچہ اردو میں حسرت موہانی کی مانند ایسے غزل گو بھی ملتے ہیں جنہوں نے غزل کو سیاسی افکار کا آئینہ بنا دیا۔ مگر حبیب جالب نے غزل کو سیاسی ابلاغ کا ذریعہ نہ بنایا۔ اس عہد کا حبیب جالب تو سیدھا سادا غزل گو ہے اور بس!

لیکن اچانک حبیب جالب ایک دوسرے روپ میں نظر آتا ہے۔ وہ غزل گو کی محفوظ زندگی تیاگ کر سیاست کے خارزار میں قدم رکھ چکا ہے۔ زلف و رخسار کے گیت گانے والا آب و واروسن کی حکایات سنار ہے۔ ادویوں حبیب جالب کی صورت میں حابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والے شاعر کا ظہور ہوتا ہے اور گزشتہ چودہ پندرہ برس سے وہ اپنی ساختہ روایت کو نبھاتا چلا آ رہا ہے۔ ان برسوں میں پاکستان نے بہت کچھ دیکھا بہت کچھ گنوا یا، بہت سے لوگوں کو برداشت کیا۔ بہت سوں پر نچا در ہوا۔ مصلحت پسند شعراء کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ لیکن حبیب جالب محض حبیب جالب ہی رہا۔ اور وہ بھی زیادہ تر جیل میں! اس میں اس کے سیاسی مسلک کا قصور کم ہے اور اس کی شاعرانہ ہمت و صریح کا زیادہ! اگر اس نے خود کو سب سے زیادہ انمول ہانا، نہ خود کو منڈی میں لایا اور نہ اپنی قیمت چکانی۔

حبیب جالب ہمیشہ در سیاست داں نہ رہا۔ اس نے لچیلی ڈال کی مانند بدلتی ہوائوں کے ساتھ ساتھ رُوح نہ بدلتا گیا، بلکہ ایک مضبوط تنے کی مانند آندھیوں کے جھکڑوں میں بھی قائم رہا، اور اسی نے آج اس کا نام عزت و احترام سے لیا جا رہا ہے۔ اپنی تخلیقی زندگی کی رچ مدی جس میں پریشانیوں کے برسوں کی بھی کمی نہیں گزرا لے کے بعد حبیب جالب اب سیاست سے بے زار ہو چکا ہے۔ اس نے کجمن کی خاطر اس نے مصائب برداشت کئے وہ بھی اسے احتمال

ہی کرتے رہے مگر شاعر محض شے کبھی نہیں بن سکتا۔ اور بالخصوص حبیب جالب ایسا شاعر جس کی متاع ہی شاعرانہ آنا ہوا، اس لئے آج وہ سیاست دانوں سے، مجلسوں سے، مہلوں سے، حتیٰ کہ اپنے بیشتر ہم عصر شعرا سے بھی بے زار ہو کر الگ کھڑا ہے۔ غالباً اسے اپنے مشن کے بے مصرف ہونے کا تلخ احساس بھی ہے اور یہ بھی کہ میں نے جو کائنات وہ بویا نہ تھا۔ اور جو بویا تھا اس کی فصل دوسرے لے گئے۔ لیکن اپنی تمام شاعرانہ بعیرت کے باوجود حبیب جالب اس حقیقت کو نہ کچھ سکا کہ بچ بولنے والا ہمیشہ تنہا ہی رہتا ہے۔ دشمن کو بچ گوارا نہیں جبکہ دوست بچ کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسی لئے بچ بولنے والا معاشرہ میں اچھوت بن کر رہ جاتا ہے۔ آج حبیب جالب نے بھی سیاست میں اچھوت کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ اب اس کی پارٹی بھی اسے اپنانے کی روادار نہیں۔

یہ سب اس میں ایک باطنی کشمکش پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش جس کی آئینہ کمزور اعصاب کو سوکھی گھاس کی طرح جلا کر رکھ کر دے۔ لیکن یہی شاعری کا سونا اس میں سے کندن بن کر نکلتا ہے۔ زمانہ حبیب جالب کی تخلیقی زندگی کے دو ادوار دیکھ چکا ہے۔ غزل گو اور سیاسی نظم گوئی۔ ہم نے اس کی تخلیقی شخصیت کے یہ دو روپ تو دیکھ لئے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کا خاموش حبیب جالب جب بھل بولے گا تو یہ اس کی تخلیقی شخصیت کا تیسرا روپ ہوگا۔ میں ادب میں جین ڈکسن کی مانند خوشین گوئی کا قائل نہیں لیکن مستقبل کے حبیب جالب کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ گزشتہ دو نسل ادوار کا امتزاج ہوتے ہوئے بھی ہر دو سے منفرد ہوگا۔ حبیب جالب کا ایک بہت پرانا شعر ہے۔

پھر جار ہا ہوں تیرے تبسم کو لوٹنے ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ
اور مجھے یقین ہے کہ وہ تبسم لوٹنے کا فن ابھی بھولانہ ہوگا۔ ابھی اسے مزید تبسم لوٹنا ہے اور نوٹ کے اس مال کو سب میں تقسیم بھی کرنا ہے کہ اسی طرح اس کے حصہ کا تبسم اُسے مل سکتا ہے۔



شاہد شیدائی

رو بہ برو

حبیب جالب لی ایک تازہ، غیر مطبوعہ غزل کا یہ مطلقہ
شعر کا عشق اگر ہو تو غزل میں جالب
کیوں کسی اندک انداز بیان یاد آئے

سُن کر، اُس دور کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے جب یار لوگوں نے میر تقی میر کے انداز میں غزلیں کہنے
کی طرح ڈالی تھی۔ یہ ایک ایسی منفی زد تھی جس کے خلاف جالب نے اپنی شاعری میں آواز بلند کر کے
نہ صرف اپنا راستہ متبعت کیا تھا بلکہ اپنے ہمعصرین کو بھی مثبت جہت پر چلنے کی ترغیب دی تھی۔
دہلی کے ”آل انڈیا پاک مشاعرے“ میں جس کی صدارت فراق گورکھپوری نے کی تھی۔
حبیب جالب نے اپنی اس غزل پر ٹھہروں داد وصول کی تھی۔

جس کی آنکھیں غزل، ہر ادا شعر ہے
وہ میری شاعری ہے۔ مرا شعر ہے

غزل پڑھتے پڑھتے جالب، جب اس شعر پر پہنچے تو انہوں نے داد و طلب انداز میں
فراق کو مخاطب کیا۔ ”فراق صاحب! یہ شعر آپ کی نذر ہے۔“
اپنے انداز میں بات اپنی کہو!
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

ابھی روایات ان کے لبوں پر ہی تھیں کہ مغل ”داہ داہ“ اور ”مکڑ ارشاد“ کی صداؤں سے

گزشتہ اٹمی۔ جالب نے "فراق صائب، شعر نذر کرتا ہوں" کہا اور شعر کو پھر نضائیں اُٹھا لیا۔ پھر داد برتن اور "سکندر اشاد" کے نعرے گونجے۔ جالب نے میسرے پر "فراق صائب، یہ شعر آپ کی نذر کرتا ہوں" کے الفاظ کے ساتھ پھر نضائیں ترنم بھیر دیا۔ مگر فراق کو کھڑی ہر بار اپنے غصے کو ضبط کئے بیٹھے ہے۔ چند منٹ کے بعد کلکتے میں شاعر تھا جب جالب بھی مدعو تھے اور فراق کو کھڑی بھی۔ فراق (غائبانہ ہٹل کے) کسی کمرے میں ایک مغل کیف سرد ہمارے بیٹھے تھے۔ ایک شاگرد عزیز ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ جالب نیاز مندی کی خاطر ان کے حضور پہنچے ہی تھے کہ فراق حلال میں آگئے اور بولے "میاں، اُس دن کیا شعر پڑھا تھا تم نے؟ بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے؟ اگر ہم نے میر کے انداز میں دو چار غزلیں کہہ دی ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا سارا کلام میر کے رنگ میں ہے۔ یہ بات جالب کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ دہلی کے شاعرے میں فراق برا مان گئے تھے اور انہوں نے نہایت سادہ شعر کو اپنے آپ پر طنز سمجھ لیا تھا۔ جالب معاملہ کی سنگینی کو جانپ گئے اور عرض گزار ہوئے کہ انہوں نے تو فراق کو داد طلب انداز میں مخاطب کیا تھا۔ ان کا مقصد نہ تو فراق پر چوٹ کرنا تھا اور نہ ہی انہوں نے فراق کی غزلیں پڑھی تھیں جو انہوں نے میر کے انداز میں کہہ رکھی تھیں، بلکہ انہوں نے تو اپنے ملک میں چلی ہوئی ایک منفی رو پر طنز کیا تھا۔ اور بس۔" میں تو آپ کو صاحب طرز شاعر مانا ہوں۔ بھلا میری کیا مجال کہ آپ کی شان میں گستاخی کروں؟ جالب کی اس وضاحت کے بعد ان کا نقد ٹھنڈا ہوا۔ پھر کلے محلے لگا یا اور "شریک مغل کیف و سرور" بھی کیا۔ اور پھر شاعرے میں جالب کا نام پکارا گیا تو فراق خود مایک پر آئے اور ان الفاظ کے ساتھ جالب کا تعارف کرایا،

"میر آبائی کا سونہ اور سوراخ کا نقد جب بچا ہو جلتے ہیں تو

جب جالب ان چند خوش قسمت شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ کام کر کے تجربہ حاصل کرنے کے مواقع میسر آتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس تجربے

کو اپنے فن میں یوں دبا لیا کہ ہر دیکھی انسان کو حبیب جالب کے شعرا اپنے ہی دیکھ معلوم ہوتے
 ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حبیب جالب ایک عوامی شاعر ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے
 عوام میں اتر کر عوام کی زبان میں — اُس زبان میں، جسے لوگ سمجھتے ہیں — نہایت سادہ
 اور سلیس الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے اُن دیکھوں کو نظم و غزل کیا ہے جو ہم سب کے، تمام
 دیکھی انسانیت کے مشترک دیکھ میں ہے

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
 نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

حبیب جالب کو شعر کہنے کا شوق بچپن سے ہے۔ ساتویں جماعت کے سالاد امتحان
 میں، جالب کے لئے "وقتِ سحر" کو نثر کے محلے میں استعمال کرنا مشکل تھا اور شعر میں
 باندھنا آسان۔ چنانچہ جب اس شعر میں ہے

دھوکا تھا آئی، گئے اشب ضرور ہم
 دودھ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر گیا

اُن کے رفیقِ استاد شین شاہ نے "وقتِ سحر" کا استعمال دیکھا تو غصہ غصہ کر اٹھے اور
 ملنے پر یوں گویا ہوئے "حبیب تیں تو شاعر ہے بھی! انہیں خوشی تھی کہ اُن کا ایک شاگرد
 (حبیب جالب) با معنی اور با وزن شعر کہہ لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق بڑھتا گیا۔ قیامِ پاکستان
 کے دن ۱۴ راکٹ، ۱۹۳۰ء کو جالب کو کراچی چلے آئے۔ شعر کہنے کا شوق بھی ہجرت کر کے ساتھ
 ہی آیا۔ کراچی میں دہلی کے اور یوپی کے تقریباً تمام اُستادہ اور اُن کے شاگرداں عزیز بھی بہت
 آہستہ جمع ہوتے گئے۔ حبیب جالب اُن کی محفلوں میں جاتے۔ اُن کا کلام سنتے، اُن کی
 چچلشوں سے متغیض ہوتے۔ شاعروں میں باقاعدہ شرکت کرتے (غالباً ۱۹۳۸ء میں

راغب مراد آبادی بھی کراچی چلے آئے جالب نے جب اُن سے "شعرِ اجم" اور "نکاتِ سخن
 ایسی کتابوں کا نوکر سنا تو بہت متعجب ہوئے، کیونکہ اُن کے لئے کتابوں کے یہ نام بالکل نئے

تھے۔ وہ کمرادہ اور سلیس زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بہت محدود تھا
 دلی اور یوپی کا یہ رواج بھی کہ اساتذہ کرام اپنے شاگردوں کو غزلیں خود لکھ کر دیا کرتے تھے
 لیکن حبیب جالب اس رواج کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں اچھا نہ لگتا تھا کہ ان کی غزل
 میں راعب مراد آبادی کچھ ایسے الفاظ رکھ دیں کہ

کوئی پوچھے کہ یہ کیسے تو چھپائے نہ بنے

لوگ بھاری بھر کم الفاظ کے سنی پوچھیں اور جالب بنا نہ سکیں۔ یہ ان کے لئے
 قابل قبول نہ تھا۔ تاہم جب وہ کسی محفل یا مشاعرے میں شعر سناتے تو راعب مراد آبادی
 سے کچھ نہ کچھ تعلق کی بناء پر شروع شروع میں لوگ یہی سمجھتے رہے کہ جالب، راعب کا
 کلام پڑھ رہے ہیں۔ "پانا ہی بڑ ہے" جیسے الفاظ کہہ دینا اساتذہ کی عادت جو شہری تھی۔
 ایک مشاعرے میں جالب نے جب اپنی غزل پر راعب کو داد وصول کرتے دیکھا تو فادات پر
 آکر ہر گئے، اُد ان سے ناطہ توڑ لیا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ راعب مراد آبادی،
 حبیب جالب کو عمیل الدین مالی سے ملوانے کے لئے ساتھ لے گئے۔ مالی اپنے دفتر کی کینٹین
 میں بیٹھے تھے۔ کچھ عالم کیف طاری تھا۔ اسی کیفیت میں راعب نے تعارف کراتے ہوئے
 کہا: "تو جوان بہت اچھا کہتے ہیں اُد بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ جالب تخلص کرتے
 ہیں۔" مالی نے فوراً جالب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا،

"تم خود شعر کہتے ہو؟"

"جی ہاں"

"اچھا، کوئی شعر سناؤ!"

"مذہم ہو گئیں خطا کرتے شرم آتی ہے اب دُعا کرتے"

"اگر یہ شعر تم نے خود کہا ہے تو پھر اس _____ کے ساتھ کیوں آتے ہو؟
 اس واقعے کے بعد جالب، راعب کے ساتھ نہ کسی شاعر کے پاس گئے اور نہ کسی

مغل یا شاعر سے ہیں۔ گویا جانب کی شعری تربیت بھی ایسے ماحول اور ایسی فضا میں ہوتی جہاں
 پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی جانب نے آزاد رہنا ہی پسند کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ جو
 مصرعہ جو شعر کہتے ہیں اپنے رنگ میں کہتے ہیں، اپنے ڈھب میں کہتے ہیں۔
 یہ کونسی ہستی ہے جہاں چاند نہ سورج
 کس درجہ بُری رات ہے، کس درجہ بُرا دن

معاشی حالات کے دباؤ کے تحت، حبیب جانب اپنا سلسلہ تعلیم ملوی نہ رکھ سکے۔ ان
 کے والد جو دہلی میں رہ گئے تھے، تقریباً ڈیڑھ برس بعد پاکستان آئے۔ جانب ۵۲ - ۱۹۵۱ء
 میں لاہور آکر سید فرید کاظم گیلانی کے والد سید اولاد علی شاہ گیلانی (جو ان دنوں انسائیکلو پیڈ
 آف اسلام لکھ رہے تھے) کے ہاں رہنے لگے۔ انڈین ٹیل کالج میں داخلہ لے لیا۔ لہذا نامہ امتحان
 میں پچھتر روپے ماہوار شاہروہر "پروف ریڈر" کا کام بھی کرتے تھے۔ گیلانی صاحب کے
 مکان کا راستہ "اُس بانار" سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دو اڑھائی بجے رات میزبان کے
 مکان کی طرف جاتے وقت اکثر پولیس والے دھر لیا کرتے تھے اور سر بار گیلانی صاحب کو
 چھڑوانا پڑتا تھا۔ گیلانی صاحب اس نذر و نذ کی حواست اور رہائی سے تنگ آ گئے۔ اتنی چپاکی
 سال کے بوڑھے تھے، روزانہ اتنی رات گئے دعوانہ کھولنے میں دقت ہوتی تھی۔ انہوں نے
 جانب کو اپنے لئے کوئی اور انتظام کر لینے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت
 بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث مدلیتی، سید وقار عظیم جیسے شفیق اور محسن اساتذہ کی بدولت فیس کو
 معاف ہو گئی لیکن باقی کہاں تک ہوتا۔ پچھتر روپے میں کتنے کا مکان لیتے اور کتنے میں
 گزارہ کرتے؟ آخر کار، ناچار و لاچار تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ فاقے
 زندگی کا مقصد تھے۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ آج یہاں، کل وہاں۔

آج اس شہر میں، کتنے شہر میں، بس اسی لہر میں
 اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا، شوقِ آوارگی

شہروں شہروں گھومے۔ قریوں قریوں ناک چھانی۔ مگر لاہور کی یاد ساتی رہی۔

اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
کس شہر کیا چھوٹے کے لاہور۔ کہیں کیا

”لاہور کی گلیوں میں رسنے کے لئے آدمی میں بہت خون ہونا چاہیے“ یہ الفاظ بھی

جالب کے کہے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہے

اب کس پر ستم، اُسے ستم اباد کرو گی

لاہور کی گلیوں! تجھے تم یاد کرو گی!

جالب غور جمع کر کے سبے اور جب اس قابل ہو گئے تو پھر لاہور میں آن ڈیرا جمایا لیکن

یہ غور جمع کرنے میں انہیں کتنا وقت لگا — کون کون سے مراحل طے کرنا پڑے — کتنے

جتنی آٹھاسے اور کیا کیا مصائب بھیلے — یہ جالب ہی جانتے ہیں۔

کسی نے طنز کے لہجے میں کہا تھا کہ جالب بھی کوئی شاعر ہے؟ فیض احمد فیض نے

جواب دیا تھا کہ جتنے سامعین جالب کو میسر آئے ہیں، گنتے آٹھ تک (اُن ہیئت) کسی

شاعر کو نصیب نہیں ہوتے۔ یوں دیکھا جائے تو جالب اردو ادب میں وہ پہلا شاعر ہے جسے

سننے کے لئے لاکھوں آدمیوں کا مجمع اُن کا منتظر رہا ہے۔ وہ لائل پور کے صرف ایک

شاعرے میں شریک ہوتے تو راتوں رات سائے شہر میں مشہور ہو گئے اور جس غزل کی

بدولت انہیں شہر گیر شہرت ملی تھی، اُس کے اس شعر نے انہیں ملک گیر شہرت

کا حامل بنا دیا ہے

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں!

دنیا والے، دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

ایک بار گنڈ گھر کے قریب خواجہ ناظم الدین (اُس وقت کے ذریعہ عظمیٰ) کی عداوت میں شاعر

جوا۔ سہگل بارداران منتظمین تھے جمیب جالب نے خوب داد سیٹی، سعید سہگل نے کہ نور ملز

کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ اس ملازمت کے دوران جالب نے کوہ نور ملز میں م حسن لطیفی اور تاج محمد نیل
کی صدائوں میں شاعر سے کرائے۔ لیکن وہ مالکان کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکے اور
مزدور دوستی کی بدولت ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مہینوں میں

عشق کے باب میں، حبیب جالب کہتے ہیں کہ وہ جو ایک روایتی عشق ہے، نقطہ شاعری
کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تو شاعری بھی انسانوں کی بیانیے ہندسوں سے ہوتی ہیں۔ ہندسے جو
اس دور کی قوت سمجھے جاتے ہیں۔ ہندسے، جن کے بغیر آج کے انسان کو ادھر اگرا کر جانا ہے
ہندسے جو چٹیک میں بھرے جاتے ہیں۔ ہندسے، جن کے ساتھ چہروں کی پہچان وابستہ کر دی
گئی ہے۔ فن پر ان دیکھے لوگوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔ صرف ان ہندسوں کی بدولت جو
بنک میں محفوظ ہوتے ہیں اور

تیسرے کوپے اس بہانے میں دن سے رات کرتا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

جیسا کلام اس دور میں حوصلے کی بات ہے۔ تھوڑے نہیں کہ حبیب جالب کو کسی نے نہیں
چاہا۔ وہ چاہے بھی گئے ہیں لیکن ان کی بے سرو سامانی ہمیشہ ان کے آٹے آتی ہے۔ انہیں
مسکندوں سے اٹھا کر باہر پھینکا دیا گیا۔ وہ مقبروں، مزاروں اور تھروڈوں پر سوتے۔ بھلا ایسے
آدمی کے ساتھ بھی کوئی صاحبِ دختر اپنا رشتہ استوار کر سکتا ہے۔

غم بیان پر، دہاں پہ شادی ہے

مسئلہ سارا اقتصادی ہے

پھر انہوں نے سوچا کہ پہلے ایک نو لیویٹ، مثالی معاشرہ تشکیل دے لیں۔ جس میں
پیار ہی پیار ہو، محبت کی فراوانی ہو۔ کوئی آدمی نہ ہو، کوئی بیچا نہ ہو، کوئی چھوٹا نہ ہو، کوئی

بڑا نہ ہو۔ سب برابر ہوں۔ پھر عشق بھی کر لیں گے اور یوں حبیب جالب کا عشق مائے ملک کا عشق بن گیا۔ گھر سے لگی میں، لگی سے شہر اور پھر ملک میں۔ اور پھر پوری دنیا کا غم انہیں جاٹ گیا۔

حبیب جالب کے اس خیال سے کسے اتفاق نہیں کر لیے سرمایہ دار اور جاگیردار بہت کم ہرے میں جو سچی سیاست میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ "امروزہ" اور پروگریسو میگزین لیڈ کے دوسرے جرمینوں کی مثال دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ ان کے اجراء کا مقصد کوئی تجارتی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ میاں انصار الدین کا نقطہ نظر تھا کہ پاکستان میں قوم پرستی اور ترقی پسندی کی بڑی مضبوط کی جائیں۔ ان حالات میں اگر وہ ملیں بھی لگا لیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ جب کہ انہوں نے ایک ادارے میں ایسے لوگوں کو یکجا کیا جو ملک اور قوم کو ہر اعتبار سے خود مختار اور آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ حبیب جالب نے ایک "پروف ریڈر" کی حیثیت سے امروزہ لاہور میں کام کیا پھر کراچی منتقل ہوئے تو امروزہ ہی سے وابستہ ہوئے۔ وہاں "آزاد پاکستان پارٹی" کی بنیاد رکھی گئی تو جالب کا ذہن چونکھو اس پارٹی کے منشور سے نظریاتی طور پر ہم اکہنگ تھا، اسلئے انہیں کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے دیہات میں جانا پڑا۔ فرض کے تحت حیدر بخش جتوئی کے ایکشن میں گئے اور گیت پڑھا جس کا ایک حصہ درج ذیل ہے۔

حیدر بخش جتوئی رے بھیا

حیدر بخش جتوئی

ہمارے کا غم کھانیوالا اور ندو جاکوئی

حیدر بخش جتوئی

ہم لاکھوں کی کوچی ٹوٹے جاگیردار اکیلا
اچھا پیسے، کار میں گھومے، ٹھاٹھ کرے ایلا

ہم تو روئیں بھوک کے مارے اور اسکے گھر میلہ
آپ تو اوڑھے شال دو شلا، ہمیں ملے نہ کوئی
حیدر بخش جتوئی سے بھیا

حیدر بخش جتوئی

جب باب انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن رہے میں، اُن کا کہنا ہے کہ اس انجمن سے
دوستی کی بدولت اُن کے خیالات کو بلامالی سب کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھ لیا۔ سب کا دکھ
اپنا دکھ ہو گیا۔ اسی طرح زندگی گزارتے چلے گئے۔ ذاتی مفاد کو کہیں سامنے نہ رکھا۔ کئی سالہ
حکمرانوں نے انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن نہ جھکنا سہاتے تھے اور نہ جھکے،
تم سے پہلے وہ جو ایک شخص یہاں تخت نشین تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقین تھا

انہوں نے دینی کو ہمیشہ دن اور رات کو سدا رات کہا۔ شاہروں کے قصیدے کہنے کی
بجائے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات
کے تحفظ کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی مدد سرائی میں مصروف رہے۔

کھیت و دیروں سے لے لو
مقین نظیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو

رہے نہ کوئی عالیجہاد
پاکستان کا مطلب کیا
لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ !

سیب جالب نے ہر میدان میں ادب کی خدمت کی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے سیاسی
مسلوں کو بھی نرمی اور محبت کے گہواروں میں ڈھال دیا۔

اور بات کہتے نقادوں کی بات پر بھاری ہے کہ الوب خان میسے مکران نے اپنے
 دورِ قدرت سے ہاتھ دھونے کے بعد ایک بار اپنے ایک معن سے کہا تھا کہ ،
 ” مجھے حبیب جالب سے ملاؤ ! — میں اُس شخص سے
 وہ نظمیں سنا چاہتا ہوں جو اُس نے میرے خلاف ، میری حکومت
 کے خلاف کہی تھیں ! “



عبادت بریلوی نظرِ بے کاشاعر

کوئی جیس بچپن سال اوھر کی بات ہے لاہور کی ادبی محفلوں میں ایک نوجوان باقاعدگی سے شریک ہوتا مشاعروں میں لہک لہک کر اپنا کلام پڑھتا اور سننے والوں کو اپنے کلام اور اپنے لہجے سے مسحور کر دیتا تھا۔ اس کی باتوں میں تو مسحور کر دینے والی کیفیت نہیں تھی، جوش و جذبہ سے بات کرتا لیکن اس کی باتیں پوری طرح واضح نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا کہ اس کی باتیں دل سے نکلی ہوئی ہیں اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس میں صداقت ضرور ہے۔ یہ نوجوان حبیب جالب تھا۔

میانہ قد گول چہرہ، بھرا بھرا جسم، سر پر لمبے لمبے بال، گندی رنگ، آواز میں گرج، مزاج میں باقاعدگی لیکن رمندی اور درویشی کے رنگ کے ساتھ ہم آہنگ۔ وہ عام طور پر کرتے پاجامے اور شيردانی میں ملبوس نظر آتا۔ کبھی کبھی منفری لباس بھی زیب تن کرتا۔ لیکن ہر لباس میں اس کے ایک ایک انداز سے وجاہت چلتی۔ کیا خوب نوجوان تھا۔

اس زمانے میں ہم لوگ شام کا تھوڑا سا وقت کسی نہ کسی اوسط درجے کے رستوران میں گزارتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے تو ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی موڈ ہوتا تو ہمارے پاس بھی آجاتا۔ مجھے وہ اچھا لگتا تھا، اس کی باتیں بھی مزہ دیتی تھیں، اس کے شعر بھی متاثر کرتے تھے۔ اس لئے جب بھی وہ ہماری محفل میں شریک ہوتا میرے لئے خاصی دلچسپی کا سامان فراہم ہو جاتا۔

کبھی کبھی وہ لاہور سے غائب بھی ہو جاتا اور بہنوں اور مہینوں نظر نہ آتا۔ واپس آتا تو بڑے ہی خلوص اور محبت سے ملتا۔ گلے سے ملتا، معافتہ کرتا، مزاج پوچھتا، سفر کی تفصیل سناتا، ہمارے حالات معلوم کرتا اور مجھے اس کے اس انداز میں خلوص اور محبت کے سمندر موج زن نظر آتے۔

اسی زمانے میں ایک دن ایسا ہوا کہ حبیب جالب میرے پاس اور نیشنل کالج میں آیا اور

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگا "مجھے آپ اور نیکل کالج میں داخل لیجئے" میں اس کی بات سن کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ حیران تو اس لئے کہ حبیب جالب کو یہ کیا سوچھی 'اور پریشان اس لئے کہ دوست اگر شاکر دین جائے تو استاد کی حیثیت کچھ ڈالو ڈالو سی ہو جاتی ہے اور کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس لئے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے حبیب جالب کو ٹالنے کی کوشش کی اور اسے یہ سمجھایا کہ اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ طالب علم ہو جانے سے اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا لیکن حبیب جالب نے میری ایک نہ سنی اور داخل ہونے پر اصرار کرتا رہا۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ داخلے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے اور میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تو میں نے ہر ڈال دی۔ اور اس طرح وہ اور نیکل کالج میں داخل ہو گیا۔

میں نے اس کو اور نیکل کالج میں اس لئے داخل کیا کہ ایک تو اس زمانے میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اس طرح وہ اردو ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر سکے گا میں نے سوچا ڈگری تو اس کے لئے بے معنی چڑھ چڑھ اند ڈگریوں کو لے کر کیا کرے گا۔ ہاں ہمارے کالج میں ذرا شعر و ادب کی فضا پیدا ہوگی 'اور لڑکوں لڑکیوں پر اس کا اچھا اثر ہوگا۔

اس لئے میں نے حبیب جالب کو اپنا شاگرد بنا لیا۔

لیکن میں نے اس کے بعد 'اس میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ جذبہ اور شائستگی وہ اس سے قبل بھی ایسا تھا کہ اس کی مثال دینی چاہئے۔ لیکن اب یہ ہوا کہ احرام کا احساس اس کے ہاں بہت بڑھ گیا 'اور وہ عام طالب علموں سے بھی کہیں زیادہ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرنے لگا مجھے اس کے اس انداز سے شروع شروع میں کچھ الجھن بھی ہوئی لیکن میں نے اس کے اس رویے سے مطابقت پیدا کر لی کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں جو فطری نیکی اور شرافت ہے 'اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اور نیکل کالج میں حبیب جالب کے آنے سے ادبی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ شعر و

شاعری کا ماحول پیدا ہو گیا اور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر شاعرے باقاعدگی سے ہونے لگے۔ اور میں اس فضا اور ماحول سے بہت خوش تھا۔

یہ زمانہ حبیب جالب کی شاعری کے لئے بھی بہت عمدہ اور بار آور ثابت ہوا۔ اس زمانے میں اس نے جو غزلیں تخلیق کیں ان میں ایک نیا احساس تھا۔ زندگی کو جاننے اور

حالات کو پہچاننے کا ایک نیا شعور تھا۔ زمانے کی مزاج دانی اور ماحول کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی خواہش اس میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی اور اس صورت حال نے حبیب جالب کو صداقت کا ترجمان، ظلم کا عکاس اور حقائق کا نباض بنا دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خصوصیات حبیب جالب کے کلام میں اس سے قبل موجود نہیں تھیں۔ ایسا نہیں ہے لیکن اب اس کے شعور پر خاصی نظر پڑتی اور تفسیر کی پتلی کا احساس اس کے یہاں زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جس کلاسیک رنگ پر اس کی شاعری کی بنیاد استوار تھی، وہ اس کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اور یہ سب اس کی کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی دلکش اور دلنشین شاعری میں آج بھی نمایاں ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔

حبیب جالب، نظریے کا شاعر ہے۔ اس لئے کہ وہ نظریے کا انسان ہے۔ زندگی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں۔ وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانصافی، حبش پندی، اخلاقی پستی، سماجی ناہمواری کا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر لے رہا ہے۔ لیکن جہاں ان قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے، حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اپنے فکر و فن کے نشروں سے اس کو اوجڑ دیتا ہے۔

اس وطن عزیز میں جو کچھ ہوا ہے، آواز مختلف لوگوں نے اس پر مختلف طریقوں سے جو ستم ڈھائے ہیں، اس کی تاریخ مرتب کی جائے تو اس میں حبیب جالب کے اس جہاد کا ذکر ضرور حروف میں لکھا جائے گا، جو اس نے جبر و استبداد کے خلاف کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ ایک اہم شاعر ہی نہیں ایک اہم انسان بھی ہے، کیونکہ اس نے خیر کی قدروں کے لئے قید و بند کی صعوبتیں تک اٹھائی ہیں اور اپنا تن من و دھن سب کچھ لٹا دیا ہے۔

میں جب بھی اس سے ملتا ہوں تو وہ مجھے برہنہ کی طرح نرم نظر آتا ہے لیکن میری نظریں اس کی شخصیت میں باطل کے لئے ایک شمشیر برہنہ کو بھی پنہاں دیکھتی ہیں۔ اور یہی اس کی شخصیت اور شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔



عبدالقادر حسن یہ جرم ہے مرا کہ مجھے ہو گئی خبر

یہ مصرع اس غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ہے جو حبیب جالب نے میرے ایک کالم خواہمیں یونیورسٹی کے لئے گورنر ہاؤس "پر کسی ہے۔ جالب اور میں نظریاتی مخالف ہیں۔ وہ غریبوں، مظلوموں اور مقصوروں کا علاج آنجمنائی کیونزم سے کرنا چاہتا ہے میں اس کا مداوا اسلام میں تلاش کرتا ہوں، بس یہی ہمارا اختلاف ہے۔ لیکن ہماری خواہش ایک ہے ہماری منزل ایک ہے ہمارا مقصد ایک ہے البتہ اس تک پہنچنے اور اس کے حصول کے طریقے مختلف ہیں۔ جالب اور میرا یہی ایک اشتراک ایسا ہے کہ جب بھی اس پر کوئی مصیبت آتی ہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے تو وہ مجھے بھی یاد کر لیتا ہے۔ جب وہ حیدر آباد میں پینل عوامی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ بمبو صاحب کی جیل میں رہا تھا تو اس پورے ملک میں صرف ایک میں تھا جو جیل سے آنے والے اس کے خطوط اور اس کے شعر اپنے ہمت روزے میں باقاعدگی کے ساتھ چھاپا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم بمبو صاحب کی جسوریت نے

ع لاؤ کالے چلو ورنہ تھانے چلو

کئے والے جالب کا نام لیتا ممنوع قرار دے رکھا تھا۔

جالب کے بارے میں کچھ مزید عرض کرنے سے پہلے اس کی تازہ غزل ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے کالم کی اشاعت کے دوسرے روز مجھے فون کیا اور کہا کہ چند شعر ہو گئے ہیں وصول کرو۔ میں نے عرض کیا: بسم اللہ! عطا فرمائیے۔ اور جو اشعار موصول ہوئے وہ پیش خدمت ہیں۔ اگر ممکن ہو تبہ کو کالم ذہن میں رکھیے تاکہ ان اشعار کے شان نزول کے وہاں میں

رہنے سے ان سے صحیح خلف اور کیف اٹھایا جائے۔

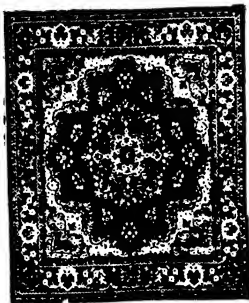
خوں سے مرے بنے ہیں وسیع و عریض کمر
یہ جزم ہے مرا کہ مجھے ہوگئی خبر
یہ آنکھی ہوئی تو حسیں مفلسی گئی
ڈھلتے ہیں نس طرح سے زمانے میں اہل زر
ہر دور میں رہے ہیں مسلط سفید خوں
ہر دور میں رہے ہیں حسی دست ! چشم تر
جو چیز مل سکے نہ ، عبث اس کی آرزو
جو بچ رہا ہے جان ! اسی کا بچاؤ کر
اے ہوم عظیم ! وہ خرچ اپنا کیوں تھماؤں
شاہان وقت پر کہاں مہنگی کا اثر

زندگی میں ایسے کئی مواقع آئے کہ میں نے جالب سے اپنے پیار کا اظہار کیا لیکن
افسوس کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ ادیب کہ اس سے اپنے پیار اور محبت کا اس کی طرح
حسین اظہار کر سکتا۔ بس جو کر سکا وہ بھی کہ جب اس کی آواز عجیبوس ہوتی ہے تو جہاں
کسین ہوتا ہوں اس کی آواز کو پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ جیل میں
ہوں یا جیل سے باہر ، سرکار کا مستحب ہو یا مقبول جیسا اور جہاں بھی ہو میرے لئے وہ
صرف جالب ہی رہتا ہے جس کے نظریات سے سو فیصد اختلاف اور جس کے جذبات سے
میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ میں نے جالب سے کئی بار کہا اور سمجھایا کہ کیونٹنوں کے
پکر سے آزاد ہو جائیں وہ نہ ماتا۔ کیونٹن کے انتقال کے بعد میں نے اس سے کہا کہ اب
تو گورباچوف نے بھی کیونٹن چھوڑ دیا ہے تو بھی باز آجا لیکن وہ چپ رہا۔ وہ کتنا تو غالباً یہ
چاہتا تھا کہ

آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

لیکن کیونٹن کی شکست کا صدمہ اس قدر شدید ہے کہ ہمارے دوستوں کے دماغ شل
ہو گئے ہیں تاہم جالب جیسے نیک نیت اور مظلوموں کے حقیقی دوست کے بارے میں مجھے
یقین ہے کہ وہ اس دھوکے سے نکل آئے گا۔ جالب ہمارے کیونٹن دوستوں کی طرح اپر
نہیں وہ محنت کش اور ایک مظلوم انسان ہے لیکن وہ اپنی غربت کے باوجود ایک سیرچشم

انسان ہے۔ اے اپنے فن کی وجہ سے امارت حاصل کرنے کے جتنے سوچنے لے شاید ہی کسی دوسرے کو ملے ہوں۔ اس کی اصل عظمت یہی ہے کہ اس نے وقت کے سکندر سے اگر کبھی کچھ کہا تو صرف یہ کہ "آگے سے ہٹ جاؤ دھوپ چھوڑ دو" کاش ہم بھی سردی میں غصہ نہ ہوئے کبھی اپنے اور دھوپ کے درمیان حائل کھوڑے پر سوار کسی سکندر سے کہہ سکتے کہ ہٹ جاؤ دھوپ چھوڑ دو! یا اس درویش کی طرح کہ جس کا شہو سن کر بادشاہ نے اسے دربار میں بلایا اور درویش سے نصیحت حاصل کرنے کے بعد اس سے کہا کہ میرے لئے کوئی حکم؟ درویش نے جواب دیا ہاں! ایک حکم ہے۔ بادشاہ خوش ہوا اور عرض کیا کہ فرمائیے۔ درویش نے کہا "ہمیں بھول جائیے پھر کبھی یاد نہ کیجئے" مگر ہماری ایسی قسمت اور نصیب کہاں مگر وقت کے بادشاہوں کا مظلوم و مقہور جالب ایسی قسمت اور ایسا نصیب رکھتا ہے۔



عبداللہ ملک گریبان چاک جالب

نہ جانے کیوں زمانہ فہم رہا ہے میری حالت پر
جنوں میں جیسا ہوتا چاہئے ویسا گریبان ہے
سراج لکھنؤی

جالب اس مئے گزرے زمانے میں عشق اور جنوں کا منظر ہے کیونکہ شاعری تو بہت سے
کرتے ہیں اور شعر ادب کی وادی میں پچاس سے بھی زیادہ برس گزار دیتے ہیں لیکن نہ ان
کا دامن تار تار ہوتا ہے نہ ان کے پاؤں لولہاں ہوتے ہیں اور تو اور ان کا تو گریبان بھی
چاک نہیں ہوتا۔ اس لئے جب گریبان چاک جالب کے لئے عقیدت کا نذرانہ لے کر
بڑی 'بوڑھی' جوان رعنا اور مدہ دشمن سبھی قطار اندر قطار آتے ہیں تو یہ حسی دامن جالب
سے ہی صرف اظہار عقیدت و محبت نہیں بلکہ یہ عقیدت و محبت جالب کے آدرشوں کے
لئے ہے۔ اپنے شعروں میں ان آدرشوں کو سمونے کے لئے عقیدت کا اظہار ہے یہ
عقیدت کا اظہار ہے اپنے آدرشوں کے لئے کچھ کر گزرنے کا۔ یہ عقیدت ہر ان جنوں
فیزیوں کے لئے نہیں جن سے ہماری دامن حسی ہیں اور جالب نے ان جنوں فیزیوں سے
اپنی جمولیاں بھری ہوئی ہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدی کے واسطے دارورسن کما

آج سے تیس چالیس برس پہلے جب اس برصغیر کے ادب میں ترقی پسند تحریک نے جنم
لیا تو سالہا سال تک ترقی پسند ادب معتبہ نہ رہا۔ یہ ادب اور شاعر صرف

سرکار دربار میں ہی معتب نہیں ٹھہرے ۔ بلکہ ادیبوں اور عالموں کے وسیع حلقوں میں بھی راندہ درگاہ تھے ۔ کیونکہ بقول ان عالموں کے یہ ادیب نہیں بلکہ ایجی نر AGITATOR تھے لیکن آج کیفیت ہی بدلی ہوئی ہے 'کل جو باتیں ادب کی حدود سے باہر تصور ہوتی تھیں آج انہیں باتوں کے سننے کے لئے کان ترستے ہیں 'اور ان باتوں کو کہنے والے ہمارے محبوب ٹھہرتے ہیں ۔ اور جالب تو وہ شاعر ہے جو ایجی نر AGITATOR ہے اور وہ سر بلند کر کے نگوں لگاتا ہے اور شعر کہتا ہے ۔

میں تو مایوس نہیں اہل وطن سے یارو
کوئی ڈرتا نہیں اب دارورسن سے یارو

پچھلی ربہ صدی میں اس جہاں رنگ و بو میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ہماری علم و دانش اور فکر و نظر میں نمایاں تبدیلی اور انقلاب برپا کر دیا ہے ۔ ہمارے ہاں الجزائر کے حسرت پندوں اور دست نام کے خیالوں کی جدوجہد کے دور میں یہ سوال بار بار اٹھایا گیا تھا کہ ادب میں COMMITMENT ہونی چاہئے یا نہیں ؟ یہ دراصل وہی جادو تھا جو تھیں چالیس برس پہلے ترقی پسندوں نے چگایا تھا اور اب وہ سرچرہ کر بول رہا تھا ۔ گستاخی مخالف حلقہ ادیبان ذوق کو ہی لے لیجئے ایک زمانہ تھا کہ حلقہ ادیبان ذوق کے رہنما سیاست اور اس کے متعلق گفتگو تک کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے اور ان کی محفل کے تمام دروازے سیاست پر لکھنے والوں اور شعرو افسانہ میں انقلاب اور غرٹلزم کی بات کرنے والوں کے لئے بند ہوئے تھے 'برسوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام لیواؤں اور حلقہ ادیبان ذوق کے ناخداؤں کے درمیان یہ مسئلہ نزاعی سے لے کر جنگ و جدل کا سبب بنا رہا 'لیکن آج وہی حلقہ ادیبان ذوق "کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا ہے کل جو الفاظ جو ٹھہرے "ادب کی دنیا کے لئے ممنوع ٹھہرے " تھے وہی آج مقبول اور محبوب ہیں اور اس کا ثبوت خود یہ بھوم داستان اور عشاق کی فوج غفر موج ہے جو آج جالب کو پاکستان کے شہروں اور قصبوں اور دیہات میں پھول پھماور کر رہے ہیں 'یہ دراصل خراج ہے جنوں کے حضور میں اور COMMITMENT کے لئے یہ خراج ہر قبیلے کو 'یہ خراج ہر انقلاب کو 'یہ خراج ہے سوشلزم اور جموریت کو ۔ یہ بحث اب لاعا صل ہے کہ یہ ادب اور شعر کے موضوع ہیں یا نہیں ۔ جب لاکھوں کا مجمع جالب کو سنتا ہے اس کے ایک ایک شاعر پر سروختا ہے تو یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں ۔

ایک اور سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جالب اور اس کے قبیل کی شاعری واقعی ہے 'فانی' ہے 'ختم ہو جانے والی ہے۔ لیکن کوڑا ان سوال کرنے والوں سے پوچھے کہ عظم جب تک رہے گا اس وقت تک یہ شاعری بھی زندہ رہے گی اور انسانوں کے لبہ کو کربانی رہے گی اسی لئے تو جالب نے کہا تھا

یہ عمدہ حتم ، سلسلہ وار کہاں تک
رستے میں اندھیرے کا یہ دیوار کہاں تک
اے صبح میرے دہس میں تو آکے رہے گی
دوکیں گے تجھے شب کے طرف دار کہاں تک

اور جب امریکی سامراج قوموں کو لوٹا ہے، ان کی آزادی کی تحریکوں کو پکیتا ہے اور افریقہ کے بچے صحراؤں اور دلت نام کے جنگلوں میں مقصور و مجبور عوام اپنے آقاؤں کے خلاف جن کی پشت پناہی امریکی سامراج کرتا ہے مصروف پیکار ہوتے ہیں تو ان عوام کے حق میں آواز کہاں تک دیتی ہے۔ کیا امریکہ کی ریٹرو دنیاں ایک حقیقت نہیں اور جالب اس حقیقت کو بیان کرتا ہے تو وہ ایک زندہ حقیقت کو بیان نہیں کرتا۔

چھڑت اور ملا دو فوں دشمن ہیں آزادی کے
آج ہے ڈیرا دیو و حرم کے سائے تلے امریکہ کا

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جالب نے ہماری شاعری کو ایک نیا اسلوب بخشا ہے اور عوام کے ذوق شعری کی تسکین بھائی ہے، ان کی تپش کی ہے، ان کی مایوس اور غمزدہ زندگی میں امیدوں کے نہپ جلائے ہیں۔ جالب نے اپنی شاعری کے بارے میں خود "میری غزل کی ہے" میں کہا تھا۔

انسانیت کے قتل پہ جو ہوتا نہیں
کہا پڑے گا وہ بھی ہے قاتل کا ہم زبان
بزدل ہیں، کم نظر ہیں، سپاہی نہیں ہیں وہ
شہروں میں جو چلائیں شہنشاہوں پہ گولیاں



فارغ بخاری ایک سچا عوامی شاعر حبیب جالب

عوامی ادب ہوام کی دھڑکنوں کی زبان بولتا ہے۔ اپنے دور کے تعاضوں اور عصری صداقتوں کا دکھاس ہوتا ہے جو اہل علم و ادبیت کے خول میں مقید ہو کر ادب تخلیق کرنے کے قائل ہیں وہ ادبی رہبانیت کا شکار ہیں جو انہیں تریا کئی قدیم بنانے کے سوا کوئی نامہ نہیں پہنچا سکتی۔ ادب تو روشنی کا مینار ہے جو ہر عہد میں ظلمات کا بید چر کر بھولے بھٹکوں کی نہنہائی کر لے۔ یہ ایسا بارخ ہے جس کی فوشبو سے ساری دھرتی فیض یاب ہوتی ہے، ایسی حقیقت ہے جسے جھوٹ کی تمام بلبی قومیں مل کر بھی نہیں مٹا سکتیں۔ وہ انڈا وادی سچائی ہے جس کا پرچم ہمیشہ اسی آں بان سے لہرا رہا ہے۔

حبیب جالب انہی انڈی وادی سچائیوں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی بنیاد انسان دوستی پر استوار ہوتی ہے۔ اس میں بانچھن ہے، توانائی ہے، محبت اور امن کا پیغام ہے
امن کا پرچم لے کر اٹھو، ہر انسان سے پیار کرو
پنا تو مشورہ ہے جالب سانسے تہاں سے پیار کرو

وہ سوشلزم کا علمبردار ایک ایسا ترقی پسند شاعر ہے جس کے قول و فعل میں مکمل آہنگی ہے وہ نہ صرف انقلابی نئے گھمست بگو ملی طور پر خود ہی انقلابی تحریک کا ایک ڈر اور میاک سپاہی ہے اور اپنی حق گوئی کے سبب ہمیشہ جہت پسند حکمرانوں کے قاتل کا شکار ہو کر تیر و بند کے عتاب

بھیلتا رہا ہے۔ اس کی نقلیں " ایسے آئین کوئی نہیں مانتا " اور " صدر امریکہ نے جا " اس کی جڑات مزی کا گھٹلا شہرت ہیں۔ یہ نظمیں جب وہ بیگ مجلسوں میں اپنے مخصوص ترنم میں لہک کر پڑھتا، اس وقت عوام کا جوش و خروش دیکھنا دیدنی ہوتا تھا۔ یہ مبالغہ صدر ایوب خان کا دُور تھا۔ اسے لہذا ت کے جرم میں گرفتار کر کے طویل عرصہ کے لئے کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا اور اس کے مجبوراً کلام " سرسقتل " پر پابندی لگا دی گئی۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کے بعد حبیب جالب دوسرا عوامی شاعر ہے، وہ عوام کی بات کرتا ہے، عوام کی زبان میں بات کرتا ہے، عوام کے مسائل پر بات کرتا ہے، اسی لئے عوام اسے اپنا شاعر سمجھتے ہیں اس سے بہار کرتے ہیں اس کے گرویدہ ہیں، اسے سن کر سر دھنتے ہیں۔ اس کے نئے زبانِ نذرِ عوام ہیں اور وہ انہیں عظمتِ ملت میں لوگ گیتوں کی طرح گنگاتے ہیں۔

حبیب جالب نے اپنے عوامی رویے سے عوام سے تو اپنے آپ کو ایک عوامی شاعر کے طور پر منوا لیا لیکن ادنیٰ اجازت دار اسے تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے نظیر اکبر آبادی کو بھی سستا اور تنگ بند شاعر کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ لیکن اس کے انتقال سے ایک صدی بعد انہیں نظیر کی عظمت کا احساس ہوا اور اسے ایک مجتہد العصر شاعر ماننا پڑا۔ نظیر کی طرح جالب بھی اپنے دور سے پہلے پیدا ہونے کا گنہگار ہے۔ اس نے اس کا مقام بھی شاید اکی صدی ہی میں متعین ہو سکے گا۔

نظریاتی بنیاد مستحکم ہو، فن کے ساتھ خلوص ہو تو کوئی طاقت بھی نڈکار کو اس کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ سچائی کا سفر محض ہے، مصلحت اندیش اور طاقت پسند ذہن جو خطرات مولیٰ لینے کی ہمت نہیں ہاتے ہمیشہ دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جس میں قدم و منزلت ہے، منفعت ہے، کامرانی ہے۔ دار و درن کی آرزائش اور فقر و فاقہ کی صعوبتوں کے سفر میں انہی سر بھروں کے قدم آٹھتے ہیں جن کے پیشِ نظر عوام کی فلاح و بہبود کا عظیم مقصد ہوتا ہے جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تقییب ہوتے ہیں جو روشن مستقبل کے داعی ہوتے ہیں۔ حبیب جالب اسی سرکش قبیلے کا فرد ہے جن نے جابرِ مکاروں کے سامنے انہماق سے کھجی کو تابی نہیں کی، جس نے زخموں سے پُور ہونے کو بھی سیرۂ پان

راور نہرا خاکِ رمل و خفاف کا پرچم بلند رکھنے میں اپنا سب کچھ ہاڑ پر لگا دیا۔
 جینے کی آرزو ہے تو مرنا پڑے گا آبِ انگوں سے اپنے زخم کوئی کب تک بچے
 ہوگا طلوعِ کوہ کے پیچھے سے آفتابِ شبِ مستعل ہے گی، کبھی یہ نہ سوچئے
 دونوں کی تفریق، طبقاتی تفریق اور محنت و سرمایہ کی تفریق کے خلاف ہمیشہ یکجا رہیں
 آواز بلند کرنا رہا اور عوام دشمن سامراجی قوتوں کے خلاف زندگی بھر پوری جدوجہد سے نبرد آزما رہا۔
 پھر توڑیں گے ہم زنجیریں، ہر لب کو آزاد کوئیں گے
 جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہر وفا آباد کریں گے
 آخر کب تک چند گھرانے لوگوں پر بیدا کریں گے
 ”گھیر آؤ۔“

تم سے پہلے بھی وہ جو ایک شخص بیانِ نضرت نہیں تھا
 اُس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقین تھا

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
 ہمیں لینے میں جب چاہتے ہیں خوشی
 اونچے اونچے گھروں میں ہے جو روشنی
 جل ہے میں ہمارے ہو کے دیئے
 کیوں کہیں یہ ستم آسمان نے کئے ”گیت“

جانب کی بعض نکلیں تو اتنی سادہ، عام انہما اور غایت سے بھر پور ہیں کہ کوئی غریب بھی مٹی میں
 روٹی، کپڑا اور دوا گھر رہنے کو چھڑا سا
 مفت ہمیں تعلیم دلا میں بھی سماں ہوں والد

لا الہ الا اللہ

امریکہ سے ہانگ نہ جیک مت کر لوگوں کی تشکیک
روک نہ جمہوری تحریک چھوڑ نہ آزادی کی راہ

لا الہ الا اللہ

(پاکستان کا مطلب کیا)

خطرہ ہے زرداروں کو گرفتاری ہونی دلیاروں کو
صدیوں کے بیماروں کو خطرے میں اسلام نہیں

(خطرے میں اسلام نہیں)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ استعمال گزیدہ محام کو بیدار کرنے، انہیں توجہات، جہالت، بے حسی کے دلدل سے نکالنے اور ملک میں دوستی اور سماجی انقلاب لانے کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے وہ شاعروں اور ادیبوں کے سوا کسی کے پاس نہیں اور ان میں بھی وہ جو حبیب جالب کی طرح انقلابی شعور رکھتا ہے، جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہے۔

یہ جوان فکر نہیں خون نہ پینے دیگی خامبو اب نہ تمہیں چین ہے جینے دیگی
تاکو رامے ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں اپنے ہاتھوں میں لئے سرخ علم آتے ہیں
توڑ دے گی یہ جوان فکر حصار زنداں
جاگ اٹھے ہیں مرے، کے بکس انسان

(جوان آگ)

جالب بلاشبہ مستقبل کا شاعر ہے اور یہ اعزاز اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔



فردوس حیدر مخالف ہواؤں کا شاعر

یوں لگتا ہے میں ایسا مسافر ہوں جو عرصہ دراز تک اس لئے سڑکرتا ہے کہ دو دریا ملیں گے لیکن اس مقام پر جہاں دو دریا ملتے ہیں ایسی بھول ہو جاتی ہے کہ اختیار کی پھٹی ہاتھ سے ٹھٹھ جاتی ہے میں نے بیشہ چاہا کہ دونوں ہتھوں اور مینوں ابائی کے پاس رہوں۔ ان سے ڈھیروں باتیں کروں۔ ان کے دوستوں کی باتیں سنوں۔ ان سے اپنی تحریروں کے حوالے سے گفتگو کروں لیکن میرے کام اچھے ہوئے تھے کبھی اتنی فرصت نہ ملی۔ وہ میرا انتظار نہ کر سکے۔ اور ایک دن بنا مجھ سے ملے بنا کچھ کے چھوڑ کے چلے گئے۔

حبیب جالب ابا جان کے ان دوستوں میں سے ہیں کہ جب وہ بیشک میں آتے مجھے خود بخود علم ہو جاتا اور میں چلنے پر چائے کا پانی رکھ دیتی۔ اسی کو شاعروں سے چڑھتی۔ وہ سمجھتی تھیں یہ لوگ گھر کی ذرہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ابا جان حبیب جالب کے بارے میں کچھ نہ کہنے دیتے۔ بیشہ کہتے ”وہ دلوں میں بستا ہے بلا خوف ہر بات اعلانیہ کہتا ہے“

ہمارے گھر دوستو سکی، ٹائٹائی، کارل مارکس، لیفٹن اور اسی قسم کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ ایک دن وہ پشکن کے بارے میں پڑھنے کے بعد کہنے لگے ”حبیب جالب پاکستان کا پشکن ہے“ شہنشاہیت کے خلاف جہاد، جبر و ظلم کے خلاف نعرہ، زار کا دور تو کسی نہ کسی شکل میں رہتا ہے۔ شہنشاہ کے شہنشاہ زن بھی کسی نہ کسی مجلس میں ہماری عورتوں کو ہتھیانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہانہ یا حوالہ کیا بھی ہو ایسے لوگ سوئے دار چلنے ہیں اور بیشہ زندہ رہتے ہیں۔“

پھر یوں ہوا کہ میں پاکستان سے باہر چلی گئی۔ مجھے ”سیر مقل“ کے شاعر کی خبریں ملتی رہیں۔ جمہوری اقدار کا علمبردار ظلم کے خلاف عوام کے ساتھ ڈٹا رہا۔ ڈائریکٹ پوسٹری وقت کی اہم ضرورت رہی ہے۔ یہ جہاں عوام کی آواز بنتی ہے انہیں MOTIVATE بھی کرتی ہے۔ جالب کی شاعری بہتر نظام کی خواہش کا اظہار ہے۔ بھوک و افلاس کے خلاف

بدیانتی، بد عمدی اور ظلم و جبر کے خلاف جہاد ہے۔ یہ شاعری بناوٹ پر نہیں اُکساتی بلکہ اپنا حق مانگنا سکھاتی ہے۔ اسی لئے جی شاعری ہے اور سچ بولنے والا حاکم وقت کی بھول چوک کیسے معاف کر سکتا ہے۔

مثلاً ۳۳ یا ۳۴ء کا زمانہ ہوگا میں چند دنوں کے لئے پاکستان آئی۔ ایک دوست کے ہاں اچانک جالب صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اب میں ای کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی۔ اسلئے جالب صاحب سے باتیں کر سکتی تھی۔

”میں خواجہ محمد منظور ایجوکیٹ کی بیٹی ہوں۔“ میں نے کہا

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”وہ گوجرانوالہ جسے دیوان سنگھ مفتون نے شیراز ہند کہا ہے۔“ میں نے دوسرا اشارہ کیا

”تم خواجہ صاحب کی بیٹی ہو“ وہ اٹھ کے کھڑے ہو گئے اور گھاس میز کے نیچے رکھ دیا۔

”میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ اس لئے تمہارے سامنے بھی نہیں بیٹوں گا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسا پیار تو خوش نصیبوں کو ملتا ہے۔ میرے والد کے پاس واقعی محبت کا یہ خزانہ تھا۔ میں جب گوجرانوالہ گئی اور انہیں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے کہنے لگے ”اپنی ماں کو تازہ جالب کی بیوی کتنی جی دار ہے ہر دور میں ثابت قدم رہی ہے اور اس نے؟ اس نے تو میری شاعری کو جلا دی۔“

میں نے ابا جان کے چہرے پر مایوسی و پشیمانی کی لہر دیکھی لیکن وہ فوراً جالب صاحب کی باتوں سے بھل گئے۔ نہ جانے کیسے انہیں جالب صاحب کے اندر اپنی غنیمت نظر آتی۔

”نظیر اکبر آبادی کو ادب کے برہمن شاعر نہیں مانتے تھے لیکن بعد میں انہیں راستے بدلتی پڑی۔ جالب میں نظیر اکبر آبادی کا مقامی رنگ، آسان زبان، دلنشیں انداز اور اثر انگیزی ہے نا؟

وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھے دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے بنائی دیتے۔

چند دن قبل بشیر مرزا کے ہاں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ برسوں بعد مجھے بہت کچھ یاد آیا

جالب صاحب میں دی ہوں جو آپ کو چائے بنا کر بیٹھک میں بھیجتی تھی۔

”میرے بہت سی عزیز بزرگ دوست کی بیٹی“ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے گلے لگا لیا

ابا جان تو اب نہیں رہے۔ ان کی خوشبو ان کے دوستوں میں موجود ہے۔ میں انہیں دیکھتی

رہی۔ وہ اپنی علالت کے باوجود شعر سناتے رہے۔ میں سنتی رہی اور دل ہی دل میں دمانیں

دیتی رہی۔

اے مخالف ہواؤں کے مسافر، جیتے رہو، حالات کا مقابلہ کرتے رہو، تم سے نوجوان نسل

کو حوصلہ ملتا ہے اور ملتا رہے گا۔



محسن احسان دل دریدہ، سرکشیدہ

حبیب جالب شعرا کی اس روایت سے تعلق رکھتا ہے جس میں محمد علی جوہر، حسرت موہانی، نغز علی خان، شورش کاشمیری اور کچھ دوسرے نام نمایاں ہیں۔ یہ وہ قد آور شخصیتیں ہیں جنہوں نے شاعری کو بلند و بالا بارہ دیوں سے اُتار کر تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے مغلوں، الحال اور فاقہ زدہ انسانوں کے دکھ درد کے بیان کا وسیلہ بنایا۔ اُن کے مسائل کی بات کی۔ اُن کے جذبات و احساسات کی بھرپور آئینہ داری کی اور اُن کے رنج و الم کو زبان بخشی اور یوں ادب کے حوالے سے عوامی خدمات سر انجام دیں۔ اس کٹھن سفر میں حبیب جالب نے بھی اپنے پیشروؤں کی طرح صعوبتیں اٹھائیں اور زندان کی تنگ و تاریک کٹھنوں میں شب و روز بسر کئے لیکن سر کو نہ تو کسی امیر شہر کی دہلیز پر غم جمنے دیا اور نہ ہی حوصلے کو پستی سے ہٹا کر کیا۔ اس نے ہمیشہ ریمانِ وقت اور مفتیانِ شہر سے بے نیاز ہو کر اور با اوقات اُن سے ٹھٹھلے کر ذہن کی روشنی اور دل کی گرمی کو خارجی اقدار سے ایک نئے معاشرے کے روپ میں منتقل کرنے کی سعی کو جاری رکھا۔ اس کا منتہائے نظر نام و نمود کی خواہش سے زیادہ صداقت کی تلاش رہی۔ اس نے جسم و جان کی کڑی سے کڑی آزمائش سے گزر کر بھی ضمیر اور قلم کی عمارت کو نوآبادانِ باطل سیاست کے دستِ ہائے ناپاک سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ وہ دلِ دیدہ جھٹے ہوئے بھی سرکشیدہ رہا کہ یہی اس کے اندر کی آواز تھی جس نے خستہ حال مفادوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو شعر کا لباس عطا کر کے اپنی مالگیر محبت کا پیام بھیلایا اور سیاسی پیٹ فارم سے بحیثیت شاعر عوامی رابطہ قائم کر کے حق گوئی و دیباکی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کی

یہ جزات دے باقی بعض "بغیمہ شاعروں" کی ہیشانیوں پر تیوری کا باعث بن گئی کیونکہ اس نے اپنے تخلیق کردہ حرف سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ عدالت کے سامنے بھی اسی طرح سینہ تان کر کھڑا رہا جس طرح وہ سیاسی جلسوں اور شاعروں میں سینہ تان کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور اپنی دکھش اور سترم آواز میں مضامین ہاتھ لہرا لہرا کر شعر پڑھتا ہے۔ اس کے کلام میں انفرادیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی احساس کا شعور بھی ملتا ہے۔ جو اسے اپنے دیگر ہم عصروں سے ممتاز مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ غزل کے علائم و رموز کے حوالے سے تخلیقی اور فنی اظہار کی ایسی راہیں تراشتا ہے جن پر اس کا نظریاتی کارواں پٹاؤ ڈالنے کی بجائے منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہے۔ اس کے کلام میں لہجہ و راہزن تیرگی و روشنی نفس و آشیائ طوق و سلاسل طائر و میاد زمیں آسمان اندھیرے اور آجائے راستے اور منزلیں اور ایسے کئی دوسرے علائم و رموز نئی سیاسی و اقتصادی معنویت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور روح عصر اور کرب ذات کا ایک توازن امتزاج اس کے فن کو سخن بخشا ہے۔ غالب کی تخلیقی شادابی میں کسی زمانے میں ہی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے جن بنیادی اصولوں پر ابتداء میں صادق کیا وہ آج بھی اس کا جذبہ ایمان ہیں اور ان کا بے باکانہ اظہار اس کی زندگی کا ادیں مقصد۔ میر نے نزدیک غالب کے فن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے تجربے کی روشنی اور جذبے کی حرارت سے کام لے کر روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا گہرا مشاہدہ کیا اور ان کو قبائلی تناظر سے آراستہ کر کے دوام بخشی کے گوشش کی اور یوں وہ سچائی کی جستجو اور اسکے اظہار کے دشوار گزار راستوں سے ہمیشہ سرفراز رہا ہے۔ اسکے ان خارجی محرکات داخلی کیفیات کے ساتھ اس خوش سلیقگی سے ضم ہوتے ہیں کہ فن اور حقیقت کے امتزاج کی ایک دکھش اور شگفتا تحریر آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے۔ اس نے پس منظر انسانی کے دکھ کو اپنے فن میں سمو کر کرب کے شراہد درد کے پھل کے سوا کچھ نہیں پایا۔ اور اس کی اسی دولت نے اسے مرنے سے



محمد حسن حبیب جالب ایک جائزہ

حبیب جالب قلم کا پیمانہ وفا ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حبیب جبر اور مصلحت پرستی کا چلن ہو اُس زمانے میں کوئی شاعر دُور دراز پاکستان کے آمریت زدہ نظام میں ایسا بھی ہے جو اپنی بات بے جھجک کہنے کی ہمت رکھتا ہے اور اُس کی یاداش میں کبھی جیل خانوں میں زندگی گزارتا ہے کبھی پولیس کی لالٹیاں کھاتا ہے کبھی دُر در کھینکتا ہے اور حکومت اور دولت کا عتاب سہتا ہے مگر جس بات کو حق سمجھتا ہے اُسے کہنے سے باز نہیں آتا۔

صغے کے صغے وفا اور محبت، عارض و رخسار کی مہک اور دمک، انسانوں سے پہاڑ کی نرمی، آسمانوں پر بھونکتی شفق اور دے پاؤں گزرتی ہوئی ہوا کے تندرے سے لبریز ہیں، کٹرواہٹ نام کو نہیں کھجلا ہیے در دے مگر وہ بھی ناقابل برداشت نہیں کہ دل کو پارہ پارہ کر ڈالے۔ ہاں ایک طرف کھجلا ہی ہے ایسی جو ڈٹنا نہیں جانتی جھکنا نہیں جانتی اور اُسی کھجلا ہی سے زندگی کا پورا رویت اُبھرتا ہے۔

یہ رو یہ کیا ہے اُس کا اندازہ اُن کی نظم ایک شام سے ہوتا ہے ارمان یہ ہے کہ
کریں بہار کی باتیں صبا کے پہرے میں کسی حسیں سے کہیں نیش کی غزل گائے
دیار دل کو اجالیں عدم کے شعور لیے رُخ حیات بہ رنگ اُئے روشنی اُئے
زمانے بھر کے غموں کو تپے دھوت آزار ہمارے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی

ہمارے ہاتھ میں ہے آفتاب عالم تاب قریب آکے دکھائے شب الم کوئی
 یہ سرتِ لطافت اور کیف و مستی کی تلاش۔ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارنے کی آرزو
 سے عبارت ہے اور اُس راہ میں جو شکلیں اور رکاوٹیں آتی ہیں ان سے ٹکراتا، اُنہیں دور کرنے کی کوشش
 کرتا اور یہ نہ ہو سکے تو ان کے خلاف احتجاج کرتا۔۔۔ یہی حبیبِ غالب کی زندگی بھی ہے اور شاعری
 بھی اور اُس میں کوئی دو غلاہن یا منافقت کہیں نہیں ہے۔

ظہمتِ ہجر اور مصیبت کی خولادی قوتیں ان محبت مند رمانوں کے خلاف صف آرا ہیں اور ان کے
 مقابلے کے لئے ضروری ہے عوام اور مستقبل پر بے پناہ اعتماد اور ایثار و قربانی کی بے اندازہ صلاحیت۔
 یہی دو نون ستون ہیں جن پر حبیبِ غالب کی شاعری کی فلک بوس عمارت تعمیر ہوئی ہے۔
 عوام اور مستقبل پر اعتماد کی آواز جگہ جگہ اُن کی شاعری میں جگمگاتی ملے گی حبیبِ اکبر کے درج

ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

تیرے لئے میں کیا صدے سہتا ہوں	سگنیوں کے راج میں بھی بچہ کہتا ہوں
میری راہ میں مصیبتوں کے پھول بھی ہیں	تیری خاطر کانٹے چنتا رہتا ہوں
تو آئے گا اسی اُس پر مجھ کو رہا ہے دل	دیکھ اے مستقبل
اور اُن کے تازہ ترین مجموعے کا گیت ان اشعار پر ختم ہوتا ہے۔	
کھل جائیں گے در زنداں کے	جاگ اٹھیں گے بھاگ انسان کے
دلیر پر تم پہلے کار کا پرچم	چاروں طرف لہرائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا	
اس اعتماد کے سامنے وقتی ہر دیشائیاں، سختیاں، اور دردِ دالم کے پہاڑ سب گوارا ہیں۔	
رستہ کوئی سو رنج کا کوئی روک سکتا ہے	ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں عمر مند

یا اس قسم کے اشعار۔

آنے لگی ہے یہ صد اور نہیں ہے شہر گل	دنیا ہماری راہ میں کانٹے بچھا چکے بہت
کھٹنے کو بے قفس کا در پائے کو بے سکون نظر	اے دل زار شامِ غم، ہم کو رُلا چکی بہت
اپنی قیادتوں میں اب ڈھونڈیں گے لوگ منزلیں	ریزوں کی رہبری راہ دکھا چکی بہت
ریزوں کی یہ رہبری کیا بھی اور اُس نے کیا راہ دکھائی۔ اس کے بیان سے حبیبِ غالب کی	
شاعری نے گریز نہیں کیا اُن کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے غمیر کی بکری۔ یعنی لاپٹے اور مصیبت	
کی خاطر خاموش رہنا یا اپنے قلم کا سودا کرنا ایسے شعر لکھنا جو تعبد سے میں شمار ہوں اور پڑھنے سننے	

دالوں میں آگئی پیدا کرنے کے بجائے بزدلی اور ظالموں سے کھوئے کی تلک پیدا کریں بقول اُن کے یہ صورت ہو تو ۔

بے ضروری کا اور کیا ہو مآل اب قلم سے انرا بند ہی ڈال
بہی انجام ہوگا اس خلعت پرستی کا دوسرا منظر ہے سماجی نا انصافی اور گھبرائیں نا انصافی کو برقرار رکھنے کے لئے بے پناہ ظلم و ستم، لہذا حبیب جالب اپنا رشتہ اُن منگولوں سے جوڑتے ہیں جو اُس بے انصافی کا شکار ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب و غریب اتفاق ہے کہ جب کوئی غیر منصفانہ نظام قائم ہوتا ہے خواہ وہ جاگیر داری کا ہو یا آمریت کا اُس کی ابتدا عورتوں کے استحصال سے ہوتی ہے عورت کو کھیلونے بنا کر بچا نا آدموں اور مسائنتوں کا پہلا کھیل ہوتا ہے بقول جالب :

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بچوایا
اور اسی لئے عورت کی اگر لوی کا نثرانہ حبیب جالب کے یہاں جا بجا ملے گا۔ (صفحہ ۷۲۸)

جہاں ہیں محبوس اب بھی ہم وہ حرم سرا یں نہیں رہیں گی
لرزتے ہونٹوں پر اب ہمارے فقط دعائیں نہیں رہیں گی
غضب شدہ حق پر چپ نہ رہنا ہمارا منشور ہو گیا ہے
اٹھے غالب شور ہرستم پر دبی صدا یں نہیں رہیں گے (صفحہ ۳۲۲)

محض اتفاق نہیں ہے کہ اہل اقتدار کی ہوس رانی کی شکار عورتوں کو حبیب جالب نے موضوع سخن بنایا ہے، شیلو، ہو یا ممتاز دونوں شاعر کے نزدیک قابل احترام ہیں کیونکہ وہ اُس غیر منصفانہ سماج کے احارہ داروں کی ہوس کا شکار ہوئی ہیں۔

تو کہ نادانق آداب شہنشاہی تھی رقص رنجبیر بہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جسرات جو ہوئی تو کوئی نہک سایہ شاہ میں اس طرح حیا جاتا ہے؟
یادہ ہنگامی سی نظم جو ممتاز کے لئے کہی گئی۔ (صفحہ ۷۳۰)

قصر شاہی سے حکم صادر ہوا لاڑکانے چلو درنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو اٹھانے چلو گیت گانے چلو درنہ تھانے چلو

حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو ذہن پر چھائی ہو
جسم کی تو سے شمعیں جلائے چلو درنہ تھانے چلو (صفحہ ۳۸۳)

کم سے کم اردو شاعری میں عورت کا یہ نیا پیکر ہے جو حبیب جالب کی شاعری میں پہلی بار ابھر

کرساتنے آیا ہے وردن اکثر عورت کے لب و رخسار کو سامان نشاط سمجھ کر ہی شاعری میں اُسے جگہ دی گئی ہے اور یہ بھلا دیا گیا ہے کہ اس سامان نشاط کا ایہ ناکوئی انسانی وجود بھی ہے۔

عورت پر ظلم و ستم ہی نہیں اُس کے علاوہ دوسرے رجعت پسندانہ اقدامات کا جو از بھی غیر منصفانہ سماج اپنے نظام اقدار سے پیدا کرتا ہے اور یہ نظام اقدار اکثر یا تو مذہب کے غلط اور گمراہ کن تصور پر قائم ہوتا ہے جس کی بنیاد عصبیت اور تنگ نظری پر ہوتی ہے (جس کی علامت اردو شاعری میں مولوی یا واعظ کو قرار دیا گیا ہے) یا پھر وطن پرستی کے غلامانہ اور استحصالی تصور پر ہوتی ہے۔ مذہب سے اہل اقتدار وہی مراد لیتے ہیں جو اُن کے استحصالی مقاصد کے کام آسکے۔ اسی لئے اپنے ہر شخص منصفانہ اقدام کی سند میں مذہب اور مذہب کے تنگ نظر کٹھ ملاؤں کو پیش کرتے ہیں اور یہ کوئی پاکستان ہی کی خصوصیت نہیں۔ اس میں رجعت پسندی اور مذہب کا غلط تصور پیش کرنے والے پنڈتوں اور کٹھ ملاؤں کا سمجھوتہ رہا ہے حبیب جالب نے اس کے خلاف کھلم کھلا آواز اٹھائی ہے اتنی کھلم کھلا کہ کبھی کبھی شاعرانہ لہجہ کی نراکتوں کی بھی پردا نہیں کی۔

داؤد جسر بخش دے شاید ہاں مگر مولوی سے ڈرتے ہیں (صفحہ ۱۳۱)

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتویٰ
نہیں ہے دیں فرو شو، ہم یہ یہ کوئی نیا فتویٰ

(صفحہ ۱۸۳)

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
زمینیں ہوں دڈیروں کی مشینیں ہوں بیروں کی
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ نہیں تحریر مولانا (صفحہ ۱۸۵)

اسی ظلم کا ایک پہلو عورت پر مذہب کے نام پر لگائی گئی ”تہاد اور چہار دیواری“ کی قدغن ہے جس کی رو سے عورت کو یا مرد کی ملکیت قرار پاتی ہے۔

رہا وطن پرستی کا تصور چنانچہ استحصالی طبقوں نے وطن دوستی کا معیار حکومتوں سے حمایت و وفاداری کو قرار دے رکھا ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ حکومتیں آئی جاتی ہوتی ہیں اور وطن کی محبت ابدی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جسے وطن سے پیار ہوگا (اور ظاہر ہے کہ وطن سے پیار کا مطلب وطن سے پیار نہیں بلکہ وطن کے لوگوں سے پیار ہے اور اُن کے لئے آرام و سکون فراہم کرنا اور ان کی مدد کرنا ہی اس کا معیار ہے) وہ لازمی طور پر وطن کے لوگوں کو معمولی معمولی سی سہولتوں سے محروم کرنے والوں کے خلاف اسی طرح بے جگری سے اڑے گا۔

اسی لئے ایک طرف حبیب حالہ کے یہاں وطن سے بے پناہ محبت کا جذبہ ابلا پڑتا ہے۔

وطن سے الفت ہے جرم اپنا یہ جرم نازندگی کریں گے
ہے کس کی گردن پر خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کریں گے

میاں دلی میرا لاہور میرا

مجھے لگتے ہیں سب منظر سہانے

(صفحہ ۳۲۹)

ہر ایک شاخ پر برق تپاں ہے رقص کناراں

فنائے صحنِ چمنِ تجھ پہ رحم آتا ہے

قدم قدم پہ یہاں پر ضمیر بکتے ہیں

مرے عظیم وطن تجھ پہ رحم آتا ہے

(صفحہ ۱۷۵)

اور وطن کی اسی محبت سے جاہ پرستوں اور غیر منصفانہ حکومتوں، غاصبوں اور آدمروں کے خلاف وہ نبرد آزما ہے کیونکہ آدمروں اور جاہوروں کے دور میں عوام کو عزت و توقیر نہیں ملتی۔ مختلف تہذیبی منطقوں کو ان کا تشخص اور احترام نہیں ملتا۔ عوام کو ان کا جھوٹی حق نہیں عورتیں، چادر اور چہرہ دلیواری کے نام پر ہر قسم کے مظالم اور نا انصافیوں کا شکار ہوتی ہیں طلباء اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے پر لالچی، گولی کھاتے ہیں۔ لویب شاعر دانش ور اور صحافی آزاد سی تقریر و تحریر سے محروم ہو گئے ہیں اور خوشامد پر مجبور ہیں اور قاصدائیں اور نغمہ گراں باب اختیار کا آواز نثر بن گئے ہیں گویا پورا سماج چند افراد کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا ہے اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرتے ہیں اور لالچی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔

بڑے بنے تھے جاہل ملحد پٹے شرک کے پیچ
کبھی گریباں چاک ہو اور کبھی ہوا دل خون

جسم چھوڑتوں کے نشان ہیں اپنے تمنے ہیں
ملی ہے اسی داد و وفا کی کسے شرک کے پیچ (صفحہ ۳۲۳)

اسی کا ایک نتیجہ ہوتا ہے مختلف لسانی گروہوں اور مختلف تہذیبی علاقوں کے درمیان منافرت، کشیدگی اور آخر کار تصادم۔ لسانی گروہوں کے تصادم کی انتہائی شکل پاکستان کا ٹوٹنا اور بنگلہ دیش کا قیام ہے اور تہذیبی علاقوں کے درمیان منافرت کی شکل پنجاب کی بالادستی کے خلاف سندھ و بلوچستان اور صوبہ سرحد کا احتجاج ہے۔ یہ دونوں تصادمات جمہوریت کے کھینے اور عوام کے حقوق پر غیر منصفانہ اہل اقتدار کی بالادستی اور خود غرضی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان دونوں پر حبیب حالہ نے سخت احتجاج کیا ہے۔

بجگہ دلشہرہ آئن کی کئی نظمیں ہیں ”جگیا بھولہاں“ شاید ان سب سے زیادہ اہم ہے اور جاگ میرے
پنجاب کہ پاکستان چلا“ دوسری قسم کی مسافرت کا واضح اظہار ہے۔

حمصہ کو ذات کا غم ہے کب وہ مانے ہیں
جگہ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا
قافلہ ہیں اسباب کہ پاکستان چلا
انہی چین سے ہم سے جدا بنگال ہوا
رو کو یہ سیلاب کہ پاکستان چلا
ہے بس لوگوں پر بند گھیا تانے ہیں
جاگ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا
لو چہ نہ اس دنگ سے چور کا حال ہوا
جاگ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا (صفحہ ۳۲)

انصافی، جبر اور لوٹ مار پر مبنی اس نظام کی پشت پر صرف کسی ملک کے دولت بھورے والے
اور اس ملک کی فوجی ٹوٹی ہی نہیں ہوتی اس کی پشت پناہی کرتی ہیں عالمی طاقتیں اور خاص طور پر
سامراجی حکومتیں۔ یہ داستان ہرانی ہے گواہ کل ان سامراجی طاقتوں کا اکھوتا علمبردار اور محافظ ہے
امریکا۔ لہذا کچھ تعجب کی بات نہیں کہ امریکہ اور اس کے مختلف سربراہوں کا ذکر جہاں جالب نے
کھل کر کیا ہے اور کہیں کہیں اس طرح کیا ہے کہ شامی صحافت کی سطح پر آتی ہے مگر ان کا احتجاج
بھا ہے اور استعمال کے ان رشتوں کو دیکھنے میں آئن کی نظر دھوکا نہیں کھاتی۔

طواف کوئے ملاحت کو لہر نہ جالے دل
داہنے ساتھ جاری بھی خاک اڑا اے دل
امریکہ یا تر کے خلاف

دنیا بھر کے مظلوموں نے بھید یہ سارا جان لیا
آج ہے ڈیہرا زرداروں کے لیے تلے امریکا
(صفحہ ۱۹)

فرنگی کا جو ہیں دربان ہوتا
تو جیہاں کس قدر آسان ہوتا
میرے بچے بھی امریکا میں پڑھتے
میں ہر گری میں انگلستان ہوتا (صفحہ ۳۱)

غرض استعمالی کی اس کالی دیوار کے ہر سلسلے کو حلیب جالب نے اچھی طرح جانا پہچانا ہے۔ یہ
در اصل وہ دیوار ہے جو انسانی ارتقاء کے راستے میں کھڑی ہے اور عام انسانوں کو روزی روٹی اور
زندگی کی معمولی اور فطری مسرتوں سے محروم کرتی ہے اس کے ایک کنارے ہر ذاتی منافع اور خود غرضی
کا بھوت ہے جو طاقت بستی کا عام انسانوں کو جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے اور
انہیں جہالت، بیماری اور غلشی کے عذابوں میں مبتلا رکھتا ہے تو دوسری طرف انہیں مقتدر نہ ہونے
کے سبب جتن ہیں تاکہ وہ مل جل کر اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہ کر سکیں انہی مقتدر نہ ہیں ایک تذکرہ
ہے مذہب کے نام پر دنیا و نسبت اور تقدیر پرستی، جہالت اور اندھی توہم پرستی کی تردید جو کونو ملائیت
کے ذریعہ فروغ پاتی ہے اور خورتوں کو چادر اور چہار دیواری میں مقید کرتی ہے اور نوجوانوں کے لئے

ظالم حکمرانوں کی اطاعت کا فرمان نافذ کرتی ہے۔ دوسری تدبیر ہے علاقائیت کے نام پر نفرت بھڑکانا تاکہ ایک علاقے کے مظلومین دوسرے علاقے کے مظلومین سے مل جل کر اپنا حق طلب کر سکیں اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیا جاسکے۔ تیسری تدبیر ہے غیر کی خریداری جس کے ذریعہ اہل علم، شاعر، ادیب اور دانشوروں کی خرید و فروخت ہوتی ہے اس کے ذریعہ شعور بے اہلے اقتدار اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں اور ہر طرح کی گمراہی کو قبولیت کی سند بخشتے ہیں اس کے علاوہ وطن پرستی کا حربہ ہے جس کو وہ وطن کی دہائی دے کر حکومت و قوت کی حمایت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جو ان کی مخالفت کرے یا استحصال کے خلاف آواز اٹھائے اُسے وطن کا غدار قرار دیتے ہیں اور پھر جو ان سب حربوں سے بچ سکے اس کے لئے لاشی۔ گولی۔ جیل خانے۔ اور بھانسی کے پھندے اور جبر کے اس پورے ساز و سامان کی پشت پناہی کرنے والے محض پولیس کے سپاہی اور فوج کے جوان ہی نہیں ہیں عالمی سامراج کی پوری طاقت ہے جس کا علمبردار ہے امریکا اور اس کی دولت و شرف، اس کی فوجی طاقت اور نیوکلیائی قوت۔

اور ان سب کے مقابل میں صف آرا ہیں شنگے بھوکے عوام جن کے پیٹ پر روزلات ماری ہے جا رہی ہے جوں کا تو ظلم اور استحصال کا شکار ہیں اور ان کے پاس کوئی طاقت ہے تو صرف یقین اور اعتماد کی طاقت ہے کہ انسانیت کبھی بھی ٹوٹ تو گئی ہے مگر کبھی جھکی نہیں ہے اور فتح انہیں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ہوتی آئی ہے جو تمام ظلم و جبر کے باوجود تاریخ کے دھارے کو بغیر انداز میں موڑتے رہے ہیں اور آئندہ بھی موڑیں گے۔ اُس کا ذریعہ کیا ہوگا یہ بھی حبیب جالب کے ذہن میں واضح ہے ایک اتحاد اور وہ بھی محض علاقائی یا محض قومی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں کا اتحاد۔

ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
لیکن ان دونوں ملکوں میں امریکا کا ڈیرا ہے (صفحہ ۱۹۵)

میرید سے ہی نبرد آزما فلسطینی
ادیبو، شاعر، دانشور، محسن دانو
کرو حکایت بیروت خون دل سے رقم (صفحہ ۲۴۴)
اور دوسری طاقت ہے جبر کے مقابلے جہوریت اور عوام کی مقاومت۔ جس کے بارے میں حبیب جالب میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے
دنگھو سے زندہ شاعری سے جانے گا
عصا اٹھاؤ کرو فرعون اُسی سے جانے گا (صفحہ ۱۴۲)

پر مختصر سی جھلک ہے حبیب جالب کے زاویہ نظر کی جس نے اُن کی شاعری اور شخصیت میں اعتماد کی وہ شمعیں روشن کی ہیں جو ہر ظلم و جبر کے باوجود جگمگاتی رہی ہیں۔
 بلاشبہ اس طویل رزم نامے میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب اُن کی آواز شاعر سے کہیں زیادہ سیاسی کارکن کی آواز بن گئی ہے اور شاعری کی لطافت اور بلندی صافت اور وقتی اخروں تک اُتر آئی ہے گو ان مواقع پر بھی ان کے ہاں روانی، برجستگی اور کاٹ قائم رہی ہے۔

دیپ جس کا محلات ہی میں چلے
 چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
 وہ جو سایے میں ہر مصلحت کے چلے

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
 میں نہیں ماننا، میں نہیں ماننا
 (صفحہ ۱۳۳)

بیس گھرانے ہیں آباد
 اور کروڑوں ہیں ناشاد

صدر ایوب زندہ باد (صفحہ ۱۳۲)
 روشنیوں کی راہ میں جو دیوار ہے گا نہیں رہے گا
 غاصب کو غاصب جو کھل کر نہ کہے گا نہیں رہے گا (صفحہ ۱۳۴)

لیکن اُس کے باوجود حبیب جالب کی شاعری کا جمالیاتی حسن نکھرتا ہے جب وہ ظلم اور جبر کی اس فولادی دیوار کے مقابلے میں اپنی معصومیت اور نرمی کے ساتھ صف آرا ہوتے ہیں یعنی ایسا شاعر جو صرف محبت اور حسن کے نغمے گا نا چاہتا ہے ایسا انسان جو اپنی ننھی بچی سے پیار کرنے کے آزادی چاہتا ہے جو اپنے گھر بار کی مسرتوں کے لئے تڑپتا ہے جو ہر استعمال کے ہاتھوں لامبھی گولی زندان اور دارورسن کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کے لئے مجبور ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں اس کے پاس اپنے معصوم اعتماد اور انصاف کے سوا اور کچھ نہیں ہے ذرا ان اشعار کو دیکھئے ایک نظم ہے ہتھکڑ ۱۵۔

اس کو شاید کھلونہ لگی ہتھکڑی میری بچی مجھے دیکھ کر کنس پڑی
 یہ ہنسی مجھی تھو کی بشارت مجھے یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
 کس قدر زندگی کا سہارا ملا ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا (صفحہ ۱۳۱)

دوسری نظم ہے ننھی جاسو جا،

حبیب دیکھو تو پاس کھڑی ہے ننھی جاسو جا
 تجھ بلاتی ہے سہنوں کی نگہری جاسو جا
 شصے سے کیوں گھور رہی ہے میں آجہاؤں کا
 کہم جو دیاتیرے لئے اک گرد یا لاؤ لے گا
 عیسیٰ نہ خندہ کرنے کی عادت تیری جاسو جا
 ننھی جاسو جا

(صفحہ ۲۷۸)

تیسری نظم ہے میری بھی

میری بھی میں آؤں نہ آؤں
 آنے والا زمانہ ہے تیرا ----
 تیری آشا کی بجلیا کھلے گی
 چاند کی تجھ کو گڑھا ملے گی
 تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
 ختم ہو گا ستم کا اندھیرا

(صفحہ ۲۷۹)

یہ رنگ حبیب جالب کا سہارا نگ ہے اُن کی شخصیت کا اصل روپ یہی ہے اور جو منظر اُن کی نظم
 "ایک بار" میں کھینچا گیا ہے اس کی ضد رنگ اور نرمی ہی سے اُن کی مجاہدانہ شخصیت کے جوش و ولے اور
 اعتماد نے قوت اور دھام پائے ہیں۔

کچھ آئین کا وہ گھر وہ بام و در
 گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
 وہ ندی کا سرسبئی پانی شجر
 جان نہیں سکتا، بجا، ان تک سنگر
 سامنے رہتے ہیں وہ شام و صبح

یہ ہیں وہ حبیب جالب جنہیں بقول شاعر حسن سے بھی لگاؤ ہے جنہیں زندگی بھی عزیز ہے اور
 حسن سے اسی گھرے لگاؤ اور زندگی سے اسی مجاہدانہ وابستگی نے عمر نوکی آگ میں وہ پھول کھلائے ہیں
 جن کی خوشبو مدّتوں عالم کو مہکاتی رہے گی۔ یہ افتخار کم نہیں کہ اس جیلے شاعر اور اس کی کھلا ۵
 مجاہد کے لئے اردو کے حصے میں آئے ہیں۔

(دہلی ۱۴، اکتوبر ۱۹۸۹ء)

وزیر آغا

حبیب جالب

حبیب جالب سے میری پہلی ملاقات حبیب سے ملاقات میں ہوئی۔ یہ غالباً ۱۹۴۰-۴۱ء کا واقعہ ہے۔ میں اور مولانا صلاح الدین احمد دفتر ادبی دنیا کی سرطخیاں اتر کر شاہراہِ قائد اعظم کے فٹ پاتھ پر پہنچے ہی تھے کہ بیماری نظری ایک ایسے پریشان حالی شخص پر پڑیں جو بڑے کرب سے حیا چینی کر رہا تھا۔ ”وہ ہمارے بچوں پر لاثعیاں برسا رہے ہیں، لاثعیاں برسا رہے ہیں بچوں پر لاثعیاں برسا رہے ہیں“ ساتھ ہی ساتھ خود اس کی آنکھیں بھی آنسو بہا رہی تھیں اور وہ شخص ان آنسوؤں کو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کر رہا تھا جو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کو جھگڑتے ہوئے اس کے ہونٹوں میں جذب ہو رہے تھے۔ مولانا نے اس شخص کو دیکھ کر فقط اتنا کہا: ”یہ حبیب جالب ہے“۔ پھر کسی نے مجھے سرگوشی میں کہا: ”بڑے ڈاک خانے کے قریب پولیس اور طلباء میں تصادم ہو گیا ہے۔“

اُد اب میں سوچتا ہوں کہ اس روز میں نے حبیب جالب کا جو روپ دیکھا وہی شاندار اس کا اصل روپ تھا۔ وجہ یہ کہ حبیب جالب فقط اس ایک روز ہی نہیں رویا بلکہ لہذاں میں مسلسل آنسو بہاتا رہا ہے۔ خود اس کی شاعری بھی ایک ایسے احساسِ زیاں سے عبارت ہے جو بیک وقت شخصی بھی ہے اور غیر شخصی بھی۔ شخصی کیونکہ باہر کا نقصان بھی اس کے لئے شخصی نقصان کا درجہ رکھتا ہے اور غیر شخصی کیونکہ ہر چند اس نے کڑے وقت اور سخت ایام میں بھی جسم و روح کے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم اس نے اپنے دکھوں

کی فائش بھی نہیں کی۔ بلکہ قومی سطح کے دکھوں کو ہمیشہ شخصی معاملات پر فروغیت دی ہے۔ آپ اس کے سیاسی نظریات سے اختلاف تو کر سکتے ہیں۔ (امداد اختلاف کرنا بھی چاہیے) مگر اس کے کرب اور درد سے انکار نہیں کر سکتے۔ جو اس کی ہلکوں پر انسو بن کر جھللاتا اور ظلم کی نوک سے فغلوں کے انگارے بن کر ٹپکتا ہے۔ اس درد پر آپ کسی خاص نظریہ کی سختی آویزاں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ درد بے چہرہ اور بے لباس ہے۔ نہ اس کا کوئی متعین مسلک ہے اور نہ مشہر مذہب! یہ ایک خالص انسانی جذبہ ہے جو جبلت پر تہذیب کی فتح کا اعلامیہ ہے اور قدرت کی طرف سے حبیب جالب کو یہ انسانی جذبہ اتنی بڑی مقدار میں ملا ہے کہ وہ خود محترم جذبہ بن گیا ہے۔ لہذا حبیب جالب کی شاعری جذبے کی ترسیل کا منظر نہیں دکھاتی بلکہ بجائے خود جذبے کا بے مابا اظہار ہے۔ اسی میں حبیب جالب کی جیت ہے کہ وہ امداد باہر سے ایک ہے اور جس شدت سے وہ کسی بات کو محسوس کرتا ہے اسی شدت سے اس کا برملا اظہار کرنے پر قادر بھی ہے۔



وحید قریشی

حبیب جالب کا شعری سفر

حبیب جالب نے اپنی شاعری کا آغاز ایک غزل گو کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام بگم آوارہ میں شعری تحریک کے حوالے سے تین ترکیبیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ بگم آوارہ۔ ایک ایسی علامت ہے جسے شاعر کبھی اپنی ذات اور کبھی اپنے معاشرے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ محبت کی آجڑی ہوئی بستی میں بگم آوارہ کے علاوہ سناں گلیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ماضی کی یادیں بسے بچھڑی ہوئی ماحول کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی ناصبر کاظمی کی طرح NOSTALGIA کا شکار ہوتا ہے اور بچھڑی ہوئی بستیاں گمشدہ محبت کی وادیاں اسے بلد بار اپنے ماضی میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہیں۔ عشق و محبت کی اس دنیا میں جسے حبیب جالب نے بسایا تھا شوق آوارگی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر ہیں بس اسی لہر میں
اُٹتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوق آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فخر لوگ تھے
زعم کم تھا دہا مسکراتا رہا شوق آوارگی
دشمن جان ملک غیر ہے یہ زمیں کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جنس کی اڑاتا رہا شوق آوارگی

ہم آوارہ گاہن گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت ڈھسا کر کوئی معنت میں کیوں غم کو اپنا لے

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے ترسے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

اُس دلیں کا رنگ انوکھا تھا اُس دلیں کی بات نرالی تھی
 نغموں سے بھرے دریاحے مدائ گیتوں سے بھری ہریالی تھی
 وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ بھول وہ کلیاں یاد آئیں
 سندر من چلیاں یاد آئیں ہر آنکھ صبر مٹوالی تھی

حبیب جالب کی یادوں کا یہ سلسلہ اسے بار بار تقسیم برصغیر سے پہلے کی دنیا
 میں لے جاتا ہے۔ عشق و محبت کی یہ یادیں بعض اوقات اُسے گیتوں کی فضا میں لے جاتی
 ہیں۔ اس کا محبوب کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا۔ غزل کی نازک دنیا اس کا اتنا پتہ نہیں
 سے قاصر ہے۔ شاعر کا لہجہ اور لفظوں کا انتخاب بار بار ایک خاص قسم کی ہندوستان فضا کی طرف
 متوجہ کرتا ہے یہ محبوب اور اس کی محبت زمانے کی مبینہ پڑھ گئے اسی لئے حبیب جالب
 بار بار زمانے کو بے در و قرار دیتا ہے اور مزایہ داروں کو کوستا ہے۔ اس کا رقیب شاید اسی
 دولت مند طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لئے رنگ و رنگ کا روں کو دیکھ کر حبیب جالب
 بھی اپنا دل تھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ امیر طبقے کے خلاف بغاوت کا یہ شخصی جواز حبیب
 جالب کے اولین مجموعہ کلام برگ آوارہ سے بخوبی برآمد ہوتا ہے وہ ایک ناکام عاشق ہے
 جس کی محبت اُسے در راہے پر چھوڑ گئی ہے۔

نگش کی فضا دھواں دھواں ہے
 کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
 بھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
 ٹوٹی ہوئی شاخ آشیاں ہے

جس دل سے اُجھڑ رہے تھے نئے
 پہلو میں وہ آج فوجِ خواں ہے
 ہم ہی نہیں پائمال تنہا
 لئے دھست تباہ اک جہاں ہے
 ذاتِ عشق کی یہ ٹوسیں ہم جاناں سے غمِ روزگار کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہے شاعر
 ہجر کی تنہا راتوں میں لپڑی کائنات کو اپنے آس پاس دیرالہ دیکھنے لگتا ہے۔

حضرت می برستی ہے دردِ بامِ پہ ہر سو
 روئی ہوئی گلیاں ہیں کتے ہوئے گھر ہیں
 وہ لوگ تہم جن کے لئے کھکشاں نے
 وہ لوگ جی لئے ہم نفسِ ہم سے بشر ہیں

شہرِ دیراں آدا سس ہیں گلیاں
 راگزاردن سے اُٹھ رہا ہے دھواں
 بسیتوں پر غموں کی پورشش ہے
 قرینہ قرینہ ہے دقہ آہ و فغاں
 صبح بے نورِ شام بے مایہ
 لٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں

اپنے ذاتی غم کو پوری کائنات کا غم بنانے کی یہ کوشش صرف ان غزلوں میں نمایاں
 نہیں جو ہندی آمیز ہیں بلکہ ان غزلوں میں بھی ظاہر ہے جن میں نارسا کا اثر زیادہ نمایاں ہے
 سبب شاید یہ ہے کہ غالب کا عشق نہایت مختصر زمانے پر مادی ہے اور محرومی کے دنوں
 میں انہوں نے اپنے تخیل کی مدد سے لہجہ غلامی کو پکڑ لیا ہے۔ یہ غلامی محبت اس بات کی

مخزن ہے کہ شاعر اپنی آوارگی اور جذباتی کو بھی ایک مستقل جذباتی وسیلے کے طور پر قبول کر کے بھیلانا چلا جاتا ہے حالانکہ وہ جس بھول کی باتیں کرتا ہے اس کے اپنے الفاظ میں وہ اس بھول کو چھونے میں بھی ناکام رہا ہے ۔

{ اُس بھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
اس بھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم
صحن گشت میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جانے کہاں دیکھا ہے

ہم پہننے تو آنکھوں میں تیر نے لگی شبہم
تم پہننے تو گشت نے تم پر بھول برسائے
اُس لگی میں کیا کھویا اس لگی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے
پھر رہی میں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پیسلے ہوئے سائے

شوق آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا
اُس کے اُچل کو پھوڑ ہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

حبیب جالب کی عشقیہ شاعری گہری جذباتی وابستگی کے باوجود ایسی شاعری ہے جس

میں محبوب کے جسم کی محنت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ عشق و محبت کی دنیا میں وہ ہر اچھے آئیڈیل کو محبوب کی ذات سے وابستہ کر کے دیکھتے ہیں اس لئے ان کی حیثیت جذباتی طور پر ایک ایسے انسان کی ہے جو راستے میں بھٹک رہا ہے اور جسے اپنے جذباتی پہچانات کی کبھی متین سمت کا سراغ نہیں مل رہا۔ جالب کی ذات کا یہ روپ اس کی سیاسی زندگی میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کی حیثیت اپنی داخلی دنیا پر نظر ڈالتے ہوئے ایک ایسے شاعر کی بن جاتی ہے جن کا دل اس کے پہلو میں سمبا جھاپے اور اندھیرے آسے۔ چاروں طرف اپنے گہرے میں لئے ہوئے ہیں۔

دل ہے اب پہلو میں لیل سمبا ہوا
جیسے کٹیا میں دیا جھلتا ہوا
پھر رہا ہوں لیوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستا بھولا ہوا

محبوب کے متاع غیرین جاننے سے جالب جو منطقی نتیجہ نکال سکتا ہے وہ یہی ہے کہ امیر طبقہ مغربیوں کا استعمال کر رہا ہے۔ اپنے داخلی خول سے نکلنے کے لئے تخلیقی سطح پر وہ صرف دو راستے ہی اختیار کر سکتا تھا کہ فکری تفصیلات کیلئے وہ اپنے آپ کو کسی ایسے فلسفے سے وابستہ کر لے جو اس داخلی طبقاتی جنگ کو خارجی سطح پر لانے میں کامیاب ہو۔ مدنی طرف فنی لحاظ سے تلافی کی صورت یہ تھی کہ شاعر ایسی زبان، ایسا لہجہ پیدا کرے جو اسے اپنی ذات کے خوف سے نجات دلا کر لٹکارے ہم کنار کر سکے۔ اس کے لئے حبیب غالب کو عزل کا راستہ ترک کر کے نظم کی طرف بھی آنا پڑا ہے اسے یہ احساس بار بار ستا رہا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت، ایک بے یار و مددگار انسان کی ہے۔

میں بھی ہوں تری طرح سے آوارہ و بے کار
اڑتے ہوئے پستے مجھے ہمسراہ لئے چل

یہ احساس اس کے لئے اکثر ذخیرہ پائانت رہا ہے اس لئے بزرگوں کو آوارہ کے
 بعد غزل اور اس کے وہ تلازمات جو اُسے ماضی کی طرف لے جاتے تھے ان سے وہ گہرا اٹھا
 ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ لیڈر کے خطابیہ ذرائع کا زیادہ مشتاق ہو گیا ہے کیونکہ داخلی
 خوف کو اپنی بھڑک بھڑک کے مدد سے دھالنے کے لئے اس سے زیادہ کامیاب اور کوئی ذریعہ
 نہیں ہو سکتا۔ وہ شاعر جس کا دل داخلی طور پر کسی چھپاؤ کی محنت بھی برداشت نہیں کر سکتا،
 جو شہر بیان میں پنجم سے ان کی تابشیں چھیننے کا پروگرام بھی لکھتا ہے۔ یہاں میں کی بجائے
 ہم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ہم ان نجوم کی تابشیں بھی بھین سکتے ہیں

بتا دیا ہے جنہیں غیب آسماں ہم نے

یہ اجتماعی لہجہ میر تقی میر اور گشتے میں قفس کے میں بہت نمایاں ہے۔ میں
 سے ہم تک کا یہ معجز جیب جالب کے ہاں اس کی جذباتی زندگی کے لئے ایک نشا امکاں
 کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اُسے سماجی زندگی میں گم ہونے کی دھند بھی دیتا ہے۔ طبیعت کے
 اعتبار سے جالب نے فلسفیانہ آفتاب طبع لکھتا ہے نہ اس کا ذہن کا مدد ہی ہے اس لئے ہر کسی
 فلسفے کی تفصیلات سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ انکسار اور اس کے اسباب و علل سے جیب
 جالب کی جذباتی زندگی کوئی واضح منطقی ربط نہیں رکھتی اس کے لئے تو پریم لہرنے اور شیخ پر
 پسے گرد و مٹا مٹھیں مارتے ہوئے عوام کے سامنے ایک غیر ملانہ لہجہ اختیار کر کے جذباتی سکون
 حاصل کر لینا کافی ہے ایک فن کار کی حیثیت سے البتہ جالب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ
 جوش یا فیض کی طرح مزدور کے ہل پر سونے چاندی کے ورق نہیں چھپاتا۔ اس نے اعلیٰ طبقے
 اور ادنیٰ طبقے کے درمیان منافقت کے پردے مائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی ذات
 سے باہر اُسے جو کائنات ملتی ہے اُسے بڑی دیانت داری سے پیش کرنے کا عزم کیا ہے
 اور اس میں وہ کامیاب ہے۔ خطابیہ شاعری میں معمولاً کمی یہ ہوتی ہے کہ اس میں شوکت

الفاظ کی طرف شاعر کا دل زیادہ لپکتا ہے، لیکن جالب نے اس سے ذریعہ اہلاد کو بہت زیادہ نہیں برتا۔ خشک بانیہ طریق مخاطب کو وہ عوامی سوچ سے ایک اور طریقے سے منسلک کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے چھوٹے چھوٹے نکات، لفظوں کی تکرار سے جذباتی آثار چٹھاؤ کی نشاندہی اور وہ ملی کی گفتگو میں کوئی نیکیا طنزیہ روپ تلاش کرنا جلیب جالب سے خاص ہے۔ فلمی دنیا سے کچھ عرصہ لگاؤ کی بنا پر اسے گیت کے کلیدی مصرعے کی طرح نظروں میں ایک خاص کلیدی پیرایہ پیش کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ ایسے میں اس نے قرانی سے محض موتی آہنگ کا کام نہیں لیا بلکہ قافیوں کو نظم کی جذباتی بانٹ میں ایک ناگزیر ضرورت بنا دیا ہے۔

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا (سرشار)

اے خموش طوفان
دس کروڑ انفر

پاکستان کی غیرت کے دکھوالو
بھیک نہ مانگو
توڑ کے اس کشمیری کو آدمی کھا لو
بھیک نہ مانگو

ایک ہی نعرہ ہے سب کا ایک ہی سب کی صدا
صد امریکہ نہ جالے صد امریکہ نہ سب

اس کلیدی مصرعے کے استعمال کے علاوہ حبیب جالب کا دوسرا کامیاب تجربہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کو نشانہ بنانے کا ہے۔ ادیبوں کے یکے بانیے کو حبیب جالب نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ صحافی، پیشہ ور، خوشامی، انعام حاصل کرنے والے شاعر سب اس کی طنز کا نشانہ بنتے ہیں اس لئے کہ حبیب جالب خود اس راستے میں یکاؤ مال نہیں بنانا اس نے ہرگز اس وقت میں اپنے دامن کو آسودہ ہونے سے بچایا ہے۔

اب شعر دی ہے اسے جالب جس پر کوئی انسرجمون اٹھے
 سکر ایسی منسل سے بسم اللہ دفتر کا دفتر جمون اٹھے
 جینا ہے اگر اس لہجے میں اسے دوست قصیدہ خواں ہو جا
 اخبار میں لکھ ایسی باتیں صاحب کا سکر جمون اٹھے

ذہانت دور ہی ہے منہ چپائے
 جہالت قہقہے برسا رہی ہے
 ادب پرافروں کا ہے تسلط
 حکومت شاعری فرما رہی ہے
 لحد میں پاؤں ہیں اور مرد ہے ہیں
 مگر پھر بھی خوشامد کر رہے ہیں
 خدا یا یہ معتد اہل ماجت
 تیرے بندوں سے کتنا ڈر رہے ہیں

بڑھاپے میں تو سر ہٹا ہے یوں ہی
 سر اُن کا تو پرانا اہل رہا ہے

انہیں آنا ہے ہم کو بیچ دینا
اسی باعث وظیفہ مل رہا ہے

سر مشعل اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب الیوب خاں کے خلاف پبلک میں آوازیں
اٹھنی شروع ہو گئی تھیں۔ حبیب جالب انہیں آزاد دل کا نقیب ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا
کہ حبیب جالب مارکسی نظریات کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ الیوب خاں کے آخری
زلف نے میں ملک کو جو مسائل درپیش تھے خارجہ پالیسی میں ویت نام، فلسطین، چین، امریکہ
کے بارے میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سپر پارٹی اور بعض دوسری باتیں
بازو کی جھڑپوں کے خیالات پر منحصر ہے۔ اس زلف نے میں سر غیر انتہا پسند کو امریکی ایجنٹ قرار
دینے کا بڑا اندازہ کیا۔ حبیب جالب کا بارعاز رویہ بھی اپنے جڑوں میں اسی طرح کی تفصیلات
رکھتا ہے جو اس زلف کے اخبارات میں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ ان نظریات کے پیچھے
کا رد و حاصل کا تجزیہ سر مشعل میں نہیں ملتا۔ حبیب جالب کی جذباتی تکمیل کے لئے ان تفصیلات
کی ضرورت بھی نہیں آئے تو اپنے جذباتی ایجان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر ظہر تسکین
فرام کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کے بدلنے ہوئے دھارے میں جالب غلوں کی تلاش
میں اپنی سیاسی پارٹیاں بدلنے پر مجبور ہوتا رہا۔ سر مشعل میں ذوالفقار علی بھٹو نے کھنسنے والا شاعر
”گوشتے میں قفس کے“ میں ”مگر سپر پارٹی کے خلاف بارعاز رویہ رکھتا ہے لیکن اس کی جذباتی
زندگی اس تبدیلی کے باوجود سر مشعل، عہدہ تم اور گوشتے میں قفس کے تک ایک مربوط جذباتی اکائی
رکھتی ہے اور ذوالفقار علی کے عنوان سے یہ اشعار کہتے والا

ہمارے ہاتھ میں جب تک ہے ذوالفقار علی
کوئی ہمارے سروں کو سمجھا نہیں سکتا
دیار پاک ہے انعام ذات باری کا
اسے جہان سے گھٹی مٹا نہیں سکتا

یہ بھی کہنے پر قادر ہے۔

تم سے پہلے وہ جو ایک شخص یہاں تخت نشین تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہوتے پہ اتنا ہی یقین تھا
کوئی عجب نہ ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

اور پھر

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
مقا وطن ذہن میں بچنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

”عہدِ تم“ میں جالب کے پیش نظر بھی منہ و جملہ مدان مراد، حسن ناصر شہید
زیادہ رہے ہیں اور پاکستان کے بارے میں جن باتیں کم کی ہیں۔ یہاں بھی نفسی دنیا حال
تکلیک بردے کا رہے اور ڈیپ کے مصرعے اسی طرح ایک خاص مضامین تھے ہیں۔
پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

خطرے میں اسلام نہیں

قائد اعظم دیکھ رہے ہو اپنا پاکستان

قائد اعظم دیس میں تیرے میں روپے من آتا ہے
قائد اعظم دیس میں تیرے چاروں جانب سنا ہے

یہ بولتے ہوئے مصرعے حبیب جالب کی نئی ہجیرت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان

میں اس کی بات بہت پیسے چلی گئی ہے۔ یوں سلوم تو لمبے کہ جسے شاعر بننا ہی باتیں کرتا زیادہ مزدوری سمجھتا ہے اور اس کا مقصد اپنے داخلی رویے کو اجاگر کرنے سے زیادہ دوسروں کے احساسات کی ترجمانی ہے۔

”گوشتے میرے قفس کے“ شاعر کی آخری تکمیل صحت اس وقت تک ملتی ہے۔ یہاں طالب کے اندر چھل ہوا انسان ایک بار پھر اگلائی لیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ قید و بند کے تجربات نے اسے اولاد کی محبت اور بیوی کی آرزو بشمول کا احساس دلایا ہے۔ یہاں طنز بھی بھرپور دار والی کیفیت چھوڑ گیا ہے اس کی جگہ ایک نرم اور ہوا طنز بر رویے کے نیلے لایا ہے۔

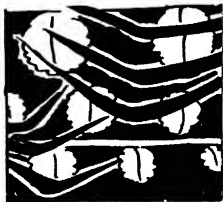
یہ لہجہ شاعر کی طرزِ فکر کی زندگی سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس میں لڑاٹھ سے لگوٹے میں قفس کے ”میں“ بھی بیان جا سوتا ہے۔ شاعر کے ذاتی دکھ کے علاوہ ایک ایسے طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہے جہاں شاعر محض جسم تغیر کو خطاب کرتا ہے البتہ زمینیں ہلکا اس کی اپنی ذات کے اندر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی مخالفت ہے۔ اس سرے پر اگر غالب کے کلام میں ایک خاص طرح کا توازن آگیا ہے یہی سبب ہے کہ اس مجموعے میں نسلوں کی بجائے مغزوں میں شاعر کا فن بنے حروف پر نظر آتا ہے۔ اچھی شاعری کے لیے محض غصہ چھنا کافی نہیں حبیب غالب کو اس کا احساس ہو چکا ہے اس لیے اسے اپنے سیاسی عقائد کو ذات کے حوالے سے دیکھنے کا ہر ذمہ لگایا ہے۔

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کسی کی ہے
خامشی پر ہیں لوگ زیرِ قباب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے
مطمئن ہے ضمیر تو اپنا
بات ساری ضمیر ہی کی ہے

اپنی تو داستان ہے بس اتنی

غم اٹھاتے، میں شاعری کی ہے

”برگ آوارہ“ سے گوشے میں قفس کے ”نک کے اس شعری سفر میں واقعی
جلیب جالب نے غم بھی اٹھاتے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ اس میں ایسی منزلیں
بھی آئیں جب شاعر مقبولیت کے نشے میں مخلص عوام کے جذبات کا ترجمان ہوا لیکن
آخر کار اُسے یہ احساس ہو گیا کہ اپنے داخلی رویے کی شرکت کے بغیر ریڈی کو
چل سکتی ہے شاعری کا دھندلچلنا مشکل ہے۔ اب اگر وہ نعرہ زنی بھی کرتا ہے تو
اُس میں پیچیدگیوں کے علاوہ ٹھونج جگر بھی شامل ہوتا ہے۔ آج کا جلیب جالب سیاست
اور سماجی حالات کو شاعری بناتے ہوئے نگر و احساس کی باریکیوں کو متغفل کرنے میں
بھی کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ماتھے میں عطا تو رکھتا ہے لیکن یہ عطا محض لٹھ ماری
کے لیے نہیں اس میں شاعر کی قربت بازو کے علاوہ اس کا جذباتی رویہ بھی شامل ہے



کلام جالب

عزیز



ب نہ وہ غزل اپنی اب نہ وہ بیاں اپنا
 راکھ ہو گیا جل کر ہر جس گھاں اپنا
 وہ چمن جسے ہم نے خون دل سے سینچا تھا
 اس پر حق جتا جتا ہیں آج بجلیاں اپنا
 بحسب یوں نے دنیا کو کچھ سکون تو بخشتا



اس نے جب منہ کے نمسکار کیا
 مجھ کو انسان سے اوتا رکھا

دشتِ غربت میں دلِ دیراں نے
 یادِ جمن کو کئی بار کیا

پیار کی بات نہ پوچھو پارو
 ہم نے کس کس سے نہیں پکاریا

کتنی خوابیدہ تمنائوں کو
 اس کی آواز نے بیدار کیا

ہم پھبھاری ہیں بتوں کے طالب
 ہم نے کبھی میں بھی اقرار کیا

ہم بتائے لیتے ہیں اور آشتیاں اپنا
 کچھ دنوں رہی تو ہے داستانِ دلِ تجیں
 کچھ دنوں رہا تو ہے کوئی ہم نہ یاں اپنا
 س دیار کی راتیں نغمہ ریزہ پرستیں
 ہر نظر شہابِ آلودہ بر نفسِ جواں اپنا
 نزلوں نہیں ملتا کوئی سایہِ دلوار
 کس کے پاس جائیں ہم کو کون یہاں اپنا

سزمیں دو آہ کی ہم سے چھن گئی جات
 آج تک اسی غم میں لہے نوحہ خاں اپنا



اک مستقل طالب کو سر، شا یا
دور کہ ہے ہیں ۔ وہ سے دوسرے پر
اس سبکی ، وہ لب ہی بنی بیخ
چوس کو احرام سے گر ہی ہوا
جسے حد کا کئی چھ ہے ہر کئی
فوش میں کہ ہم قبل نہ کا یا
ن کو کئی دم کا حد سے ہی
دش دش کو کا کر حد کا چھ
نئے ہیں اگر ہم سر ، شام بگ کا
اے سے ہواک ہے ابام بگ کا
تی ہیں توئی کا شہر چہی
دک وہ بھوک بگ ہے انام بگ کا
ہ بگ اس میں ہی تے اط فوش
کرتے ہیں ہے دیکھ ہی کام بگ کا
ہی کے کہوں دگ سے فوش
پتے میں ہی بھول کے ہی نام بگ کا
بگ میں ہی کئی کئی کھو ہوا
خود ہے بھین میں اگر نام بگ کا
کوں میں کھتے میں دس کائی کے گیت
ہستیں کو کایا کرام بگ کا
ہے بگ فوش میں کئی دے میں ہی دے
میں لپٹ سر نہ لیں کئی احرام بگ کا



اور سب بھول گئے عروپ صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بفساوت لکھنا
لاکھ کہتے رہیں غلمت کو نہ غلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے اجازت لکھنا
نہ مسئلے کی نہ تائش کی تمنا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا
ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا
اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کی ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحبِ ثروت لکھنا
دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سر و قیامت کو جراتی کو قیامت لکھنا
کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے حصا جالب
رنگ رکھنا ہی اپنا اسی صورت لکھنا



پھول سے ہونٹ چاند سا مانتھا
ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا

کوئی بات ان لبوں تک آئی تھی
کوئی غنچہ ضرور چنکا تھا

رات صحن خیال میں جالب
اک عجب شخص رقص فرماتا تھا



تباہیوں پہ بھی دل کو ذرا ملال نہ تھا
خوشا وہ دور کہ چنے لیت کا خیال نہ تھا

کہاں کہاں مری نظروں کو اک تلاش نہ تھی
کہاں کہاں مرے ہونٹوں پہ اک اہل نہ تھا



تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا
اُس کو بھی اپنے خدا بخونے پہ اتنا ہی یقین تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے موت اہل تو تباہ
وہ کہاں ہیں کہ جتنیں ناز بہت اپنے تئیں تھا
آج سوتے ہیں تر خاک نہ جس نے یہاں کتے
کوئی شغل، کوئی شبنم کوئی مہتاب جس میں تھا
اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا
اک زمانے میں مزاج ان کا عیش و عشرت تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے حال نہیں تھے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

تری نگاہ سے کوئی جگہ نہیں اے نیت
تری نگاہ کے قابل ہمارا حال نہ تھا

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جب ہمیں جانب
خسب ال دہر نہ تھا فکرِ ماہ و سال نہ تھا



جانا ہے تمہیں دہر سے ایمان ہے اپنا
ہم آکے نہیں جائیں گے اعلان ہے اپنا

انسان سے جو فترت کمرے انسان نہیں ہے
ہر رنگ کا برنل کا انسان ہے اپنا



تم امن کے دشمن ہو محبت کے ہوتاں
دنیا سے منانا تمہیں ارمان ہے اپنا

کیوں اپنے رفیقوں کو پریشان کریں ہم
حالات سے دل لاکھ پریشان ہے اپنا

اس شاہ کے بھی ہم نے ہتھکے نہیں نکلے
پاس اپنے گواہی کو یہ دنیا ہے اپنا

پتھر تھاز خوں سے دل زخنی جب گری ہو گیا
اُس کو روتے تھے کہ سونا یہ نگر بھی ہو گیا
لوگ اسی صورت پریشان ہیں جدھر بھی دیکھے
اور وہ کہتے ہیں کہ وہ غم تو سہر بھی ہو گیا
بام و در پر ہے مسطّٰ آج بھی شام الم
یوں تو ان گلیوں سے خورشید سحر بھی ہو گیا
اُس ستمگر کی حقیقت ہم پہ ظاہر ہو گئی
ختم خوش فہمی کی منزل کا سفر بھی ہو گیا



دل پر جو زخم ہیں وہ دکھائیں کسی کو کیا
اپنا شریکِ درد بنائیں کسی کو کیا



ہر شخص اپنے اپنے غموں میں ہے مبتلا
زنداں میں اپنے ساتھ رلائیں کسی کو کیا

وہ بات چھیڑ جس میں جھلکتا ہو سب کا غم
یادیں کسی کی بجتھ کر ستائیں کسی کو کیا

بچھڑے سوتے وہ یاد وہ چھوڑے ہوئے دیار
رہ رہ کے ہم کو یاد جو آئیں کسی کو کیا

سوئے ہوئے ہیں لوگ تو ہونگے مکون سے
ہم جاگنے کا روگ لگائیں کسی کو کیا

رونے کو اپنے حال پہ تنہا ہی ہے بہت
اُس انجمن میں خود پہ ہنمائیں کسی کو کیا

جالبِ شانے گا کوئی احوال پوچھنے
دیں شہر بے جساں میں صدائیں کسی کو کیا



دل پُر شوق کو پہلو میں دبا لے رکھا
تجھ سے بھی ہم نے ترا پیار چھپائے رکھا
چھوڑ اس بات کو لے درست کہ تجھے پہلے
ہم نے کس کس کو خیالوں میں بسا لے رکھا



دل ہے اب پہلو میں یوں سہا ہوا
جیسے کٹیا میں دیا جلتا ہوا
اب نہ تیرا غم نہ تیری جیبتو
زندگی میں کون یوں تنہا ہوا
پھر رھتا ہوں یوں تری نگہوں سے دور

غیر ممکن تھی زمانے کے غموں کی فزیت
پھر بھی ہم نے ترا غم دل میں بسا لے رکھا
پھول کو پھول نہ کہتے تو لے کیا کہتے
کیسا ہوا غینے کا رپہ سجائے رکھا
جانے کس ٹال میں ہیں کونے شہروں میں ہیں وہ
زندگی اپنی جھینیں ہم نے بنائے رکھا

ہائے کیا لوگ تھے وہ لوگ پری چہرہ لوگ
ہم نے جن کے لیے دنیا کو بھلا لے رکھا

اب بیس بھی تو نہ پہچان سکیں ہم ان کو
جن کو اک عمر خیالوں میں بسا لے رکھا



شوق آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیسرا ہی سانا نہ ہوا

خیر مطلب نہ آسکا لب پر
مطمن ہیں کوئی خفت نہ ہوا



شہر سے بستی سے دیرانے سے دل گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے دل گھبرا گیا

اک ممکن خاموشی اک بیکراں گہرا سکوت
آج صحر کا بھی دیوانے سے دل گھبرا گیا

پھر گئے جالبت نکلا ہوں میں کئی اُچھے چمن
موسم گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

اس کے آنچل کو چھو رہی تھیں
نائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

دل میں نوحہ کناں رہا اک غم
فکر بھی اپنا بے صدا نہ ہوا

ناخدا تو ہمیں دُبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خدا نہ ہوا

ہم پہ اس عہد کم نکلا ہی میں
کون سا جوہر نادر نہ ہوا

اب تو ہم خاک ہو چکے جالبت
اب جس نادر کوئی نہ ہوا



غزلیں تو کہی ہیں کچھ ہم نے ان سے کہا احوال تو کیا
کل مشعل ستارہ ابھریں گے ہیں آج اگر ہال تو کیا

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تھے معلوم نہیں
تحفہ خلق کا اک لمحہ ہے بہت بیکلچے سو سال تو کیا

سکون کے عوض جبک چلے وہ میری نظریں حسن ہیں
اے شمع شبستان دولت! تو ہے جو پری تمثال تو کیا

ہر پھول کے لب نام مرا چہ چین میں عام مرا
شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گرا ہوا نہیں ہے مال تو کیا

ہم نے جو کیا محسوس کیا جو درد ملاؤ نہس ہنس کے سہا
بھولے گناہ مستقبل ہم کو نالاں ہے جو ہم سے حال تو کیا

ہم اہل محبت پائیں گے اپنے ہی سہاے منزل کو
یاد ان بستیوں نے ہر سو پھیلانے ہیں نیکیں حبال تو کیا

دنیکے ادب میں اے طالب اپنی بھی کوئی پہچان تو ہو
اقبال کا رنگ اڑانے سے تو بہن بھی گیا اقبال تو کیا



غائب و یگانہ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے ملے نہ ہوگی کیا منزل اب تنہا
منکر انجمن کس کو کیسی انجمن پیارے

اپنا اپنا غم سب کو سوچے تو سب تنہا
ہن رکھو زماں کی کل زبان پر ہوگی

ہم جو بات کرتے ہیں آج زیر لب تنہا
اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے

ساتھ کون تنہا پہلے ہو گئے جواب تنہا
مہر و ماہ کی صورت مسکرا کے گزرتے ہیں

خالق ان تیسرے ہم بھی روز و شب تنہا
کتنے لوگ آجیئے پاس مہرباں ہو کر

ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا

یاد بھی ہے ساتھ اٹھی اور غم زماں بھی
زندگی میں ملے جانب ہم جئے ہیں کب تنہا



نہنگی کاجو میں دربان ہوتا
توجینا کس قدر آسان ہوتا

مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں سرگرمی میں انگلستان ہوتا



مری انجکشن بلا کی چُست ہوتی
بلا سے جرنہ اردو دان ہوتا

جھک کے سر کو ہوجاتا جو سر میں
تولید بھی عظیم الشان ہوتا

زمینیں میسری ہر صوبے میں ہوتی
میں واللہ صدر پاکستان ہوتا

کوئی شہزادہ کوئی بات نہی کہنے کا جتن کرتے رہنا
انمول ہے پل پل جیون کا آئیں نہ یونہی بھرتے رہنا

کچھ کام نہیں آتی آئیں چپکنے سے سمنتی ہیں ایں
تقدیر پہ کیا تہمت یارو مینے بیٹھے دھرتے رہنا

سر ڈال کے چلتے رہنے سے کچھ اور بھی اونچی ہوتی ہیں
دیواریں تو ہیں دیواریں ہی دیواروں سے کیا ڈرتے رہنا

دنیا کو اگر سلھالیں گے ہر منسزل کو ہم پالیں گے
اگنے لف کے غم میں کیا جالب جیتے رہنا مرنے نہنا



لوگ گیتوں کو بھگایا

آج پندرہویں میں بھرا دیا

جب چلے آئے چین مارے ہم

الغاث گل تر یاد آیا

تیری بیگانہ بنگالی شہل

یہ ستم تاج پھر یاد آیا

ہم زہلے کا ستم بھول گئے

جب ترا طعن نظر آیا

تو بھی سرور تھا اس شب ہرزم

اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہوا دردِ تمنا بیدار

پھر دل خاک بسرا دیا

ہم جسے بھول چھوٹے جالیت

پھر وہی راہ گزر یاد آیا



کہ گفتگو سے نہ وہ شاعری سے جائے گا

عصا اٹھاؤ کہ فسرِ خون اسی سے جائے گا

اگر بے فکر گریباں تو گھر میں جا بیٹھو

یہ وہ عذاب ہے دیوانگی سے جائے گا

بجھے چراغ، نہیں بے بیتیں، چمن اجڑا

یہ رنج جس نے دیئے کب خوشی سے جائے گا

نہ ہماری طرح سے مرد ہمدردی طرح

نظامِ زر تو اسی سادگی سے جائے گا

جگا نہ شہ کے مصاحب کو خواب سے جالیت

نہ وہ جاگ اٹھا، نوکری سے جائے گا



ہم جواب تک انھار ہے ہیں ستم
 شاید اپنا جگر ہے آہن کا
 ہر کلی کی ہے آنکھ میں آنسو
 سال کیا ہو گیا ہے گلشن کا
 جو سپہ عورتوں سے ڈرتی ہے
 سامنا کیا کرے گی دشمن کا
 حیف زنداں میں ڈال رکھا ہے
 کم ننگا ہوں نے حسن آنگن کا
 دمن کی دنیچا دمن کے بھندے
 کوئی ہوتا نہیں ہے زد دمن کا
 جس کی سجنی الگ ہو زنداں میں
 کیا اٹھائے وہ لطف سادن کا
 یاد آتا ہے ہم کو زنداں میں
 گاؤں اپنا زمانہ بچپن کا
 گیت گاتی ہے جو مرے من کے
 شوق ہے مجھ کو اس کے درشن کا
 دکھ کے سائے سمٹنے لگتے ہیں
 کیا جواب اس نوائے روشن کا



ہوائے جو دوستم سے رُخ و فانا بجا
 مجھے تمام دیے ایک یہ دیا نہ بجا
 فراق و وصل کا لذت شناس ہو کیونکر
 جو دل کو سایہ مہتاب میں بٹلا نہ بجا
 مرے عنوں کا مداو ہے کیا، بتا کھل کر
 پہیلیاں ہی مرے درد آشنائے نہ بجا
 ہر اہل جور کی خواہش رہی ہے میں نہ ہوں
 مگر میں ہوں کہ میرا شعلہ نوا نہ بجا
 مرے خیال میں اب تمک چمکے ہیں ظالم ہی
 ڈھلے گی ظلم کی شب و پُپ آس کا نہ بجا
 طلوع صبح کا منظرِ نظریں روشن رکھا
 شبِ سیاہ میں یہ آتشیں بونا نہ بجا
 جہوم یہ جو ترے سامنے ہے اے ساقی
 کر اس پہ لطف مری تیشگی بجا نہ بجا
 تنہا کے چہرے پہ غم کو نہ! ہر آغز سے
 مجھی نظر سے مرے ہم نشیں فضا نہ بجا



کیسے کہیں کہ یاد یاد جا رات جا چکی بہت
 رات بھی اپنے ساتھ ساتھ آنسو بہا چکی بہت
 چاند بھی ہے تھکا تھکا تارے بھی ہیں بجھے بجھے
 ترے ملین کی آس پھر دیپ ہلا چکی بہت
 آنے لگی ہے یہ صدا دور نہیں ہے شہر گل
 دنیا ہماری راہ میں کانٹے بچھا چکی بہت
 کھلنے کو ہے قفس کا در پانے کو ہے کون نظر
 اے دل زار شامِ غم ہم کو رولا چکی بہت
 اپنی قیادتوں میں اب ڈھونڈیں گے لوگ منزلیں
 راہزنوں کی رہبر سہی راہ دکھا چکی بہت
 دل کی شکستگی کے ہیں آثار پھر بہت
 اہل جہنم ہیں اپنے آزاد پھر بہت
 جو لفظ کھا گئے تھے چمن کی شگفتگی
 بر صبح لکھ رہے ہیں وہ اخبار پھر بہت
 جو بیچ رہے اس کو گنوانے کے واسطے
 کوشاں ہیں اہل جہنم و دستار پھر بہت



حُسن کا ہم نے کیا پرچہ بہت
 حُسن کے ہاتھوں ہوئے رسوا بہت

مروجِ نکمت اپنی قسمت میں نہ تھی
 دُور سے اُس پھول کو دیکھا بہت

وہ ملا تھا راہ میں ایک شام کو
 پھر اُسے نہیں نے یہاں ڈھونڈا بہت



بڑے بنے تھے جالب صاحب سڑک کے بیچ
گولی کھائی لائیں کھائی گھرے سڑک کے بیچ



ہوتا ہے شہرِ سلام سلاخوں کا جو در بند
کر لیتے ہیں ہم بھی کئی مہتابِ نظر بند

ترسیں گی اجالوں کو شبِ غم کی بجائیں
ہو جائے گا جس روز مرادِ تیر بند

رستہ کہاں سوچ کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے نڈاں میں بھر بند

جینا ہمیں آتا ہے بہرِ طور مری جاں
کرتے رہیں وہ زلیت کی ہر راہ گزر بند

ہے فرضِ تجھی پر کہ ہر اک عہد میں جالب
آلام اٹھائے جا زباں اپنی نہ کر بند

کبھی گریباں چاک ہوا اور کبھی ہوا دل خوں
ہیں تو یہ نہیں ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ

جسم پہ جو زخموں کے نشان ہیں اپنے بستے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کہ سڑک کے بیچ

دھڑکیں کے ہوس پر وہ غم پر غم ہے



کون اس انجن میں ہے اہل نظر
دولت رائیگاں ہے متاع ہنر
کتے بے نور ہیں آفتاب و قمر
گردش روز و شب آگے ہم کدھر
کتنی دیران میں پیار کی بتیاں
نوحہ گر ہے دفار گزرتاں
جہل منڈنیش ہے بھد تکنت
ہم نشیں کیوں نہ ہو علم کی آنکھ تر
شیخ کی آنکھ میں بھی مرز نہیں
برہن بھی محبت سے بے خبر
میں بھی منصور ہوں غیبی منصور ہوں
کاث دو میرا سہ کاث دو میرا سر
دل میں روشن ہے اب تک تری آرزو
اے دیارِ محسوسے دیارِ محسوس



نہوں کو دیکھنے سے ایک نظر
کتے عالم گزر گئے دل پر
یوں بھی بے چینیاں نہیں جاتیں
ہم نے دیکھا محوش بھی رو کر
شب کی تاریکیوں میں تیرا خیال
جیسے کھجائے روشنی میں نظر
تیری بدلی ہوئی منظر تو پہ
لگتا گہرا ہے زندگی پہ اثر
اس دیارِ ستم ظریفیاں میں
فرصت ہاؤ ہو بہت ہے مگر
قتیبہ بے شعور لوگوں کے
کس قدر بار ہیں سماعت پر
○
ناسناسوں کی محفل میں اے لغز گرا
فن کو روانہ کر فن کو رسوا نہ کر



دیریاں بے میری شام، پریشاں میری نظر
 اچھا ہوا کہ تم نہ ہوئے میرے ہم سفر
 کوئی صدا نہیں کہ مجھے زندگی کہوں
 منہ سے ہے غمِ غمِ دل کی رہ گزرد
 لو اب تو شورِ نالہ و نرا یادِ بھم گئی
 میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر
 اے میرے ماہِ تاباں چھپ گیا ہے تو
 تجھ بن بجے بجے ہیں محبت کے بامِ دُر
 تیرے بغیر کتنی فُسر رہے ہیں شعر
 اے دوست اپنے صوف میں غزل کہو دیکھ کر
 میں تیرے لیے رُخ کو بھی سمجھوں گا اوقات
 پیارے میرے قریب سے اک بادِ پھر گزر
 جالت مجھے تو ان کے گریاں کی نگر ہے
 جو ہنس رہے ہیں میرے گریاں کے چلک پر

کتنا سکوت ہے رن و دار کی طرف
 آتا ہے کون جراتِ اظہار کی طرف
 دشتِ وفا میں آبلہ پا کوئی اب نہیں
 سب جا رہے ہیں سایہ دیوار کی طرف
 تفرشی سے کتے ہیں نکلے گا مسر نو
 اہلِ خرد ہیں اس لئے سرکار کی طرف
 دُشنام و کور یا سے عدد کو نکالیں
 انیس کے نوٹ کر لب و رخسار کی طرف
 باقی جہاں میں رہ گیا غائب کا نام ہی
 ہر چند اک نجوم تھا افسار کی طرف



کوئی نگہ غبار میں تیری مٹی کے لوگ
 تو بھول ہے شراب میں تیری مٹی کے لوگ
 تو رونقِ حیات ہے تو حسنِ کائنات
 اجڑا ہوا دیار میں تیری مٹی کے لوگ
 تو پیکرِ وفا ہے مجسمِ خلوص ہے
 بدنام روزگار میں تیری مٹی کے لوگ
 روشن تے حال سے ہیں مہر و ماہ بسی
 لیکن نظر پہ بارہیں تیری مٹی کے لوگ
 دیکھو جو غور سے توڑ میں سے بھی پرت میں
 یوں آسماں شکار میں تیری مٹی کے لوگ
 پھر جا رہا ہوں تیرے تہ کوٹ کر
 ہر چند ہوشیار ہیں تیری مٹی کے لوگ
 کھو جائیں گے سحر کے اجالوں میں آنِ خوش
 شمعِ سحر مزار میں تیری مٹی کے لوگ



تیری بھگی ہوئی آنکھیں ہیں مجھے یاد آئیں
 تو اسی طرح خیالوں میں ہے آباد آئیں
 تو عمرے ساتھ ہمیشہ رہی دھڑکن دھڑکن
 تجھ کو بھولا نہیں لے جاں دلِ ناشاد آئیں
 انسانوں پر وہی پہرے ہیں ستم گاروں کے
 وہی جہنمیں پہ ہے سہمی ہوئی فریاد آئیں
 اپنا افسانہ غم کس کو سناتے جا رہے
 ہم تو سنتے رہے اوروں ہی ردا و تاب آئیں



جدھر جاؤں وہی متاقل مقابل
یہ صورت کب تک تھی لے دل مقابل
فسوں ٹوٹنا نہ بڑھتے فاصلوں کا
وہی ہے دوری منزل مقابل
عذابِ عیدِ رفتہ سہہ چکے ہیں
اور اب ہے خوفِ مستقبل مقابل
عجب صرائے حیرت چار سُو ہے
نہ طو ناں ہے نہ ساحل مقابل
زمین کو آسمان کہنا نہ آیا
ہمیشہ یہ رہی مشکل مقابل
بچا کر ذہن و دل نکلیں کہہ رہے
کہ ہیں ہر کام پر جہاں مقابل
یہ کہہ کر دل کو سمجھاتے ہیں کہ
ہے گاکب تلک باطل مقابل



پھر دل سے آرہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل
کب تک نہیں ہوا ہے کوئی شعر کام کا
یہ شعر کی نہیں ہے نص اس گلی میں چل
وہ بامِ دور وہ لوگ وہ رسوائیوں کے جڑم
ہیں سب کے سب عزیزِ خد اُس گلی میں چل
اُس بچوں کے بغیر بہت جی ادا ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا اس گلی میں چل
دنیا تو چاہتی ہے یہ نہیں فاصلے ہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جہاں اس گلی میں چل
بے نور و بے اثر ہے یہاں کی صلائے ساز
تھا اس سکوت میں بھی مڑا اس گلی میں چل
جالت پکارتی ہیں وہ شطرناسیاں
یہ سُر و نت یہ سرد ہوا اس گلی میں چل



اس کوئے علامت پہ ہی موت تو نہیں ہے
 ہر شہر میں آوارہ و بد نام رہے ہم
 کس شوق سے بڑھتے ہے ہر شخص کی جانب
 ہر شخص سے محسوس بہر گام ہے ہم
 اک عمر ہے منتظر غیب بہا ہاں
 اک عمر اسیر غلش خام ہے ہم
 ہم کہہ نہ سکے کھل کے کوئی بات کسی سے
 ہر گام پہ لذت کشا بہام ہے ہم
 کیوں اپنا ملت نہ بنے عارض و گیسو
 اس منکر میں سوزاں سحر و شام ہے ہم
 اس بھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
 اس بھول کو چھونے میں بھی ناکام ہے ہم



فرے ہی بھی کوہ سے نکرا تو گئے ہم
 دل لے کے سرِ عرصہ غم اتو گئے ہم
 اب نام ہے یا نہ ہے عشق میں اپنا
 زوداد و نداد پہ دہرا تو گئے ہم
 کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں گئے تا
 جو جاں سے گزر کر انھیں جھٹلا تو گئے ہم
 جاں اپنی گنوا کر کبھی گھس اپنا جلا کر
 دل اُن کا ہر اک سہ پہلا تو گئے ہم
 کچھ اور ہی عالم تھا پس چہرہ یاراں
 رہتا جو یونہی راز اُسے پا تو گئے ہم
 اب سوچ ہے ہیں کہ یمن ہی نہیں ہے
 پھر اُن سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم
 انھیں کہ نہ انھیں یہ رمضان کی چہ جالب
 لوگوں کو سہوارِ فخر آ تو گئے ہم



کئی اب کئی منزلِ شامِ غم
 بڑھائے چلو پاؤں گارو قدم
 ہمیں سے فروزاں ہے شمعِ وفا
 ہمیں نے بھرا ہے محبت کا دم
 کہیں یا اس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
 کہیں آس کے رک نہ جائیں قدم
 پڑے گا زمانہ بڑے شوق سے
 کیے جہازوں دل کی کہانی رستم
 بدل جائے گا دیکھتے دیکھتے
 یہ عہدِ خسروانی یہ عہدِ بستم
 نکلنے کو ہے آفتابِ حسر
 شبِ تار ہے بس کوئی اور دم
 اٹھا کر اندھیروں کا نام و نشان
 اجالوں کی بستی بسائیں گے ہم



نہ کوئی شب ہو شبِ عیش یہ سوچتے ہیں ہم
 کسی کی آنکھ نہ ہو نسیم یہ سوچتے ہیں ہم
 نگار گزار نہ ہو کوئی چشمِ ساقی کا
 کسی پہ لطف نہ ہو کم یہ سوچتے ہیں ہم
 کسی کے لب پہ نہ ہو داستانِ تشنہ لبی
 زمیں پہ کوئی نہ ہو جم یہ سوچتے ہیں ہم
 زمیں پہ آگ نہ برے فسادِ محبے
 پیا نہ ہو کہیں ماتم یہ سوچتے ہیں ہم
 کرے نہ کوئی زمانے میں جنگ کی باتیں
 جھکے زامن کا پرچم یہ سوچتے ہیں ہم
 کسی کا حق ہے سمنڈ پہ اور کوئی پایا
 یہ کیا ہے کیوں ہے یہ عالم یہ سوچتے ہیں ہم
 سفر ہے شب کا دل بہنِ راز بچے نہ کہیں
 لگن کی ٹونہ ہو مدھم یہ سوچتے ہیں ہم



ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم



ہزار زیر قدم راستہ ہوناروں کا
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم
اسی لئے تو نہیں معتبر زمانے میں
کہ رنگ صورتِ دنیا نہیں بدلتے ہم
شاہد بقیدِ زبیت یہ ساعت نہ کے
تم داستانِ شوقِ سناور سنائیں ہم
بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھونڈ جائیں ہم

اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جانبِ چلو کہیں سے اُسے نہونڈ لائیں ہم



اپنوں نے وہ رنج دیتے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
 دیکھ کے اس بستی کی حالت دیرانے یاد آتے ہیں
 اس نگری میں قدم قدم پرست کوٹھکا کا پڑتا ہے
 اس نگری میں قدم قدم پر بت خانے یاد آتے ہیں
 آنکھیں پُرم ہو جاتی ہیں غربت کے صحرؤں میں
 جب اس رم جھم کی دادی کے افسانے یاد آتے ہیں
 ایسے ایسے دروٹے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
 بچھڑے ہوئے کچھ لوگ پلانے یا لانے یاد آتے ہیں
 جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنسی ہے
 کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں
 یوں نہ بنی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے ٹہنوں کی
 روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں

کوئی تو چرچس لے کر نکلتے اپنے گریباں کا جالت
 چاروں جانب سنا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
 اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں
 اب تذکرۂ خندہ نگل باد ہے جی پر
 جاں وقفِ غم گریہ شبنم ہے مری جاں
 رُخ پر ترے بھری ہوئی یہ زلفِ سیہ تاب
 تصویر پریشانی عالم ہے مری جاں
 یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
 یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرم ہے مری جاں
 ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا قسط
 بایکس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں
 یہ تیرسی توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
 ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں
 اے نرہت مہتاب ترا غم ہے مری زبیت
 اے نازش خورشید ترا غم ہے مری جاں



اس رخنہ سے دو جیتے ہیں کہ مرنا ہی نہیں
 تخت پر بیٹھے ہیں یوں جیسے ترنا ہی نہیں
 یوں مرد و انجم کی دادی میں اڑے پھرتے ہیں
 خاک کے ذروں پہ جیسے پاؤں دھڑا ہی نہیں
 اُن کا دعویٰ ہے کہ سبج بھی انہی کا ہے غلام
 شب جو ہم پر آئی ہے اس کو گنہ گار ہی نہیں
 کیا علاج اس کا اگر ہو مہمان کا یہی
 اہتمام رنگ و بو گلشن میں کرنا ہی نہیں
 ظلم سے میں برسرِ پیکار آزادی پسند
 اُن پر سازوں میں جہاں پر کوئی بھڑنا ہی نہیں
 دل بھی اُنکے ہیں بس یہ خوراکِ زنداں کی طرح
 ان سے اپنا غم ہی نہ اب ہم کو کرنا ہی نہیں
 انتہا کر لیں ہستم کی لوگ ابھی ہیں خواب میں
 جاگ اٹھے جب لوگ تھے اُن کو بھڑنا ہی نہیں



اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
 کتے بے نور ہیں دیار یہاں
 روشنی روشنی، چپات چپات،
 ہر طرف ہے یہی پکار یہاں
 راستہ کیا سمجھاؤ اے دوست
 بٹل بے شمع رہسگزار یہاں



اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
 اے غم جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں
 تیرے باوجود سے دور تیرے دگر سے دُور
 رات کی سیاہی ہے تیرے گی کے ساتھ ہیں
 اُس نگاہ سے جا بے رسم و راہ کی خاطر
 ہم نے کم ہنگاموں کے ناز بھی اٹھائے ہیں



اگر دامن نہیں ان کا مینر
کسی دیوار سی سے لگے زلیں

ملے رونے سے زنت تو کسی شب
ساراں کی حسیں چھاؤں میں سلیں



اور کیا اس کے سوا چاہتے ہیں
نوعِ انساں کا بھلا چاہتے ہیں

اُن کی دانست پہ آتی ہے ہنسی
جو ہماری بھی دُعا چاہتے ہیں

کتنے ناداں ہیں کہ ہر قاتل سے
اپنے ہم کھ کھی دوا چاہتے ہیں

ہم بھی غالب کی طرح اے غالب
نہ ستائش نہ صلا چاہتے ہیں

نگاہوں کی زباں کوئی جو سچے
محفلِ کبھی ہم لب کھولیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل
چلو ہم جی کسی کے ساتھ ہو لیں

کوئی جو آبے دل میں تو غالب
بہمی اس گھ کے دروازے نہ کھولیں



اے دل وہ تھارے لیے بے تاب کہاں ہیں
دھندلائے ہوئے خراب ہیں احباب کہاں ہیں
ان پر بھی شبِ غم اسی صُوت ہے مسلط
اپنی ہی طرح وہ بھی سکوں یاب کہاں ہیں
آتے ہیں نظر بے سرو ساماں ہی نفس میں
حاکمِ جنس بننا ہے وہ نواب کہاں ہیں
اب نالہ و شہین کی صدائیں نہیں آتیں
اے درد کی شب وہ تجھے بے تاب کہاں ہیں
دن ہی کوئی درکشن نہ کوئی راستہ منور
خورشید کہاں ہیں مے مہتاب کہاں ہیں
تو شکوہ سرا ہے تو کبھی آہ بہ لب ہے
ننداں کے مری جان یہ آداب کہاں ہیں
وہ جامِ بکفِ شام نہ وہ صحبتِ یاراں
جینے کے ترے شہر میں اسباب کہاں ہیں



باتیں تو کچھ ایسی ہیں کہ خود سے بھی کی جائیں
سوچا ہے غموشی سے ہر اک زہر کو پی جائیں

اپنا تو نہیں کوئی وہاں پر چھنے والا
اُس بزم میں جانا ہے جنھیں اب وہی جائیں

اب تجھ سے ہیں کوئی تعلق نہیں رکھنا
اچھا ہو کہ دل سے تری یادیں بھی چلی جائیں

اک عمر اٹھتے ہیں بزمِ غیر کے ہم نے
اپنوں کی تو اک پل بھی جنائیں نہ بھی جائیں

جائے بزمِ دوراں ہو کہ یادِ رُخ جاناں
تنہا مجھے بنے دیں مے دل سے بھی جائیں



جہ مرزگاہ اٹھائیں کھلے کنول دیکھیں
غزل کہیں کہ مری جان ہم غزل دیکھیں



جنہیں ہم چاہتے ہیں والہبہ
وہ اپنے فتلوں کو چاہتے ہیں

ہیں آسانیاں کیوں ہوں میسر
کہ ہم خود مشکوں کو چلتے ہیں

ہیں ہے عشق بڑھتے فاصلوں سے
گریزاں منزلوں کو چاہتے ہیں

وہی جمال وہی تمکنت وہی اعجاز
ہزار بیل اے دیکھیں کہ ایک پل دیکھیں

خیال مرگہ و فانی بچا لیا ہم کو
کہا جو دل نے کبھی راستہ بدل دیکھیں

جہاں ہماری جواں حسرتوں کا خون ہوا
چلو کہ چل کے وہی کوچہ اجسل دیکھیں

کئے ہوئے ہیں دل و جاں نثار ہم جن پر
ہمارے ساتھ کریں کیا سلوک سب دیکھیں

قدم قدم پر لٹے ہیں جو لوگ اے چالبت
وہ طلب میں ہمارے بھی ساتھ چل دیکھیں



درد کی دھوپ ہے خوف کے سائے ہیں
اپنی منزل تھی کیا اور کہاں آئے ہیں

دل تھا پہلے ہی پھلنی غم دہرے
زخم تیری جسدِ الٰہی کے بھی کھائے ہیں

سب کو فکرِ گریباں ہے اس عہد میں
ایک اہلِ جنوں ہم ہی کہلائے ہیں



جیون مجھ سے میں جیون سے شایاں ہوں
مجھ سے آگے جگنے والو میں آتا ہوں
جن کی یادوں سے رشن ہیں میری آنکھیں
دل کہتا ہے ان کو بھی میں یاد آتا ہوں
سُکھ سانسوں کا نانا ہے تو زردن کیے
تم جلتے ہو کیوں جیتا ہوں کیوں گاتا ہوں
تم اپنے دامن میں سناے بیٹھ کے نانا کو
اور میں نئے برن لفظوں کو پہنتا ہوں
جن خوابوں کو دیکھ کے میں نے جنیا سیکھا
اُن کے آگے ہر دولت کو ٹھکراتا ہوں
زہرا لگتے ہیں جب مہل کر دنیا والے
میسے بولوں کی دادی میں کھوجتا ہوں
جستِ میرے شمعِ سحر میں آ جتے ہیں
اِس لیے کم تر شبِ اے کہلاتا ہوں



دل کی بات لیوں پر لاکر اب تک تم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس سبق میں دل والے بھی تھے ہیں



زندہ ہیں ایک عمر سے دہشت کے سائے میں
ذم گھٹ رہا ہے اہل عبادت کے سائے میں
ہم کو کہاں تصورِ جہانناں ہوا نصیب
بیٹھے ہیں ہم کہاں کبھی قنوت کے سائے میں
چھوڑا نہ ہم نے نقش کوئی راو عشق میں
گزری تمام عمر ندامت کے سائے میں
بکھرے ہوئے دیارِ دل و جاں کے دوستو
پوچھو نہ دکھ ہے جس جو عزت کے سائے میں
لے رہے روان راہِ حسد ہم کو داد دو
لیتے ہیں سانسِ فکرم کی خلعت کے سائے میں
ہم آئیں گے تو آئے گا وہ عہدِ خوش گوار
گزرے گی جب حیاتِ جنت کے سائے میں

بیت گیا سادہ کا بھینہ موسم نے نظر میں بدلیں
لیکن اُن پیاسی آنکھوں سے اب کُل آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کیلئے یہ ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ چرا بھی اُس راہ گزر سے چاک گریباں گزرتھا
اس آوارہ دیوانے کو جالت جالت کہتے ہیں



شعر بتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی شینوں میں
پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں
دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ بھوتے ہیں آستینوں میں
قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آہنگیوں میں
آسمانوں کی خیر ہو یا رب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں
وہ محبت نہیں رہی جالب
ہم صیغوں میں ہم نشینوں میں



شعر شاعری سے ڈرتے ہیں
کم نظر روشنی سے ڈرتے ہیں
وگ ڈرتے ہیں دشمنی سے تری
ہم تری دوستی سے ڈرتے ہیں
دہر میں آہ بے کراں کے سوا
اور ہم کب کسی سے ڈرتے ہیں
ہم کو غیروں سے ڈر نہیں لگتا
اپنے احباب ہی سے ڈرتے ہیں
داؤد حشر بخش لے شاید
ہاں مگر مولوی سے ڈرتے ہیں
دو ٹھٹھا ہے تو روٹھ جائے جہاں
ان کی ہم بے رخی سے ڈرتے ہیں
ہر قسم پر ہے معتب جالب
اب تو ہم چاندنی سے ڈرتے ہیں



شہر ویراں ادا کس ہیں گلیاں
 رگہ زاروں سے اُنھ رٹے حواں
 آتشِ غم میں جل رہے ہیں دیار
 گردِ آلودہ رُحِ دوراں
 بستیوں پر غموں کی یورش ہے
 قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں
 صبح بے نورِ شام بے مایہ
 لٹ گئی دولتِ نگاہ کہہاں
 پھر رہے ہیں طغیورِ آوارہ
 برقِ ہر شاخ پر شعلہ فشاں
 میری تنہائیوں پہ صومٹِ شمع
 ردِ اسے الم نصیبِ سماں

میسے کشانوں سے تیری زلفوں تک
 فاصلہ عمر کا ہے میری جاں

فرضی مقدمات ہیں جھوٹی مشہادتیں
 ہم پھر بھی بکھ رہے ہیں جُنوں کی حکایتیں
 جُسم کی اب نشان دہی کون کر سکے
 اب تک ہیں بند اہلِ قلم کی عدالتیں
 زنجیر پا جو توڑ رہے ہیں قفسِ نصیب
 ہیں اہلِ آشیاں کی نظر میں بغاوتیں
 پہنچے ہیں اہلِ جورِ صلیبیں لیے ہوئے
 آئی ہیں جب بھی سامنے کھل کر واقعتیں
 جو لوگ جھوٹے ہیں پڑے تھے پڑے رہے
 کچھ اہلِ زر نے اور بہن لیں عسارتیں
 آیا ہی چاہتا ہے اب اہلِ حسد کا زور
 مسند نشین رہیں گی کہانِ مکہ جہالتیں
 جانبِ بزرگ کیوں ہیں خفا بات بات پر
 کرتا رہا ہے یوں ہی لڑکپنِ شہزادیتیں



زمانہ تو یوں ہی روٹھا ہے گا
چلو جالب انہیں چل کر مٹالیں



کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں،
بیتے بچتے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
چہرے جو کبھی ہم کو دکھائی نہیں دیں گے
آ آ کے قصور میں نہ تڑپائیں تو سوئیں
برست کی ریت کے وہ طرب ریز مناظر
سینے میں نہ اک آگ سی بجڑ جائیں تو سوئیں
صحوں کے مقدر کو جگاتے ہوئے مگھرے
آپنل جو رنگا ہوں میں نہ لہرائیں تو سوئیں
محسوس یہ ہو تلے ابھی جاگئے ہیں
لاہور کے سب یا ابھی سو جائیں تو سوئیں

کبھی تو مہرباں ہو کر بلا لیں
یہ مہوش ہم فقیروں کی دعا لیں

نہ جنے پھر یہ رت آئے نہ آئے
جواں پھولوں کی کچھ خوشبو چرائیں

بہت بڑے زلمے کے لیے مہم
ذرا اپنے لیے آنسو بہائیں

ہم ان کو بھولنے والے نہیں ہیں
سمجھتے ہیں غم دوراں کی چالیں

ہماری بھی سنبھل جائے گی حالت
وہ پہلے اپنی زلفیں تو سنبھالیں
نکلنے کو ہے وہ محبت اب گھر سے
ستاروں سے کہنہ نظر میں جھکالیں

ہم اپنے راستے پر چل رہے ہیں
جناب شیخ اپنا راستہ لیں



کراہتے ہوئے انسان کی صدا ہم ہیں
میں سوچتا ہوں سرری جان اور کیا ہم ہیں



موسیٰ سے مل جلنا زار مت کہو سائیں
یہ وقت جیسے بھی گزرتے گزار لو سائیں
وہ اس طرح سے میں بچنے کے بل نہیں سکتے
وہ اب آئیں گے ان کو صدائے دوسائیں
تمہیں پیار دیتے ہیں صبا کے ہاتھ بہت
تمہارے شہر میں ہیں تم جو آس کو سائیں
نہ مال و زر کی تمنا نہ جہاد و حشمت کی
میں گے پیار سے ہم ایسے لوگ تو سائیں
کہیں تو کہیں سے کہیں اور نئے تو کون سننے
گزر گئی ہے محبت میں ہم پہ چسپائیں
اکیلے جگتے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا
تمام خواب میں ہیں تم بھی زبرد سائیں

جو آج تک نہیں پہنچی خدا کے کافون تک
سر دیارِ ستم آہ زار سا ہم ہیں!

تب ہیوں کو مقدرِ سبوح کے میں غلغلو
ہمارا غم نہ کرو دردِ لا دوا ہم ہیں

کہاں نگہ سے گزرتے ہیں دکھ بھر دہشت
حسین شہزادوں کے ہی غم میں مبتلا ہم ہیں

میان تک ہے تگم دو میان چھپ جائے
کہ آمرانہ قوانین سے خفا ہم ہیں

ازل سے سلب ہیں جالبِ حقوقِ انسانی
نظر جھکاتے ہوئے مائلِ دعا ہم ہیں

بنایا آپ اسے جانا ہے پر ایسے
بن کر تھی نہیں قسمت یونہی تو



مشکلیں دنیا میں اوروں کی تو آساں ہو گئیں
بند کمروں میں سلگتے ہم کو صدیاں ہو گئیں
ریانا آشنا تو بھی ہے ہمدم
نفس میں ہے مری صوت یونہی تو

اپنے پہلو میں لیے پھرتے ہیں دل کی لاکش کو
زندگی کی حسرتیں خواب پریشاں ہو گئیں
نہیں حق پھینکتے ہم غاصبوں سے
مقدر میں ہے ہر ذلت یونہی تو

اب بھی شمس نہ نہیں ہیں لوگ اپنی سوچ پر
شہراجکے بستاں کہتی ہی ویراں ہو گئیں
بھکاری ہیں زمانے کی نظریں
کوئی کرتا نہیں عزت یونہی تو
ہیں قصر اُن کے ہماری ہڈیوں پر
مجھے شاہوں سے ہے نفرت یونہی تو



ملا کرتی نہیں عظمت یونہی تو
یہ ہاتھ آتی نہیں دولت یونہی تو
علاج اس میں نہیں رب کے دکھوں کا
نظام زر سے ہے نفرت یونہی تو

وفا کی ہے سدا اہل جنوں سے
نہیں حاصل ہوئی شہرت یونہی تو



میں تو باپوس نہیں اہل وطن سے یارو
کوئی ڈرتا نہیں اب دارورسن سے یارو
پھول دامن پر سچلے یہ پتھر تے ہیں لوگ
جن کو نسبت ہی نہ تھی کوئی چین سے یارو
سینہ قوم کے ناسور ہیں یہ پھول نہیں
خوف سائلے لگا سڑوسن سے یارو

ظلم کے سر پہ کبھی تاج نہیں رو سکتا
یہ صدائے لگی کوہ و دمن سے یارو
منزل کیف و طبر اپنے قدم چومے گی
ہم گزرا آئے ہیں ہر رنج و محن سے یارو

کتنے خاموش تھے چپ چاپ تھے رستے گلیاں
یہ زمین بول اٹھی میسر سخن سے یارو
ملک میں عام کریں اپنے مسلم کی دولت
یہ گزارش ہے مری اہل سخن سے یارو

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محرم شائے سہراہ گزر ہیں
حسرت سی برستی ہے دریا پیر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سکتے ہوئے گھر میں
اے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند وہ سورج وہ شب و روز کدھر ہیں
سے ہو گئی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہ رواں کیا یہی انداز سفر ہیں
وہ لوگ قدم جن کے لیے کابکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہمنفس ہم سے بتر ہیں
بیک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سہراہ
ہم یوسف کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں
ہم ٹوک ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہت مہتاب ہیں ہم نور سحر ہیں



میں غزل کہوں تو کیسے کہ جدا میں نری ہیں
 مرے بارگزار تھو مرے کس پاس آہیں
 نہ وہ عدا منوں کی مصیبتوں کو گونگی نہیں
 کہیں دور ہو گئی ہیں مے شوق کی پہنائیں
 نہ فریب دے سکے گی ہیں آپسی کی چٹ
 کہ رلا چکی ہیں ہم کو تری کم سخن بٹکا ہیں
 کہیں گیس کا دھواں ہے میں گریوں کی لہڑ
 شب جمہد کم بٹکا ہی تجھے کس طرح سرا ہیں
 کوئی دم کی رات ہے یہ کوئی پل کی بات ہے
 نہ ہے کہ کوئی قاف نہ دیں گی تزلزل ہیں
 میں زمیں کا آدمی ہوں مجھے کا کہنے میں
 یہ نلک پہننے والے مجھ جاپیں یا نہ چاہیں
 نہ مذاق اڑا سکیں گے مری مفلس کیا بات
 یہ بلند جا ایواں عظیم بارگاہ ہیں



میں چپ بپوں نغداد ڈیتے خورشید سے پوچھو
 کس کر بے کس حال میں کس طور کت دن
 تو آج بھی کم ہونہ سکی یاس کی غلٹ
 تو آج بھی بیکار گب آس بھرا دن
 یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
 یہ بات ہی کیا کہ ہے یہاں بیت گیا دن
 یہ کون سی بستی ہے جہاں چاند نہ سورج
 کس درجہ بری رات ہے کس درجہ بُرا دن
 غلٹ کہہ زیت میں پھر دیکھیے کہ آئے
 تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہوا دن
 اس شہر سے دور آ کے جو نہ دیکھ رہے ہیں
 دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دن



خدا کا نام کوئی نے تو چرنک اٹھتے ہیں

طے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

کہیں سلاسلِ تسبیح اور کہیں تہنار

بچے ہیں دامِ بہت مند کے رستے میں

ابھی وہ منزلِ فکر و نظر نہیں آئی

ہے آدمی ابھی حرم و سزا کے رستے میں

ہیں آج بھی وہی دار و رسن وہی زنداں

ہر اک نگاہِ رموزِ آشنا کے رستے میں

یہ نفسِ قوت کی فیصلیں جہالتوں کے حصار

نہ رہ سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں

مناسکے نہ کوئی نسلِ انقلابِ حقیقیں

وہ نقشِ چھوٹے ہیں ہم نے رونما کئے رستے میں

زمانہ ایک سا جاہلِ سدا نہیں رہتا

چلیں گے ہم بھی کہیں سرِ اٹکا کے رستے میں

نگاہوں کے قفس میں اور ہوں چروں کے زنداں میں

اگر ہو میرے بس میں تو نکلیں جاؤں بیاباں میں

جسے پیئے ہمیں اس شہر میں دیوانہ کہتا ہے

نہ جانے کیا خرابی ہے مری جاں عشقِ انساں میں

ترجم کی نگاہوں سے نہ مجھ کو دیکھ لے دنیا

رہا ہے ہاتھ میسر ابھی ہر اک شے کے گریباں میں

وہی ہیں صاحبِ توفیق بھی یاد کہ مرحبا تیں

سنا کر شعر و کلمہ ہوتا ہے بزمِ انساں میں

کہیں سے بھی صدائے نالہ و شہیون نہیں آتی

عجب اک ہو کا عالم ہے دیارِ درمنداں میں



نہ ڈگمگائے کہیں ہم دفن کے رستے میں

چراغِ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

کے نگائے نگے اور کہاں کہیں شہر کے

ہزار غنچہ گل ہیں صبا کے رستے میں



ہر گام پر تھے سس دس سراس دیار میں
 کتے حسین تھے شام و سراس دیار میں
 وہ باغ وہ بہار وہ دریا وہ سبزہ زار
 نشوں سے کھلتی تھی نظر اس دیار میں
 آسان تھا سفر کہ ہر اک رکزار پر
 ملتے تھے سایہ دار شجر اس دیار میں
 ہر چند تھی وہاں بھی غزاں کی اس صوب
 دل پر نہیں تھا غم کا اثر اس دیار میں
 محسوس ہو رہا تھا سارے میں گزراہ
 ہم تھے ہزار خاک بسر اس دیار میں
 جالب یہاں تو بیت گریبان تک آگئی
 رکھتے تھے صبر چاک جگر اس دیار میں



وہ جن کی رختوں کے سامنے ہے گرد آساں
 تھے دیار میں ہیں صوٹ مستاع رائیگاں
 یہیں ٹھہر یہیں ٹھہر میں آ رہا ہوں میری طاں
 بلارہا ہے اک ذرا سی دیر کو غم جہاں
 فریب نگہ بوز نہ کھا ابھی چمن چمن کہاں
 ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں
 چلو دیا غم و شباب میں پناہ لیں
 بسمت کے آگئی ہیں دل میں جہاں کی نین
 چلو غزل کے شہر میں چلو طرب کے دیں میں
 چلو نگاہ کو نگاہ کی سنائیں داستاں



ہم نے نہ تھا محن چمن میں کیف کے بدل چھلے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہنے لاکھ بہا کر آئے ہیں
پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان بس
ایک سمھارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے تیر
ایک سنگتی یاد چمکتا دردِ مریزاں تنہائی
پوچھ نہ اس کے شے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں
سوئے ہوئے جو درد تھے دل میرا نہیں کر سکتے تیر
رات تاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا آئے تیر
آج بھی سوچ ڈوب گیا بے نور افق کے ساگر میں
آج بھی پھول چمن میں بخت کو بن دیکھے مچھلے ہیں
ایک قیمت کا سناٹا ایک بلا کی تیر
اُن گلیوں سے دور نہ ہنسا چاند نہ روشن سائے ہیں

پیار کی بولی بول نہ جالب اس تہی کے لڑگوں سے
ہم نے سکھ کی کہیاں کھو کر دکھ کے کانے پائے تیر



ہم لڑیں امر کیوں کی جنگ کیوں
اور کریں اپنی زمیں خوں رنگ کیوں

روشنی کے ہم تو خود ہیں منتظر
روشنی پر ہم اٹھائیں سنگ کیوں

اے ستم گر تو نے سوچا ہے کبھی
جُتھ سے ہے ساری خدا کی تنگ کیوں

امن و آزادی کے ہم تو ہیں یقیب
بول کسی غاصب سے ہم آہنگ کیوں

کوشش کے باوجود بھلائے نہ جائینگے
ہم پر جو دوستوں نے کیے ہیں کرم یہاں

کہنے کو ہم سفر میں بہت اس دیار میں
چلتا نہیں ہے ساتھ کوئی دو قدم یہاں

دیوارِ یار ہو کہ شہستانِ شہرِ یار
دوپل کو بھی کسی کے نہ سائے میں تھم یہاں

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہو چکی
لے چشمِ غم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

صدِ حیف جن کے دم سے پریشیاں آؤں
سب کی نگاہ میں ہے وہی محترم یہاں

نظمیں اُداس اُداس فسانے تجھے تجھے
مدت سے اشکبار میں لوحِ قلم یہاں

اے ہم نفس یہی تو ہمارا قصور ہے
کرتے ہیں دھڑکنوں کے فسانے قلم یہاں



ہم ہی جب آئیں گے تو بنے گی بات میاں
ورنہ رہیں گے دکھ کے یہی حالات میاں

اب نہ بہیں گے آنسو پیاسی آنکھوں سے
رد و کر کا کافی ہے بہت برسات میاں

صبح کی کرنیں ہر آنکھ میں ناچیں گی
اور کوئی دم کی ہے یہ غم کی رات میاں

پھر نہ کرے گا کوئی بھی شکوہ قسمت کا
باگِ ذور آئے گی جب اپنے مات میاں

دکھیاروں کا راج اب آنے والا ہے
ہر ظالم کی ہوگی بازی مات میاں



یہ زندگی گزار رہے ہیں جو ہم یہاں
یہ زندگی نصیب ہے لوگوں کو کم یہاں



قصر کے زنداں سے اے فرصت ملے تو آئے بھی
جاں نسنرا باتوں سے آکے میرا دل بے سلائے بھی



لگ کے زنداں کی سلاخوں سے مجھے دیکھ لے
کوئی یہ پیغام میرا اس تملک پہنچائے بھی

آج ہمارے حال پر بنس کو شہر کے عزت دار
کل کو مٹھائے حال پر ہم کو اشک بہانے ہوں گے
ابھی کہاں تکمیل ہوئی ہے اپنے جنوں کی پیلے
اور ابھی لڑکوں کے ہاتھوں پتھر کھلنے ہوں گے

ایک چہرے کو ترستی ہیں نگہیں صبح و شام
غوفشاں خورشید بھی ہے چاندنی کے سائے بھی
بسکیں یقی ہوائیں پھر رہی ہیں دیر سے
آنسوؤں کی رت ملے اب گلستاں سے جانے بھی

اور ابھی تو بین محبت قدم قدم پر ہوسگی
اور ابھی بے درد جہاں کے ناز اٹھانے ہوں گے
تم تو کسی کو بھٹوے سے بھی یاد نہیں آؤ گے
آنے والے عہد کے لب پر اپنے افسانے ہوں گے

روز ہنستا ہے صلیبوں سے ادھر مہر ماہ منیر
اکس کے پیچھے کون ہے وہ چہرے مجھے دکھائے بھی

تم نے بھی تو محفل میں سرباب کی باتیں کہہ دیں
شہر میں جالب تم سے بھی کم ہی دیوانے ہوں گے



اُٹھتا ہوا چمن سے دھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقص برق تباں دیکھتے چلو

نشئی ہوئی متاعِ بیاں دیکھتے چلو
کنتی ہوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو

برسوں سرِ رخِ وہم و گماں دیکھتے چلو
منٹا ہوا یقیں کا نشان دیکھتے چلو

اپنے سے کچھ کہو نہ پرانے سے کچھ کہو
دل سوز و دل گداز سماں دیکھتے چلو

جلتا ہوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

تو بین اہلِ حسن کرتے تضحیکِ اہلِ شوق
سب کچھ مجرمِ زیلت یہاں دیکھتے رہو

ہر چہ نہا پسند ہو تھیں ناشناس
چپ چاپ شعریت کا زیاں دیکھتے چلو

اس شہرِ تیرگی میں بنگاہِ خموش سے
شب دوستوں کو رقصِ کناں دیکھتے چلو

جگنے والو تا پھر خاموش رہو
کل کیا ہو گا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سحر کے پاؤں میں بنجیریں ڈالیں
ہو جانے گی رات بس خاموش رہو
کس نے سنی ہے اس بقی میں ل کی بات

کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو
شاید چپ رہنے میں عزت و جلے

چپ ہی بھلی لے اہلِ نظر خاموش رہو
قدم قدم پر پہرے میں ان راہوں میں

دار و رسن کا ہے یہ نگر خاموش رہو
یوں بھی کہاں بے تابی دل کم ہوتی ہے

شہر کی باتیں ختم ہوئیں اس عالم میں
کیا بوجش اور کس کا جگر خاموش رہو



جہاں خطے میں ہے اسلام اس میدان میں جاؤ
 ہماری جان کے لیے ہو کیوں لبستان میں جاؤ
 دھواں ہے خون ہے چینی ہیں اور لاشیں ہی لاشیں ہیں
 بتم کی آندھیوں میں ظلم کے طوفان میں جاؤ
 کتا لے سے کہاں ہوتا ہے اندازہ تلاطم کا
 ذرا موجوں سے ٹکراؤ ذرا طغیان میں جاؤ
 فقط تشویش ہی سے ظلم کا سر جبک نہیں سکتا
 یہاں جولا نیاں کیا خطہ جولان میں جاؤ
 کیے ہیں غاصبوں نے ظلم وہ اہل فلسطین پر
 قیامت کا سماں ہے خانہ جب ان میں جاؤ
 اجازت مانگتے ہیں ہم بھی جب بریت جانے کی
 تو اسلحہ فرماتے ہیں تم زندان میں جاؤ
 دل ان کیوں دل ہی دولت یوں بیکار لاتے ہو
 کیوں اس اندھاری سببی میں مار کی جیت جگتے ہو
 تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں کونئی نہیں
 پھر ان گلیوں میں جاتے ہو گپ گپ گھوڑ کر کھاتے ہو
 سندیکہ کو گول پھولو نہ تو بتاؤ یہ تو کبھو
 آخر تم میں کیا جانے ہے کیوں من میں جس جاتے ہو
 یہ موسم ہم موسم کا موسم یہ برکھا یہ مست فضا
 ایسے میں آؤ تو جانیں ایسے میں کب آتے ہو
 ہم سے کون کھچے جانے والو اتنا مجھ سے تاجراؤ
 کیوں نہ راتوں کو سپہنوں پر کتے جوں جاتے ہو
 چاند ستاروں کے جھرمٹ میں پھولوں کی تمنا میں
 تم چھپ چھپ کہتے ہنستے ہو تم دیکھا مان بڑھاتے ہو
 چلتے پھرتے روشن ستے تار کی میں دھبے
 سو جاؤ اب جاب تم بھی کیوں انھیں سنا گئے ہو



شب کو چاند اور دن کو سورج بن کر ٹپ دکھاتی ہو
پل چھن آنکھوں کی گھیر میں تم آپنل لہراتی ہو

تم سے جگ اجبا سہرا روشن ہستی ہستی ہے
سانجھ سیرے ڈیے دینے جیون جوت جگاتی ہو

کتنی روشن ہے تنہائی جس سے یہ معلوم ہوا
میسرے لیے اپنی کچور پر تم بھی دیپ ملاتی ہو

اے میری انمول غنیمت یہ بات بھی محکم پہنچی ہے
یاران لاہور میں اب تک تم میسری کہلاتی ہو

میر ہو غالب ہو یا جانب گیت تمھارے گاتے ہیں
سب کے شعروں میں تم اپنی سندر چھب دکھاتی ہو

لوگوں ہی کا خون بہہ جانا ہے ہوتا نہیں کچھ مسلمانوں کو
طعناں بھی نہیں زحمت دیتے ان کے نیکیں ایوانوں کو
ہر روز قیامت ڈھاتے ہیں تیرے بے مہلتانوں پر
اے خالق انسان تو سمجھا اپنے خونی انسانوں کو
دیواروں میں ہے بیٹھے ہیں کیا خوب مل ہے آزادی
انہوں نے بہایا خون اتنا، ہم بھول گئے بیگانوں کو
اک ایک پل ہم پر بھاری ہے دہشت تقدیر بھاری ہے
گھر میں بھی نہیں مغفرت کوئی باہر بھی ہے خطرہ جانوں کو
غم اپنا بھلائیں جا کے کہاں ہم ہیں اور شہر آہ و فغان
ہیں شام سے پہلے لوگ رداں اپنے اپنے علم خانوں کو
نیکس کو نہ نیکس ان کی رضا بندوق ہے نیکے ہاتھوں میں
سادہ تھے بزرگ اپنے جانب گھر سوپ گئے دربانوں کو



اگ سے پھلی ہوئی کالی گھٹاؤں کی جگہ
بہر دعائیں ہیں لبوں پر اب عاؤں کی جگہ



انتخاب اہل گلشن پر بہت روتا ہے دل
دیکھ کر زار و زغن کو خوش فزاؤں کی جگہ

آج اس شہر میں کل نئے شہر ہیں بل سی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑا تارہا شوقِ آوارگی

کچھ بھی ہوتا پر نہ جوتے پارہ پارہ جسمِ جاں
دائرنِ جوتے اگر ان مسماؤں کی جگہ

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فز کر لوگ تھے
رجسم کھاتا رہا سکا تارہا شوقِ آوارگی

نٹ گئی اس در میں اہل قلم کی آبرو
یہ ہے میرا بھائی بساؤں کی جگہ

کوئی پیمینا گل بہت پہنچا مگر پھر بھی شامِ دھر
ناز باد چمن کے اٹھتا رہا شوقِ آوارگی

کچھ تو آتا ہم کو بھی جاں سے گزرنے کا مژ
غیر جوتے کاش جالِ آبِ شیشہ نازوں کی جگہ

کوئی ہنس کے بے غنچہ دل کھلے چاکِ دل کاٹلے
ہر دم پر نگاہیں بھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلکِ غیب سے نہیں کوئی اپنا نہیں
خاکِ سائے جہاں کی اڑتا رہا شوقِ آوارگی



اس دس کا بنگ انوکھا تھا اس دس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھسکے دیاتھے رواں گیتوں سے بھری ہرالی تھی

اس شہسے ہم آجائیں گے آنکھوں کے ڈیپ جلائیں گے
یہ دور بھی آنے والا تھا یہ بات بھی ہونے والی تھی



وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سُندر من چلیاں یاد آئیں ہر آنکھ دھڑکتی تھی

کس بستی میں آپہنچے ہم ہر گام پہ ملتے ہیں عوِسم
اگر ہے تو بس حسن کی ذات جوت
پھر چلے اس نگری میں ہدم ہر شاہِ جہاں جیالی تھی
اگر ہے تو بس عشق کی بات اچھی

وہ بام و دروہ راگِ نر دل خاکِ بسِ جہاں خاکِ بس
وہ جالت وہ پریشاں حال بھی کیا خوب پریشاں حالی تھی
درِ میکدہ پر ملے شیخِ صاحب
رہی آج ان سے ملاقات اچھی

سبھی بادِ خوار اُٹھ گئے ہیں وہ جالت
کہ جن سے تھی شامِ خرابات اچھی



بہت روشن ہے شامِ غم ہماری
کسی کی یاد ہے مہم دم ہماری

غلط ہے لا تعلق ہیں چمن سے
تمہارے پھول اور شبنم ہماری



یہ پکوں پر نئے آنسو نہیں ہیں
ازل سے آنکھ ہے پر خم ہماری

ہر اک لب پر تبسم دیکھنے کی
تمنا کب ہوئی ہے کم ہماری

کبھی ہے ہم نے خود سے بھی بہت کم
انہ پر چھو داستانِ غم ہماری

دنیا نے وہ دروئیے
بھول گئے ہم ان کی گلی

بول کے جانبِ تدنیکو
اس ماحول میں چپ بی گلی



اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پایندہ ہیں فراق کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ نہیں پایا ہے دیکھے
ادماں ہے کوئی پھول نہیں ملے سکا ہے

اگر صبح مری صبح پر روتی رہی شبِ غم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جانان
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

اُس گلی کے لوگوں کو منہ لگا کے پچھائے
ایک درد کی خاطر کتنے درد اپنائے
تھک کے سو گیا سورج شام کے دھندلوں میں
آج بھی کئی غنچے پھول بن کے مرجھائے
ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرے لگی شبِ غم
تم ہنسے تو گلشن نے تم پہ پھول برسائے
اُس گلی میں کیا کھویا اس گلی میں کب پالیا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے
پھر وہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پھیلتے ہوئے سائے

جالت ایک آوارہ الجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس سلجھائے



اے دوست رہِ زلیست میں زنداںِ درویش کے
اٹے گی سحر، لوگ پریشاں نہ رہیں گے



میداد کے ہم پنجہ بیداد سے ڈر کر
تزمینِ گلستاں سے گریزاں نہ رہیں گے

ہم دہر میں انسان کی عظمت کا نشان ہیں
ہم ہوں گے مگر دشمنِ انسان نہ رہیں گے
بجلیوں کی پورش سے شاخ شاخ لڑاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گھستاں ہے

صدیوں کی سیرِ رات ہے اب ڈھلنے پہ مجبور
اشکوں کے ستارے سرِ رخاں نہ رہیں گے
آج بھی جگا ہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی جگا ہوں میں کائناتِ دیراں ہے

ان قعرِ نشیمنوں سے بے بیزارِ زمانہ
یہ میر و وزیر اور یہ سلطان نہ رہیں گے
تیسے گریہوں ہی پر میری جہاں نہیں موقوف
ذہِ ذہِ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

اک راہ پہ بل کر ہیں چلنے کے بس دیر
کچھ لوگ نمایاں ہیں نمایاں نہ رہیں گے
مل ہی جائے گی منزل کٹ ہی جائے گی شکل
اے مرے نئے ساتھی کس لیے ہراساں ہے

اس دور کے ممتاز ادیبوں کو بستا دو
تاریخ میں شاہوں کے ثنا خواں نہ رہیں گے



بجیری زلف جب کالی گھسانے
 نظر میں پھیر گئے بیتے زمانے
 جنوں کچھ اور بھی نکھرا ہمارا
 بگاڑا کچھ نہ صحرای کی ہوانے
 میاں زالی میں کر کے قید مجھ کو
 بہت احسان کیا اہل جفا نے
 ہوا اس شہر میں محروم پیدا
 لکھ اس نے یہاں دل کے فسانے
 بسایا شہر جاں ریگ رواں کو
 محبت سے محبت آشنا نے
 مجھے مٹنے دکھائی دے رہے ہیں
 یہ زنداں اور یہ مقتول پرلے
 گریں گی نفرتوں کی سب فصلیں
 یہاں گونجیں گے الفت کے تانے
 میاں زالی مرا لاہور میرا
 مجھے لگتے ہیں سب منظر سہلانے
 نقص میں مرچے تھے ہر توجاہ
 بچایا ہم کو آواز لٹانے



بڑھائیں گے نہ کہیں ربط ہم بہاروں سے
 نپک رعبا لبواب بھی شاخاؤں سے
 کہیں تو اپنی محبت چننے آتا ہے
 کچھ ایسے داغ بھی ہم کوٹے میں یاروں سے
 نگاہ دہر میں زرے سہی مگر ہم لوگ
 ضیاء کی بھیج نہیں مانگتے تاراؤں سے
 وہ داستان ہیں کہ دہرائے گی جسے دنیا
 وہ بات ہیں جو سنی جائے گی نگاہوں سے
 ہم سے انا کے ہے آشنا چمن سلا
 سخن کی داد ملی ہے ہمیں ہزاروں سے
 فضا ہمیں ہے ابھی کھل کے بات کرنے کی
 بدل ہے ہیں زمین کو ہم اشاروں سے
 نہ چھوڑنا کبھی طوفان میں اس کی تپڑ
 یہ آ رہی ہے صدا دم بہ دم کناروں سے
 جہاں میں آج بھی محفوظ ہیں وہی منغے
 محبتوں میں جو ابھکر ہیں دل بکھاروں سے
 بزرگ بیچ کے کہتے تھے عرش پر جالب
 اٹھائی بات مگر ہم نے رہ گزاروں سے



بھلا بھی دے اُسے جرات ہو گئی پیارے
 نئے چسراغ جلاراست ہو گئی پیارے
 ترمی نگاہ پیشیاں کو کیسے دیکھوں گا
 کبھی جو تجھ سے ملاقات ہو گئی پیارے



تیسری یاد، نہ دنیا کا غم نہ اپنا خیال
 عجیب صورت حالات ہو گئی پیارے
 اداس اُداس ہیں شمعیں بچے بچے ساغر
 یہ کیسی شامِ خرابات ہو گئی پیارے
 کبھی کبھی تیسری یادوں کی سانولی رت میں
 بے جوشک تو برسات ہو گئی پیارے
 وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
 ہم اہل دل کو اگر مات ہو گئی پیارے
 تمہیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جانب
 الگ تھلگ سے ہو کیا بات ہو گئی پیارے
 پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
 ہم بڑا شہر چھوڑ جائیں گے
 دور افتادہ بستیوں میں کہیں
 تیسری یادوں سے لو لگائیں گے
 شمع ماہ و نجوم کُل کر کے
 آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے
 آخری بار اک غزل سنو
 آخری بار ہم سنائیں گے
 صورتِ موجبِ ہوا جانب
 ساری دنیا کی خاک اڑائیں گے



ترے ماتھے پہ جب تک بل رہا ہے
 اجا لا آنکھ سے اوجھل رہا ہے
 سہلے کیا نظر میں چاند تارے
 تصور میں ترا آنچل رہا ہے
 تری شانِ تغافل کو خبر کیا
 کوئی تیرے لیے کل رہا ہے
 شکایت ہے غمِ دوراں کو مجھ سے
 کہ دل میں کیوں ترا غم پل رہا ہے
 تعب ہے ستم کی آندھیوں میں
 چہرا غِ دل ابھی تک مل رہا ہے
 بہر روئی کی مغرب کی فضا میں
 بڑی تیزی سے سوچ بھل رہا ہے
 زمانہ تھک گیا جالب ہی تنہا
 وفا کے راستے پر چل رہا ہے



تم سادہ و معصوم ہو اور ہم حسین گنہگار
 دنیا کی نگاہوں سے کہیں بات چھپی ہے
 بننے پہ نہ مجبور کرو لوگ ہنسیں گے
 حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے
 دیکھا ہے زمانے کو گلے ہم نے لگا کر
 سینہ تری دنیا کا محبت سے تہی ہے
 وہ بھول گئے ہم کو انھیں بھول گئے ہم
 اے دوست مگر دل میں غلش اب بھی رہی ہے
 مل جائیں کہیں وہ بھی تو ان کو بھی سنائیں
 جالب یہ غزل جن کے لیے ہم نے کہی ہے



جس کی آنکھیں غنڈل ہر ادا شعیرے
 وہ مری شاعری ہے مرا شعیرے
 وہ حبیب زلف شب کا فسانہ لیے
 وہ بدن غنڈگی وہ قب شعیرے
 وہ تنگم لہر سکتی ہوئی چاندنی
 وہ تبسم مہکتا ہوا شعیرے
 پھول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی
 ہم نشیں اس گلی کی فضا شعیرے
 جس سے روشن تھا دل وہ کرن چمن گئی
 اپنے جینے کا اب آس شعیرے
 اپنے انداز میں بات اپنی کہو
 میسر کا شعر تو میسر کا شعیرے
 میں جہان ادب میں اکیلا نہیں
 ہر قدم پر مرا ہم ترا شعیرے
 عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
 جب کسی نے کہا واہ کیا شعیرے

اک قیامت ہے جاب یہ تنقید
 جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعیرے



جاگ اٹھے سائے ہوئے درختناؤں کے
 راتے ذہن میں لہرائے اس گلوں کے
 اک تری یاد سے اک تریسے تھوڑے ہیں
 لگنے یاد کئی نام حسناؤں کے
 صبح سے شام تک گرم ہوا چلتی ہے
 دن بہت سخت ہیں تپتے ہوئے صحراؤں کے
 اس کڑی دھوپ میں بلاتے ہیں تڑپاتے ہیں
 ہم کو احسان و خوشی کی گھنٹی چھاؤں کے
 وہ حبیب پھول وہ سبزہ وہ فوس ساز و بار
 وہ ندر گیت محبت بھرے مریاؤں کے
 جانے کس حال میں ہیں کون بتائے جاب
 ارض پنجاب میں پوئے میری آشناؤں کے



جب کوئی کھی صحن گلستاں میں بھلی ہے
شبم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے
جس کی سیر افلاک بڑی دھوم مچی ہے
آشفہ سری ہے مری آشفہ سری ہے



اپنی تو اجالوں کو ترستی حسین بنگاہیں
سورج کہاں بجلا ہے کہاں صبح ہوئی ہے
ہم کشمکش دیر و حرم سے ہیں بہت دور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے
بچھری ہوئی راہوں سے جو گزے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد ملی ہے
اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

جس کو خبریں گھر نے والے جھوٹے شغرسناں والے
لوگو صبر کر اپنے کئے کی جلد سناہیں پانے والے

درد تو آنکھوں سے بہتا ہے اور چہرہ سب کچھ کہتا ہے
یہ مت لکھو وہ مت لکھو آئے بڑے بھانے والے

خود کا نہیں گرا اپنی مشکل خود پاؤں گئے اپنی منزل
راہز فوں سے بھی بدتر ہیں راہنا کھلانے والے

ان سے پیدا کیا ہے ہم نے انکی راہ میں ہم بیٹھے ہیں
ناممکن ہے جن کا بلنا اور نہر نہیں جو آنے والے

ان پر بھی ہنستی سستی دنیا آواز کے سستی ذنبیا
جالت اپنی ہی صورت عیش میں جاں سے جائزوار



حسرت رہی کوئی تو یہاں دیدہ درملے
لیکن تری نگہ میں سبھی کم نظر ملے
ایسے بھی آشنا ہیں نہ دیکھا جنہیں کبھی
نا آشنا تھے وہ بھی جو شام بھر ملے
شاید اسی لیے ہمیں منزل نہ مل سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے
لکھی تھیں جن پہ اپنے جنوں کی حکایتیں
آوارگی میں ایسے بھی کچھ بام و درملے
کیا کیا نظر نظر میں ہوئی ٹنگاؤں پوچھ
مدت کے بعد جب سہرا گزر ملے
ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے
جانب ہوائے لعل و گہر تھی آج ہے
وہ سنگ در عزیز ہے وہ رنگ در ملے



جی دیکھا ہے مرد دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے
بزرگِ آوارہ کی صورت
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے
ٹھنڈی آہیں بھرنے وار
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے
تیسری زلفوں کا افشا
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے
اپنے دیوانوں کا عالم
تم نے کب آکر دیکھا ہے
انجمن کی خاموش فضا میں
میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے

ہم نے اس بستی میں جانب
جھوٹ کا اونچا سر دیکھا ہے



درخت سوکھ گئے رک گئے ندی نالے
یہ کس نگر کو روانہ ہوئے گھروں والے



کہاں جو سناتے تھے عہد رفت کی
نشاں وہ گردشِ آیام نے مٹا ڈالے

میں شہر شہر پھرا ہوں اسی تمنا میں
کبھی کو اپنا کہوں کوئی مجھ کو اپنا لے
دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
صدائے بے بسی مہتاب کا نہ میر میں
لگانے بے یزمانہ زبان پر تالے
کوئی کون ہے یہاں تو کوئی کرتی کہاں
دل دنگا ہونے کس درجہ دنگ میں پالے
ہمیں پہ ان کی نظر ہے ہمیں پہ ان کا کم
یہ اور بات یہاں اور بھی ہیں لالے
عم اسحاق نے ہیں شاعری کی ہے
اب نظر میں نہیں ہے ایک ہی پھول
منکر ہم کو کھلی کھلی کی ہے
پسکیں گے نہ عمر بھر جس کو
جس آج بھی اسی کی ہے
جب مہر بھج گئے جالب
ہم نے اشکوں سے روشنی کی ہے

کچھ اور تجھ پہ کھلیں گی حقیقتیں جالب
جو ہو سکے تو کسی کا فریب بھی کھالے



دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے
 پھر بھی نہیں سمجھ سکے ہم نے دینے کا کہ
 ہم نے ملوک یا راں دیکھا جو دشمنوں سے
 بھرا یا دل ہمارا روتے ہیں منہ چپا کے
 کیوں کرتے ہم بھاتیں پکوں پہ ابنِ عمنوں کو
 شام دھڑکی تو ملتے ہیں مسکرا کے
 تاعمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
 کھلتے ہے ہیں پتھر ہم آئینہ دکھا کے
 اس زلفِ خم بہ خم کا سر گئی نہ سوا
 دنیئے ہم کو دیکھا سو بار آزمائے کے
 جلتا ہوا قفس میں یہ راز آشکارا
 اہل تجوں کے بھی تھے کیا حوصلے بلا کے



زندگی بھر ذہن و دل پر خوف کے سائے ہے
 ٹائے سچائی کے کتنے پھول مرجائے ہے
 عمر اپنی لٹ گئی محرمیوں کی دھوپ میں
 چند لوگوں کا مقدوف کے سائے ہے
 روشنی کے دشمنوں نے روشنی بھونے نہ دی
 ایک مدت تک خیال و فکر دھندلاتے ہے
 دوسروں کو روشنی دیتے ہے دن رات ہم
 اپنے ارمانوں کے سوچ چاند گہنٹے ہے

آ رہی ہے آنے والی ہے محبت کی سحر
 ہم بھی کہہ کہہ کے اپنے دل کو سبالتے ہے



سوئی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی دیاں ہے
ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے



شامِ غم کو سحر کہوں کیسے
دوستوں کو فریب دوں کیسے
دائیک سب پہنچ گئے ہیں یار
دوشت پر سیڑھے پھروں کیسے
عمر بھر ساتھ چلنے والوں کو
یوں سہرا چھوڑ دوں کیسے
اب کہاں خوں اے پلانے کو
اُس ستمگرے اب بدوں کیسے
دو قدم پر ہے منزلِ جاناں
اب رہِ عشق میں رکوں کیسے
مجھ میں جب تک ہے زندگی باقی
ظلم سے بارِ مان لوں کیسے
قتلِ مہر و ماہ کو جالت
امن کی روشنی کہوں کیسے

کتنی دور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری نگینوں میں آج تک گرگڑاں ہے
پھر سوچ کے ساتھ تے ملنے کا امکان فوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے
پھر ان پیار بھری ندیوں کی پائین نگینیں نہیں
پھر اس بچپن کے دس کے غم میں شہرِ دلِ جاں لیاں ہے
جالت آپ اس جان غزل کے پیارے لاکھ نکا کر ہیں
آنکھوں کی پر سوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے



ظلمت کو چوں مرغ ہے دید و رُں سے ہے
یہ کارِ یارِ شبِ انہی سوداگروں سے ہے
انھیں تو ہر غم و ریشہی خاک میں ملے
قصہ بلند بامِ خمیدہ سروں سے ہے
یہ اور بات اس پر مُسلط بین بد نہاد
یہ خوش خنادر دیا رہیں بے گھرؤں سے ہے
کیا عمل کیا شعور کی باتیں کریں یہاں
سر کو معاملہ تو یہاں پتھروں سے ہے
اب سے نہیں ہیں تشنہ لبوں کو شکایتیں
یہ میکہ تو کب سے تہی ساغرؤں سے ہے



عشق میں نام کر گئے ہوں گے
جو ترے غم میں مر گئے ہوں گے
اب وہ نظریں ادھر نہیں اٹھتیں
ہم نظر سے اتر گئے ہوں گے
کچھ فضاؤں میں انتشار سا ہے
ان کے گیسو بکھر گئے ہوں گے
نور بکھرا ہے روگزاروں میں
وہ ادھر سے گزر گئے ہوں گے
میکہ سے میں کو نرم جاناں تک
اد جالبت کدھر گئے ہوں گے



غم وطن جو نہ ہوتا تو مقتدر ہوتے
ہم آسمان کے برابر زمین پر ہوتے

ہمیں خیال نہ ہوتا جو بے نواؤں کا
قفص میں یوں نہ سلگتے ہم اپنے گھر ہوتے



نشاط و عیش سے کرتے لبر حیات اپنی
نہ بے کسی پہ کسی کی جو چشم تر ہوتے

قمت پہ ناز ہے تو اسی اعتبار سے
دل کو رہی ہے راہ سدا کوئے یار سے

بھکا کے سر کو جو چلتے تو رفعتیں پاتے
صعوبتیں نہ اٹھاتے جو بے ضرر ہوتے

انعام و داد جس پہ ملے شہریار سے
بزرگ راہنما کون پھر اُنھیں کہتا

جس پر تھا اک جہوم کبھی اہل شوق کا
اگر یہ راہ ہمارا راستہ پر ہوتے

تہنا گزر رہے ہیں اب اس رہ گزار سے

ترک وفا کا دل میں نہ آنے دیا خیال

اس آئینے کو ہم نے بچایا غبار سے

کچھ اور ہو گیا ہے وہ شاعر نہیں رہا

وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے



کیا یہ کس نے تقاضا نہیں مٹا میلے
 ہر اک فراق گوارا مسگر کتا میلے
 یہ سوچ کر نہ کبھی ہم نے عرض حال کیا
 کہ اس طرف سے ہیں جانے کیا جا میلے
 نہ کوہ پر انھیں دیکھنا دشت میں پایا
 عدالتوں ہی میں عشاق انتقال میلے
 ہمارے سامنے ابھڑے ابھڑے ڈوب گئے
 آفت پہ ایسے بھی کچھ مسم کرنا میلے
 بہار آئی مگر ہم کو یہ رہی حسرت
 کسی روشنی پہ مہکتا کوئی نکلا میلے
 نئے نرا وطن میں پڑے ہیں زنداں میں
 وہ حکمران ہیں سرسوں کے بغیر خطا میلے
 اسیر رنج و محن اک ہمیں نہ تھے چال
 نقس میں اور بہت خانہاں خرا میلے



کون بتائے کون بھانے کون سے دیس سدھار گئے
 ان کا دستہ تکتے تکتے تکتے نین ہمارے مار گئے
 کانٹوں کے دکھ سننے میں تسکین بھی تھی آرام بھی تھا
 بننے والے بھولے بھولے بھولے چمن کے مار گئے
 ایک لنگن کی بات ہے جیون ایک لنگن ہی جیون ہے
 پوچھ نہ کیا کھویا کیا پایا کیا جینے کیا مار گئے
 آنے والی برکھا دیکھیں کیا دکھا اے آنکھوں کو
 یہ برکھا برساتے دن تو بن پرستیم بیکار گئے
 جب بھی ٹوٹے پایے ٹوٹے پھول نہ پا کر گلشن میں
 بھنوںے امرت رس کی جن پل پل سنو سنو بار گئے
 ہم سے پوچھو سائل والو کیا بستی دکھیاؤں ہر
 کیمون ہارے بیچ بھنوں میں چھوڑ کے جب اُس پار گئے



کہیں آو بن کے لب پر ترانہ آئے جسکا
 تجھے بے وفا کہوں میں وہ تمنا آئے جائے
 ذرا زلف کو سنبھالو مراد دل نہ کرکے ہلے
 کوئی اور طائر دل تہہ دام آئے جسکا



جسے سن کے ٹوٹ جائے مرا آرزو بھرا دل
 تری آنجن سے مجھ کو وہ پیما آئے جسکا
 وہ جو منزلوں پہ لا کر کسی ہم سفر کو نہیں
 انھیں رہزنوں میں تیرا کہیں نام آئے جسکا
 سی فکر میں ہیں غلطاں یہ نظامِ زر کے بندے
 جو تمام زندگی ہے وہ نظامِ آئے جسکا
 یہ مدِ بخوم ہنس لیں مے آنسوؤں پہ چلبستا
 مرا ماہتاب جب تک لبِ بام آئے جسکا
 جس دل سے ابھرے تے غم سے
 پہلو میں وہ آج لوحِ خواں ہے
 ہم ہی نہیں پائمالِ تنہا
 لے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جالب وہ کہاں ہے عشقِ تیرا
 پیائے وہ غزلِ تری کہاں ہے



محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مت و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے



وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش زائیں
مگر ہم انھیں مہرباں چھوڑ آئے

خسین پٹکمنوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نیشن سرگھلستاں چھوڑ آئے

بہت دور ہم آگئے اُس گلی سے
بہت دور وہ آستان چھوڑ آئے

یہ عجائبِ حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے اُن رہگزاروں کے جالِ
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے



منصف جیسے بیدار اسیروں کی نواں سے
الچھے ہیں کچھ انوار اندھیروں کے جہاں سے

میز و غالب بنے گیکانہ بنے
آدمی اے خدا خدانہ بنے

اک زلف کی خاطر نہیں انصاف کی خاطر
سکراتے ہیں ہر دور میں ہم کوہ گراں سے

موت کی دسترس میں کبے میں
زندگی کا کوئی بہرہ نہ بنے

نظروں میں وہی زلف کے غم عارض و لب ہیں
نکلے ہیں کہاں آج بھی ہم کوئے تباہ سے

اپنا شاید یہی تھا جرم اے دہشت
بادشاہ بن کے بے وفانہ بنے

ابھڑکے نہیں ہم سطح سے دو گز بھی مری جاں
ہو آتے ہیں اغیار مہ و کاہکشاں سے

ہم پہ اک اعتراض یہ بھی ہے
بے نوا ہو کے بے نواز بنے

نعتیہ تو بن جاتیں گے حاسد مرے جالب
لائیں گے برا حسن و بدیعت وہ کہاں سے

یہ بھی اپنا قصور کیا کم ہے
کسی متاقل کے ہم نوا بنے

کیا بگلہ سنگدل زمانے کا
آشنا ہی جب آشنا نہ بنے

چھوڑ کر اُس گلی کو اے جالب
اک حقیقت سے ہم فغانہ بنے



میسری بانہوں میں ہے میری جگا ہوں میں ہے
اس سے پہلے اس قدر کب ڈھخیل میں ہے
رفتگاں کو یاد کرنے کی بہت فرصت ملی
میری آنکھوں میں ہے وہ میرے شکوں میں ہے



آشیاں سے بھی قفس کی زندگی اچھی لگی
رات دن بچھڑے ہوئے اجلاؤں میں ہے
موت بھی ان کو جدا مجھ سے نہ جالت کر سکی
میرے گیتوں میں ہے وہ میری غزلوں میں ہے
نظرِ نظر میں بے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجِ نسیم بہار پھرتے ہیں
ترے دیا سے دزدوں نے روشنی پائی
ترے دیار میں ہم سو گوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجیب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غم روزگار پھرتے ہیں

یہ ہوئے ہیں دورِ عالم کا درد سینے میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آ کے چلی بھی گئی مگر جالت
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں



وطن سے الفت ہے مجھ اپنا یہ جرم تازہ زندگی کریں گے
ہے کس کی گرن پہ خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کریں گے

وطن پرستوں کو کہہ رہے ہو وطن کا دشمن درو خدا سے
جو آج ہم سے خطا ہوئی ہے یہی خطا کل بھی کریں گے

ذلیلہ خواروں سے کیا شکایت ہزار دیں شاہ کوٹھائیں
مدارجن کلبہ کو کوری پر وہ لوگ تو نوکری کریں گے

لے جو پھرتے ہیں تمغہ فن ہے ہیں جو ہم خیال رہزن
ہماری آزادلوں کے دشمن ہماری کیا رہبری کریں گے

نہ خوفِ زنداں نہ دارِ کاغذ بات دہرا ہے ہیں پھر ہم
کہ آخری فیصلہ وہ ہو گا جو دس کروڑ آدمی کریں گے

ستم گروں کے ستم کے آگے نہ بڑھنا کہنے جھکے گا

شعارِ صداقت پر ہم ہیں نازاں جو کہہ رہے ہیں وہی کریں گے

یہ لوگ کچھ کم ننگا و جن کو سمجھ رہے ہیں کہ ناسمجھ ہیں

یہی زمانے میں عام جالبِ شغور کی روشنی کریں گے



نہ وہ ادا تے تکلم نہ احتیاطِ زباں
مگر یہ ضد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

دل میں نصِ غزل ہے دھڑکنوں کے گیت
اجسڑ گیا ہے جسے شہر آرزو کیے

کہاں اب انکو پکاریں کہاں گئے وہ لوگ
جینیں فسوںِ طرب مہج رنگِ بوبکیے

عسزل کی بات جو کرتا ہے کم نظر نقار
اسے بھی شیخ کا اندازِ گفتگو کیے

ادب کا آپ ہی تنہا نہ ساتھ دیں جالب

کہے جو آپ کو تم آپ اُس کو تو کہیے



ہم کو نظر سے گرانے والے
 دُصنہ اب ناز اٹھانے والے
 چھوڑ جائیں گے کچھ ایسی یادیں
 رہیں گے ہم کو زمانے والے
 رہ گئے نقش ہمارے باقی
 مٹ گئے ہم کو مٹانے والے
 منزل گل کا پتہ دیتے ہیں
 راہ میں خار بچھانے والے
 ان زمینوں پہ گہر برسیں گے
 ایسے کچھ ابرہیں چھانے والے
 دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
 مٹ کر اشک پہلنے والے



ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پہننے والے
 ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو پانے
 یہ بھینگی بھینگی برساتیں یہ مہتاب یہ روشن راتیں
 دل ہی نہ ہو تو جھوٹی باتیں کیا اندھیلے کیا اُجیلے
 غنچے روئیں کلیاں دُیں دُرواپی آنکھیں کھوئیں
 چین سے لمبی تان کے سوئیاں بس پھولاری کے کھولے
 در دھبے گیتوں کی مالا بچتے جیتے جیون گزرا
 کس نے سنی ہیں کون سننے گا دل کی باتیں دے نالے

آس میں بیٹھے صیہیں جن کی جلتا
 وہ زمکے بھی ہیں آنے والے



یونہی پیارے کوئی منصور بننا کرتا ہے
حسن یہ عشق صداقت سے ملا کرتا ہے

لاکھ کہتے رہیں وہ چاک گریباں نہ کروں
کبھی دیوانہ بھی پابند ہوا کرتا ہے



اذن سے لکھنے کا فن ہم کو نہ آب تک آیا
دہی لکھتے ہیں جودل ہم سے کہا کرتا ہے

اُس کے ممنون ہی ہو جاتے ہیں درپے اُس کے
کیا بُرا کرتا ہے جو شخص بھلا کرتا ہے

اُس کی آواز سنو شہر کے دانستند و
دور پر بہت پہ کوئی آہ و بکا کرتا ہے

روز کر جاتا ہے کچھ اور پریشاں مجھ کو
خوب اخبار مرے دکھ کی دوا کرتا ہے

آج یہ عیب ہے جالبِ ستجھے معلوم نہیں
جان کر حُسن تو ہر اک سے وفا کرتا ہے

یہ آج سُرے باغِ دیرا نے پُرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پُرانے

اک آہِ سُر بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن وہ یارا نے پُرانے

جنوں کا ایک ہی عالم ہو کر بن کر
نئی ہے شمع پر رونے پُرانے

نئی منزل کی دشواری مسلم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پُرانے

ملے گا پیار غیروں ہی میں حباب
کپانے تو ہمسایے بیگانے پُرانے

اردو صحافت کا نیاریکاڑا! ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بہتر!

خوبے خوب ترکی طرف سفر جاری!!

اخبار نوجوان



- کہیں کے ہر مئی لان کی تازہ ترین خبریں پر لطف مضامین، دکش رنگوں میں کھلاڑیوں کی یادگار تصویریں ● ادبی ذائقے ● لطیفے ● کامکس ● غلطی دنیا کے مستند واقعات ● ٹیلی ویژن سیریل سے متعلق حیرت انگیز گفتا
- خواتین کی دلچسپی کے لیے تھوڑی صفحات ● ہم خوشخصیات سے ملاقاتیں ● ابھرتی ہوئی شخصیتوں کا تعارف



انعامی مقابلے اور درجنوں ایسی اچھوتی و نایاب تحریروں کی تصویری دلچسپیاں جو آپ کو اخبار نوجوان کا مستقل پرستار بنا دیں گی۔

قیمت فی شمارہ ۱۰ روپے۔ زر سالانہ ۵۵ روپے۔ غیر ملک سے ۲۵ امریکی ڈالر

ماہنامہ اخبار نوجوان پوسٹ بکس نمبر ۲۱، سربراہ شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲

سید جعفر احمد

حبیب جالب کا ایک یادگار انٹرویو

آج اس شرمیں گل سنے شرمیں بس اسی لہریں
اڑتے چوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوق آوارگی
اس گلی کے بست کم نظر لوگ تھے خیر کر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا سکراتا رہا شوق آوارگی

حبیب جالب کا شوق آوارگی کوئی پچیس تین برس سے جاری ہے۔ ہر آنے والا دن اس شوق کی لو کو اور بڑھاتا ہے۔ اڑتے چے ان کے خیالوں، خوابوں اور آدرشوں کا استعارہ ہیں۔ ان آدرشوں کے تعاقب میں وہ شہروں، شہروں، قریوں، قریوں، پھرے ہیں۔ جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکے ہیں وہاں ان کی آواز پہنچی ہے شوق آوارگی ایک پابجولاں شاعر کا نغمہ مستانہ ہی نہیں ایک نسل کی مسلک حیات بھی ہے۔

ہم اردو شاعری کے عہد جالب میں رہ رہے ہیں۔ حبیب جالب نے کتنا عجب اپنا سفر ہے قاصد بھی ساتھ چلتے ہیں۔ قاصدوں اور جالب کے درمیان ایک مستقل کش مکش جاری ہے ایک دوسرے کو شکست دینے کی کش مکش اس سفر میں حبیب جالب کا پڑاؤ ہر اس جگہ پڑتا ہے جہاں سے انہیں کچھ ریتان سفر لے کر توجہ ہو کراچی میں ان کا پڑاؤ کئی بار ہوا۔ اس شرمیں ہزاروں دل ان کے لئے فرش راہ رہے ہیں۔ یہاں ان کی لابی میں شہر کا روشن خیال ہر ترقی پسند ہر انسان دوست شخص شامل ہے۔

”محیار کے لئے حبیب جالب کا انٹرویو ہونا چاہئے“

حبیب جالب کے ہر دورہ کراچی پر یہ تجویز سامنے آتی مگر وہ کل پر نال دیتے۔ وہ کل برسوں سے کل دی تھی۔

اس مرتبہ حبیب جالب کراچی آئے تو فیصلہ ہوا کہ انہیں کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ہی

بھانکر سوالات شروع کر دیئے جائیں گے۔ ہم سب بس اب اس کے خنجر تھے کہ کس روز وہ معیار میں وارد ہوتے ہیں۔

ایک صبح مجھ پر بڑی گھبر گھار کر حبیب جالب کو لے آتے ہیں۔ زہمت شیریں اور میں پہلے سے تیار ہیں۔ حسب توقع حبیب جالب معذرت کرتے ہیں۔ ”بھئی کل کر لیں گے۔ ابھی شاید پوری بات نہ ہو سکے“ ہمیں بھی پتہ ہے کہ ابھی پوری بات نہ ہو سکے گی چپچس برس کی باتیں ایک نشست میں ممکن بھی نہیں ہیں۔ اور پھر پوری بات کے لئے شاید ابھی وقت بھی نہیں آیا۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ آج کی نشست میں ہم آپ کے حوالے سے ایسے سوالات کرنا چاہتے ہیں اور ایسے موضوعات پر بات کرنا چاہتے ہیں جو عموماً لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ لوگ آپ کی جدوجہد اور نظریات سے تو واقف ہیں مگر آپ کی ذات، زندگی کے تجربات جواں سال کے خوابوں اور ادبی سفر کے بارے میں شاید اتنا کچھ نہیں جانتے۔ وہ تھوڑی دیر مزاحمت جاری رکھنے کے بعد آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا جاتا ہے۔

بات چیت کا آغاز زہمت شیریں کے سوال سے ہوتا ہے۔ وہ ابتدائی بالکل غیر متوقع سوال سے کرتی ہیں جالب صاحب آپ کو لڑکیاں کس قسم کی پسند آتی ہیں؟ حبیب جالب پہلے مسکراتے ہیں۔ کچھ دیر سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ پھر سوچ کے پاتال سے ایک ایک لفظ نکالتا شروع ہوتا ہے۔

”بنگال کی لڑکیاں میرے ذہن میں آتی ہیں۔ ان کا کلچر مشرقیت، لمبے بال بڑی بڑی آنکھیں۔ گاتھی بھی اچھا تھیں۔ ان دنوں میں بنگالی کوارٹرز میں رہتا تھا۔“ حبیب جالب تھوڑی دیر کے لئے پھر رک جاتے ہیں۔ اب کے وقفہ زیادہ طویل ہو جاتا ہے۔ سگریٹ کے تین چار کش لگنے کے بعد وہ پھر بولنا شروع کرتے ہیں۔

”لڑکیاں، لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ چاہے جس ملک میں بھی رہتی ہوں۔۔۔ دیئے بھی معاشقوں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ لوگ اظہار کر کے خوش ہوتے ہیں اپنے عشق کی داستانیں سناتے ہیں اضافہ عشق اور پندرہ عشق۔۔۔ میں نے جس طرح کی زندگی گزاری اس میں دیکھنے کا تو حتمہ ہوا مگر اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اپنی تو مفلوک المالی کی زندگی تھی۔۔۔“ کیا آپ بڑل عاشق تھے؟“ یا سہیں چشتی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھتی ہیں۔

”دیئے سکتے رہے۔ اچھا نہیں لگا کہ کسی سے کہتے پھرے۔ کسی سے کہا بھی ہوگا تو

بست آہستگی سے اشاروں میں -

”کیا آپ اپنے آپ کو ناکام عاشق کہیں گے؟“

”یہ ضروری تو نہیں کہ کامیاب عشق وہی ہو جس میں کہ شادی ہو - یعنی حصول کا نام ہی تو عشق نہیں - بات یہ ہے کہ میں تو چیک بک کے ہندسوں کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں -“

”آپ اپنی جوانی میں کس قسم کے نوجوان تھے -“ نہت پرچھتی ہیں -
”نوجوان جیسے ہوتے ہیں ، ولدی عاشق ہو جانا ، روٹھ جانا ، پھر کسی اور پر عاشق ہو جانا ، بس ہم بھی ایسے ہی نوجوان تھے -“

ہم حبیب جالب سے ان کی زندگی کے سب ہی ادوار کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں - مگر محضو کا آغاز ہی نوجوانی سے ہو جاتا ہے - ترحیب کو متاثر ہوتا دیکھ کر میں ان کے بچپن کا ذکر شروع کر دیتا ہوں تاکہ بات شروع ہی سے سامنے آئے - میں پوچھتا ہوں کہ ان کی بالکل ابتدائی یادیں کون سی ہیں ؟ برگ آوارہ کی بست سی نظمیں ہجرت کے بعد کے کرب کی آئینہ دار ہیں - یہ سوال کرتے وقت میرے ذہن میں حبیب جالب کا یہی کرب ہے -

حبیب جالب کتنا شروع کرتے ہیں - ”گاؤں کی یادیں ہیں“ وہی ابتدائی یادیں ہیں ، ہوشیار پور ضلع کا ایک گاؤں تھا میانی افغانا وہاں رہتے تھے - چھوٹا سا قصبہ تھا - دریائے بیاس کے کنارے - بڑی سرسبز و شاداب جگہ تھی - وہاں دل لگا ہوا تھا - پھر وہ گاؤں چھوڑا ، ایک ذرا بڑے قصبے میں آئے - عام سی صورت حال تھی -

”کوئی غیر معمولی واقعہ بچپن کا“ : میں اصرار جاری رکھتا ہوں -

”بھئی ہم بست غریب مظلوم اطفال لوگوں میں سے تھے - باہر سے ہر چیز خود لاتے تھے عید کے دن ہم کو دو پیسے ملتے تھے - سارا سال اسی طرح سے گزارتے تھے - ایک بار میرے ایک دوست نے پکڑوں کی دکان لگائی تھی - عید کے دوسرے دن کی بات ہے دوسرے کے دو تین بج گئے - میں صبح سے بھوکا تھا - پکڑے بھی توڑے سے وہ گئے تو انہوں نے کہا کہ اب میلہ تو ختم ہو گیا - پکڑے کھا لینے چاہئیں - تو میں نے فوراً کہا کہ ہاں بالکل کھا لینے چاہئیں - تو میں نے پکڑے کھا لئے -

”اس وقت جاگیرداروں کا دور تھا گاؤں میں جاگیرداروں کے دیوان خانے ہوتے تھے - ان کو سلام نہ کیا جاتا تو ناراض ہو جاتے تھے - تھانے تو ہوتے نہیں تھے - وہ خود ہی فیملے کرتے تھے - ان کے جبر کا نقش ذہن پر اب تک قائم ہے - وہ نفرت چلی آ رہی ہے اس قسم کی باتیں میرے ذہن میں تھیں یہ ساری باتیں مل ملا کر شعر میں ڈھل گئیں - میں اگر

شاعری نہ کرتا تو کچھ اور کام کرتا لیکن کرتا اسی قسم کا کام جاگیرداری کے خلاف ۔۔۔۔۔
 ”ہمارے بھائی اور ہمارے والدین دوسری جنگ عظیم میں مجھے گاؤں چھوڑ کر دل چلے
 گئے اور میں وہاں اپنی ثانی کے ساتھ رہنے لگا میری ثانی نے انگریزوں کا عروج دیکھا تھا۔ وہ
 ہمیں کمائیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ اندھی تھی مگر اندھے پن کے باوجود جرائیں بن لیتی تھی۔
 ازراہند بن لیتی تھی۔ اس کو اس کی بڑی پریکٹس تھی۔ پھر ہم ان چیزوں کو بیچنے کے لئے
 جایا کرتے تھے۔ دو دو تین تین میل دور۔ وہ اندھی تھی لہذا لوگ خرید بھی لیتے تھے۔
 جب دو ایک آنے لیکر ہم گھر آتے تھے تو وہ رات کو کہتی کہ صبح چھل پکائی جائے میں کتا
 بست اچھا خیال ہے۔ پھر وہ کہتی نہیں صبح پائے پکائے جائیں۔ میں کتا یہ بھی اچھا ہے صبح
 جب اٹھتے تو میں کتا۔ ثانی کیا پکاتا ہے۔ تو کہتی تھی اپنے دادا کی طرف جا۔ یہاں کیوں رہتے
 ہے۔ پھر کہتی چلو چڑی سیوہ ی کر لیتے ہیں۔ چڑی سیوہ اس کو کہتے ہیں کہ سوکھی مرغ اور
 نمک کو ملا کر پانی میں گھول لیتے ہیں۔ اس کو روٹی سے کھاتے ہیں۔ تو رات کو تو بڑے
 خواب دکھاتی تھی۔ جب دن ہوتا تھا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ایک شعر بہت پڑھا کرتی تھی
 اور یہ ہے ۱۹۳۷ء کی بات۔

ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسے کو کیا
 دتا نہ دتا پھر کسے کو کیا

”میں بھی اس کو سنتا رہا۔ پھر میں کراچی آیا۔ ثانی بھی میرے ساتھ تھی۔ سو سال مر
 ہو گئی تھی ایک دن میں کلیات نظیر پڑھ رہا تھا۔ تو اس میں سے یہ شعر نکل آیا۔ وہ یوں تھا

ہم نے تو دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
 اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

”میں نے سوچا کہ دیکھو یہ شعر سو سال پہلے پیدل چل کر ہمارے گاؤں پہنچ گیا۔ وہ
 عوامی شاعر تھا میں نے ثانی سے کہا۔ اب یہ شعر غلط نہ پڑھتا۔ یہ کچھ واقعات ہیں بچپن
 کے جو یاد آتے ہیں۔“

”پڑھائی کا کیا سلسلہ رہا؟“ حبیب جانب کے رکتے ہی میں اگلا سوال پوچھتا ہوں۔
 ”یہ سلسلہ رہا کہ گاؤں میں آدھا قرآن شریف پڑھا وہ غلام رسول تھے ایک جنسوں نے
 یوسف زلیخا کا بیٹائی میں ترجمہ کیا۔ وہ بتایا کہ تھے شہل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر گاکو
 سناتے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں دلی چلا گیا۔ ایچ۔ جے۔ مرکب ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔
 وہاں نہایت درست ہو گئی۔ دلی میں جو لڑکے لے وہ بڑے رنگین مزاج تھے میں چھوٹا تھا۔“

اس لئے مجھے بہت چیز تھے پہلے ایک سال تو وہ مجھے چھینٹتے رہے پھر میں انہیں چھینٹنے لگا پھر پاکستان بن گیا وہ سارے دلی سے پاکستان منتقل ہو گئے۔ کوئی کچھ ہو گیا، کوئی کچھ ہو گیا۔ کراچی میں میں نے جیکب لائن اسکول میں داخلہ لیا پڑھنے کے بجائے میں ماشروں کو شعر سناتا تھا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر نے بلوایا کہا کہ : ۔۔۔ تم کلاس میں آتے نہیں ہو اپنے والد کو لے کر آؤ۔۔۔ مصلح الحق ان کا نام تھا۔ میں نے کہا کہ جب میں ہی نہیں آؤں گا تو والد کیا آپس کے میں چلا گیا پھر ایسا ہوا کہ کراچی ہی میں ایک انچارج کنوینشن ہوا، سندھ مدرسہ میں دوسرے دن مشاعرہ تھا مشاعرہ میں مجھے بھی بلایا گیا میں نے غزل پڑھی تو مجھے بڑی داد ملی۔ میرے ہیڈ ماسٹر بھی وہاں بیٹھے تھے۔ مشاعرہ کے بعد بدھ کر انہوں نے مجھے بلایا۔ ارے میاں یہاں آؤ بیٹا اور پھر ایک ایک سے تعارف کرانا شروع کر دیا۔ یہ میرا شاگرد ہے، پھر مجھ سے کہنے لگے والد کو مت لانا مگر اسکول ضرور آنا۔ پھر میں لاہور چلا گیا اور نیشنل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اتفاق اخبار میں پروف ریڈنگ کی نوکری کی تجویز پڑی کم تھی صرف ۷۵ روپے ملتے تھے ہارہ کھٹے کام کرنا پڑتا تھا پھر میں نے لاہور بھی چھوڑ دیا اور دوبارہ کراچی آگیا۔“

تنگو کا ایک سال بندہ چکا ہے حبیب جالب کے ساتھ محفل آرام ہونے والوں کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ ان کے ساتھ بیٹھنا کتنا پر لطف اور پر کیف ہوتا ہے۔ اس کیف کو برقرار رکھنے کی خاطر میں فوراً ہی اگلا سوال پوچھتا ہوں کہ شاعری کے آغاز پر انہوں نے کسی استاد سے مدد بھی لی یا نہیں حبیب جالب کہتے ہیں۔

”شاعروں میں میں نے بکر۔ نیچو۔ سائل کو سنا جنہوں نے داغ اور غالب کو سنا تھا سو سو سال کے تھے۔۔۔۔۔“

”کوئی استاد وغیرہ نہیں تھا آپ کا۔۔۔؟“

”بس یہی کوئی ایک ایک سال، ڈیڑھ سال، کسی کے قریب رہے اور پھر چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ بیت نہیں لگتی تھی کیس کراچی میں ایسا ہوتا تھا کہ استاد وغیرہ لوگوں کو غزلیں لکھ کر دے دیتے تھے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہئے۔ نہ ان کے قریب زیادہ رہنا چاہئے۔“

”ابتدائی دور میں آپ نے پڑھا کیا۔ کن کن شاعروں سے متاثر ہوئے؟“ میرا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی حبیب جالب نام گوانے شروع کر دیتے ہیں۔

”میر، غالب، فراق، بکر، جوش، حسرت، امیر اور پھر محمد، مجاز، جنینی۔۔۔۔۔ ان سے

"آپ کی شاعری میں جو LOUDNESS کا عنصر ہے جسے کچھ لوگ غرے بازی کا نام دیتے ہیں تو یہ ہماری روایتی شاعری میں تو نہیں ہوتا تھا۔ اب جو آپ نے یہ — " میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی حبیب جالب جواب دیا شروع کرتے ہیں۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی یہ کہوں میں لوگوں کا غزل کی طرف 'غزل آتی ہے مصرعے آتے ہیں مگر اس میں دجھا انداز ہوتا ہے' اس میں کٹ نہیں۔ لوگ کہیں گے ٹھیک گیا 'ہار گیا' جتنے کیا اس نے جب تک یہ عمدہ چل رہا ہے میرا یہ لہجہ بھی چلا رہے گا۔ یہ نہیں کہ مجھے غزل پسند نہیں یا یہ کہ اس قسم کی شاعری میں نہیں کر سکتا۔"

"مگر برگ آوارہ میں رہا ٹھیک شاعری کی خوبصورت موجود ہیں۔"

"ہاں یہ ہے کہ تجربات آدمی کو REPEAT کرنے لگے تو وہ ٹھیک نہیں مشق و عاشقی کی محافل بند کی اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر اس کو مختلف انداز میں ڈھلانا چاہئے۔"

"آپ کو دن کا کون سا پیر اچھا لگتا ہے؟" یہ سوال کون پوچھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سوال زہمت شہس کا ہے۔

جس پر دست میر ہوں 'کچا ہوں وہی پیر اچھا لگتا ہے۔" یہ جواب کس کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ جواب حبیب جالب کا ہے۔

مجاہد ریلوی جو ابھی تک خاموش تھے۔ بات چیت میں چڑچڑکھاتے ہوئے ہوئے پوچھتے ہیں۔

"آپ نے اتنے ادوار دیکھے ایک مخصوص انداز کی ذمہ داری اتنا وقت گزارنے کے بعد اب کہیں افسوس تو نہیں ہوتا۔ ملاوت کا احساس۔"

"مجھ سے زیادہ میرے بچوں کو ہوتا ہے ہمارے ساقی دنیاوی طور پر کیا کیا ہو گئے مگر میں بچوں سے کہتا ہوں کہ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور وہ عزت بدلی چیز ہوتی ہے۔ میری ان باتوں کے بعد وہ اس وقت بل جاتے ہیں اور میرا کلام ہو جاتا ہے۔"

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ در آتا ہے سکوت یوں بھی آجی چیز نہیں۔ حبیب جالب ہر دم آرام ہوں تو سکوت اور بھی کھلنے لگتا ہے۔ حبیب جالب چائے کا آخری جرہ لیتے ہیں تو میں پرہیز ہوں۔

"آپ کی شاعری 'عوامی شاعری' کہلاتی ہے۔ اردو شاعری میں شاید کسی شاعر کو اتنے کوٹھن میں لے ہو گئے جتنے آپ کو لے ہیں اس حیثیت کا آپ کو کوئی مللی فائدہ بھی پہنچا کچھ مللی منفعت بھی حاصل ہوئی؟"

"مللی منفعت مجھے کم ہوئی۔ بلشہر کو زیادہ ہوئی سر منزل کے ایک سینے میں چار ایڑیٹھ

مجھے 'اب دو کتابیں اور چھپ رہی ہیں - یہ بھی نکل جائیں گی - مگر یہ ہے کہ میں شاعری کو کاروبار نہیں بناتا - شاعرے میں پڑھنے کے میں پیسے نہیں لیتا - شاعرے میں جاتا ہوں اپنی مرضی سے نظمیں پڑھتا ہوں - ایوب خان کے دور میں مری کے ایک شاعرے میں دستور کے نام سے ایک نظم پڑھی - تو مری بدر کر دیا گیا - دس سال کے بعد بجٹی کی تصویر حتیٰ میں نے فرل سنائی - پھر اس کے بعد سے اب تک مجھے مری کے شاعرے میں نہیں ملا دیا گیا -"

"حالیہ صاحب: آپ نے قلمی شاعری بھی تو کی - کچھ اس بارے میں بھی تو بتائیں اور یہ بھی کہ اب کیوں قلمی شاعری نہیں کرتے آپ؟"

"ہاں قلموں میں بھی کی وہاں بھی مشن جاری رہا جب قلموں میں گئے تو اس وقت ماحول تھا - اچھے لوگ تھے - علاؤ الدین اور طالش میرے ساتھی تھے - بھوکے کچے ہوتے تھے - ہم اکٹھے رہتے تھے - ٹیکریں پہنتے تھے پھر یہ بڑے ہو گئے - گھر گروں میں منتقل ہو گئے - ہم وہیں کھڑے رہے - شعر و شاعری کا معاملہ اتنا نہیں ملتا - ہم پھر بھی شاعری کرتے رہے - ہمارا مقصد اس سے پورا ہوتا - ہمارے خیال کی پیروی ہوتی لاکھوں لکھڑوں تک ہماری بات پہنچ جاتی ہم اشیاں اسپرل ہات کر لیتے تھے جاگیردار کے خلاف شعر شامل کر لیتے تھے کبھی کبھی ہات پر دلوں سروں کے سر کے اوپر سے گزر جاتی حتیٰ بعض بڑے اچھے پروڈیو سر لے جیسے ہمارے دوست ریاض شاہد تھے - ریاض شاہد مجھ سے کہتا تھا کہ تم بھٹی بڑی گالی اس معاشرے کو دے سکتے ہو وہ میں اسے کچھ انز کروں گا وہ مجھے چار پانچ دن کے لئے ایک کمرے میں بند کر دیتا تھا میں میزک ڈائریکٹر اور ریاض شاہد چنے جاتے تھے ہم میں بڑی بے تکلفی تھی - میں شعر لکھتا 'وہ کہتا یہ کیا ہے' میں کہتا تھیں پتہ نہیں ہے شعر کیا ہوتا ہے پھر سمجھو ہو جاتا پھر صدی حسن کو بلوایا کرتے تھے چاروں مل کر بیٹھ جاتے اور گانا ہو جاتا اب ایسا لوگ ہیں جو نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی انہیں سمجھایا جاسکتا ہے اب غلیل قیصر بھی مر گیا -"

"قلم انٹرنیٹ کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے پاکستانی قلموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہاں یہ ہے کہ اب تو انٹرنیٹ کی فلمیں چھائی ہوئی ہیں 'دی سی آر چل رہے ہیں - اس وقت پاکستانی قلم تو پتہ نہیں رہی - ہماری قلموں کو چاروں صوبوں کا نمائندہ ہونا چاہئے' وہ جو آپ لکھتے اور یو ٹی وی پر دکھاتے پر کتنی بنا کر پیش کر دیتے ہیں - وہ بھی ٹھیک ہے مگر اب مزید

ان موضوعات پر فلم چلے کی نہیں، بہت کچھ بن گیا ہے اردو میں اضافہ ہوا ہے۔۔۔
علاقائی زبانوں کی وجہ سے، مسائل کی وجہ سے۔۔۔

”فلم کوئی وی نے بھی نقصان پہنچایا ہے زیادہ تر پڑھا لکھا ٹیلنٹ بھی اس طرف چلا گیا ہے جو وہ کہتے ہیں وہ پنجابی فلمیں بناتے ہیں۔ اردو والے بھی پنجابی فلموں کی طرح کی فلمیں بناتے لگے ہیں۔ یہاں کے مسائل پر فلم بناتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حلقہ پر جب خوف طاری ہو تو وہ حلقہ نہیں رہتی۔ ریاض شاہد میں سے بات تھی کہ وہ اصل مسائل پر فلم بناتا تھا۔ انڈین فلمیں دیکھتا ہوں تو ان میں بھی یہ ہے کہ سب تو اچھی نہیں ہوئیں مگر اچھی بھی ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوتا ہے، پھر زبان بھی کیریکٹر کی استعمال کرتے ہیں۔ فلم کو اگر صحیح لوگ بنائیں تو یہ انجکشن کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

”نئی شامی جو ہو رہی ہے یا جو نے اور لوجان کھنے والے سامنے آئے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ فلم سے ایک مرتبہ پھر شامی پر آتے ہوئے میں جالب صاحب سے پوچھتا ہوں۔
وہ کہتے ہیں۔

”شامی میں سے نئے تجربے تو ہو رہے ہیں۔ آڑی تو اچھی ہے لیکن جب تک خیال کی پہنچ اور خیال کی RICHNESS نہ ہو اس وقت تک بڑی شامی نہیں بنتی۔ فی الحال یہ پہنچ نفع نہیں آ رہی ہے۔ شاید آگے چل کر ان میں کوئی بات بن جائے۔“
”آپ کی شامی کا آغاز کیوں ہوا۔ پہلی فلم یا غزل کب لکھی، کہاں چھپی؟“
”پہلی قابل ذکر چیز تو اموز میں چھپی، چراغ حسن حسرت کی ادارت میں وہاں غزل کا پہلا جانا بہت بڑی چیز تھی۔ وہ بہت سخت آدمی تھے، بڑے عالم تھے، بہت اچھے انسان تھے، کالم نگار بھی بہت مہر کے تھے۔ آج کل تو کالم نگار ایک بات پر پورا کالم لکھتے ہیں ان کے یہاں یہ نہیں تھا۔ وہاں تو ایک بات آئی اور چار لائنوں میں ختم ہو گئی، پھر دوسری بات آگئی، دس باتوں کا ایک کالم ہوتا تھا۔“

”جالب صاحب! موسیقی کا بھی کچھ شوق ہے آپ کو؟“
”ریاض شاہد کی فلم کے لئے میں نے وہ مشورہ دیا تھا، رقص ذخیرہ بن کر بھی کیا جاتا ہے۔ فلم ہی پر اصل میں اس نے یہ فلم بنائی تھی (دور) پھر فلم کو گیت بنانے کا بڑا مرحلہ تھا۔ رشید عطرے جو میوزک ڈائریکٹر تھا، وہ قطعاً بہتر فلم کو سنکھائے جا رہا ہے،“

گائے جا رہا ہے۔ اس سے بن نہیں رہی، میں اس کی مصیبت کو سمجھ گیا میں نے کہا کہ جب تک ٹکنگ لائن نیچے نہیں آئے گی اس وقت تک یہ معرکہ ابھرے گا نہیں۔ تو پھر میں نے اس میں ٹکنگ لائن بھی رکھی۔ رقص ذخیرہ بن کر بھی کیا جاتا ہے تو ہجرت ہو گیا۔

آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکس لڑی
سر مثل تجھے کونوں سے چھپا جائے
موت کا رقص نالے کو دکھایا جائے
اس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص ذخیرہ بن کر بھی کیا جاتا ہے

”تو اس طرح یہ مصرعہ افشا، لڑک ازم سے گیت بنتا ہے۔ اس میں ایک ٹکنگ لائن ضروری ہے۔ وہ کیا ہو۔۔۔ یہ ہم کو پتہ ہے۔ پھر ہم نے اپنی سیاسی نظموں میں بھی یہ بات کی، ہماری نظمیں چلتی کیوں ہیں، پاپو لڑکیوں ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس لڑک ازم سے کام لیتے ہیں۔ یہ سارا کام ہم نے سیاست میں دکھایا، پہلے ہوتا تھا۔۔۔ اسلام کی کشش کو ہم پار لگا دیں گے، ادھر سوچی گیٹ پر ہوتا تھا۔ اب ہم نے یہ کہا جو موضوع زیر بحث ہے، جو مسائل ہیں ان پر نظم لکھی جائے چنانچہ تقریریں کم ہو گئیں نظمیں چل پڑیں۔“

تقریروں کے مقابلے میں غمیں کو مقبولیت کا ذکر لگا ہے تو بات پھر اس کی طرف نکل جاتی ہے۔۔۔ حبیب جالب کہتے ہیں۔ ”سروردی نے ایک بار کہا کہ ہم تو وہ بات نہیں کہہ سکا جو تم کہہ گیا، موہی دوواڑے میں جلسہ تھا۔ سروردی اپوزیشن کے بڑے قد آور رہنما تھے۔ کالا باغ کے آدمی جلسہ خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسٹج کشی کی طرح ڈول رہا تھا۔ میں مانیک پر اگیا اور میں نے کہا کہ حضرات یہ لوگ جو شور مچا رہے ہیں۔ یہ لوگ لاہور کے لوگ نہیں ہیں یہ کالا باغ کے پیچھے ہوئے لوگ ہیں لاہور کے لوگ مذہب اور متدین لوگ ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ پھر میں نے کہا کہ آج ایک نظم سناؤں گا دیکھتا ہوں کہ تم مجھے سننے ہو یا نہیں۔ نظم شروع ہوئی، سنا چھایا۔ دستور نظم سنائی، جلسہ جم گیا۔ اس کے بعد سروردی آئے اور لوگوں نے انہیں سنا۔ اگلے دن پاکستان ٹائمز نے لکھا کہ حبیب جالب نے شیک بھال کی۔“

”آج کل عورتوں کے حقوق کی بحث زوروں پر جاری ہے، آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟“

میں نے ایک اہم مسئلہ پر حبیب جالب کی رائے پوچھتا ہوں۔۔۔

”ریاض شاہد کی فلم کا جو گیت تھا وہ بھی ایک ایسے وقت سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ نیلو کو ایک بڑے فنکشن میں رقص پر مجبور کیا گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی زبردستی کی گئی۔ اس نے گولیاں کھالیں، ہسپتال میں وہ داخل ہو گئی۔ میں اور ریاض شاہد اسے دیکھنے جا رہے تھے۔ راستے میں فلم ہو گئی۔ نیلو سزاوار فلم ہو گئی۔ آٹھ دس سال کے بعد ایک اور اداکارہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ طارق عزیز نے کہا کہ کوئی ہوتا حبیب جالب تو فلم کہتا۔ میں ”چٹان“ کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ کسی نے یہ بات مجھے بتائی تو میں نے کہا کہ اچھا تو لکھ دیجئے ہیں فلم۔ خواتین کی جو آزادی ہے۔ وہ ہمیشہ بڑی عزیز رہی ہے وہ چاہے ایک راقصہ ہو یا کوئی بڑی خاتون، سینہ ہو یا دفتر کی خاتون ان کی ایک عزت ہے۔ ان کے حقوق کی میں بات کرتا ہوں۔ نیلو ہو یا ممتاز ہو ہر ایک کی عزت ہے۔ نیلو سے میں ملا بھیں ممتاز سے نہیں ملا، نہ ملنے کا شوق ہے۔ خواتین الیکشن فورم والیوں نے کہا کہ عورتوں کا ترانہ لکھ دیں۔ میں نے لکھ کر دے دیا۔ خواتین کے جلسوں میں بھی مجھے بھی بلوایا جاتا ہے۔ میں تو خواتین کی ٹریڈ یونین کا سربراہ ہوں۔“

”مشاعروں میں لوگ آپ کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ ہزاروں لوگ تو صرف آپ ہی کو سننے کے لئے دور دراز سے آتے ہیں۔ آپ شاعری کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟“

”مشاعروں میں لوگ ہمیں اتنی تعداد میں جو سننے آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم وہ بات کہتے ہیں جو لوگ سنتا چاہتے ہیں۔“ حبیب جالب مختصر سا جواب دے کر خاموس ہو جاتے ہیں۔ مگر اس مختصر سے جواب میں بالویت کے جہاں پنہاں ہیں۔“

ایک مرتبہ پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ اب کہ اس خاموشی کو مجاہد بریلوی توڑتے ہیں۔

”کسی خاص مشاعرے کی کوئی بات یاد ہو تو۔“

”بڑے مشاعرے پڑھے۔ دلی میں، گھنٹو میں۔ مگر صاحب کے ساتھ بہت پڑھے، جوش، حفیظ، فراق سب کے ساتھ پڑھے۔ گوکہ پور میں ایک مشاعرہ تھا۔ وہ علاقہ بڑا ہی سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ گنگا جنتا کا علاقہ رم جہم ہی ہو رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میرا ناگ جابا تھا۔ پیچھے فراق صاحب کا ناگ آیا۔ میں فراق صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ فراق صاحب گھر لے گئے، ایک صحن میں تخت پوش پر بٹھا دیا۔ کہنے لگے میں ذرا اندر اپنے گھر والوں سے ”بھین دین“ کرلوں۔ وہاں سے آئے تو کہنے لگے کہ میں نے اپنے گھر

والوں سے کہا ہے کہ میں دلی سے تمہارے لئے ایک تختہ لایا ہوں۔ حبیب جالب اور پھر مجھ سے کہنے لگے کہ جالب! تمہارے لئے یہ تختہ لایا ہوں، امروں کا خالص مرق، فراق اور امروں کا مرق۔ تو کھنگو تو۔ آٹھ ہو گئی تھی۔

فراق بی کا ذکر کرتے ہوئے حبیب جالب کہتے ہیں۔ ”ان کا بڑا علم تھا، ذرے سے لے کر آفتاب تک باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ان سے بڑی ناراضگی بھی ہو گئی تھی۔ دلی میں مشاعرہ تھا۔ میں نے فراق صاحب کو مخاطب کر کے ایک شعر پڑھ دیا۔“

اپنے انداز میں بات اپنی کو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

”اب سردار جعفری، خواجه احمد عباس داد دے رہے ہیں۔ واہ واہ۔۔۔ یعنی جالب دوبارہ پڑھو۔ میں دوبارہ پڑھ رہا ہوں۔ اپنے انداز میں بات اپنی کو۔۔۔ فراق صاحب کہہ رہے ہیں۔۔۔ جی ہاں، جی ہاں۔۔۔ میں شعر دوبارہ، سر بارہ پڑھ رہا ہوں۔ میں تو داد طلب انداز میں شعر پڑھ رہا تھا۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ فراق کیوں اتنی سرد مری سے مجھے جی ہاں، جی ہاں کہہ رہے ہیں۔ جب میں نکلتے گیا تو وہاں جس ہوٹل میں وہاں مجھے ٹھرایا گیا اسی میں فراق صاحب بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں فراق صاحب کے کمرے میں گیا اور کہا فراق صاحب آداب! کہنے لگے، ”میاں آداب و ادب بعد میں۔ میں نے ادھر میر کی زمین میں پانچ چھ غزلیں کیا کہہ دیں کہ تم نے ہمیں شعر سنا دیا۔ میں نے کہا حضور کون سا شعر۔ صاحب میں تو آپ کو صاحب طرز شاعر کہتا ہوں اور بھی بہت کچھ کہا میں نے۔ ایک شاگرد بھی فراق صاحب کے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے، فراق صاحب یہ تو آپ کو بہت بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اس پر فراق صاحب کہنے لگے، ”اچھا تو یہ بات تھی۔ ہم نے تو جب ریڈیو پر نوجوان شاعروں کے بارے میں مضمون پڑھا تو اس میں ان کا بطور خاص ذکر کیا، میں نے کہا کہ جناب یہ شعر جو میں نے پڑھا، یہ تو اپنے ملک کے نامور کاظمی اور آپ کے ذلیل الرحمان عظمیٰ وغیرہ کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد ہم مشاعرے میں پہنچے۔ فراق صاحب نے ہمارے بارے میں مانگ پر آن کر تعارف کراتے ہوئے کہا۔۔۔ میرا پائی کا سوز اور سور داس کا نغمہ کیجا ہو جاتے ہیں تو اسے حبیب جالب کہتے ہیں۔ یہ مشاعرہ ہندوستان کا تھا۔ ہاں ایک اور مشاعرہ یاد آ رہا ہے۔ لاکھ پور کے مشاعرے میں جگر صاحب نے کہا کہ جب تم پڑھتے ہو تو ہم سوچتے ہیں کہ ہمارا دور سے کبھی ہوتا تو ہم برسر مشاعرہ رقص کرنے لگتے۔“

”یہ تو بہت بڑا خراجِ تحسین ہے!“

” فیض صاحب نے تو ہم کو غم سے اجنبی، میں مہمانی فرما کر یہ لکھا ہے کہ بنگالی میں سلطان پاہو، ’لمحے شاہ اور وارث شاہ عوامی شاعر ہیں اور اردو میں حبیب جالب ہے اور یہ بھی کہ دلی دکنی سے لے کر کراچی تک کسی شاعر کو اتنا آؤ نہیں ملا۔“

” آپ نے ماضی میں بھی مشاعرے پڑھے ہیں۔ اب بھی آپ پڑھتے ہیں۔ اس زمانے کے اور آج کے زمانے کے شاعروں میں کچھ فرق محسوس کرتے ہیں آپ۔“

حبیب جالب، ’یا سبکین چشتی کا سوال سننے ہیں۔ اور پھر گویا ہوتے ہیں۔ ”اب دلی اور لکھنؤ میں جو سننے تھے وہ تو مطالعہ کرتے تھے۔ بڑے ذوق شوق سے سننے تھے۔ اب یہاں وہ ذوق و شوق کہاں۔ کراچی میں سامعین بہتر لگے۔“

”آپ کبھی ہوا بھی ہوئے“ یا سبکین چشتی ہی پوچھتی ہیں۔

”ہاں ایک بار کا مجھے یاد آیا۔ میں پھنس گیا تھا، لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں لائل پور سے آیا تھا۔ زہرہ نگار بھی آئی تھی۔ وہ زہرہ نگار کا بڑے عروج کا دور تھا۔ اپنے مخصوص سحرآمیز انداز سے وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتی تھی۔ اور پھر زہرہ کے بعد مشاعرے میں پڑھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ مجھے بس سے لاہور جانا تھا۔ بس نہیں ملی تو میں ٹرک میں بیٹھ کر آیا۔ سر پر بال دال بھی تھے اور وہ جو شاعروں کا ایک خاص طبع ہوتا تھا۔ وہ میرا بھی تھا، اس وقت مشاعرہ قتل گاہ بنا ہوا تھا۔ کئی شاعروں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ زہرہ نگار پڑھ کر جا بگی تھی۔ جو شاعر آتا وہ ڈیر ہو جاتا تھا۔ میں ٹرک کے اڑے سے سیدھا مشاعرے میں داخل ہوا اور گردن نکال کر مجمع میں سے اسٹیج کی طرف بڑھا۔ شوکت تھانوی اسٹیج کیکر بیڑی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سوچا چلو اسے کانٹیں۔ مجھے کانٹے کے لئے اس نے آواز لگائی۔ حضرات اب حبیب جالب اپنا کلام سنائیں گے۔ میں مایمک پر نیا تو لوگوں نے کہا کہ نکالو اس کو کہاں سے آگیا یہ فقیر، عجیب و غریب فضاء بن گئی۔ میں کانپنے لگا اور سوچا کہ چلو ہمیں چلے جاتے ہیں۔ مگر کہیں سے ذہن میں ایک لہر آگئی کہ کہیں یہ حسرت نہ رہ جائے کہ ابھر پڑے چلے گئے۔ تو یہ سوچ کر میں نے ایک تازہ غزل کا شعر پڑھا۔“ وہ جو غزل تھی۔

دل کی بات لیوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں

ہم نے سنا تھا اس بہتی میں دل والے بھی رہتے ہیں

”یہ جو میں نے ترم کے ساتھ پڑھنا شروع کی تو لوگ خاموش ہونے لگے۔ پھر دوسرا شعر پڑھا، پھر تیسرا شعر پڑھا کہ“

ایک ہمیں آوارہ کتا کوئی بڑا الزام دینا
 دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
 ”اس پر ہے حمشا داد ملی، بے پناہ داد ملی۔۔۔ بکر صاحب صدارت کر رہے تھے۔ میں
 مائیک فونو کر بکر صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے جب کراچی میں بکر صاحب آئے
 ہوئے تھے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہی بکر صاحب آئے ہوئے ہیں، چلو ان سے مل لو۔ تو
 میں نے کہا کہ یہی تم مل آؤ، ہماری کہیں ہو جائے گی ان سے ملاقات۔ اس پر لوگوں نے
 کہا کہ دیکھو اس لڑکے کو۔ بکر صاحب آئے ہوئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ ہو جائے گی کہیں
 ملاقات۔۔۔ تو اس مشاعرے میں ملاقات ہو گئی، بکر صاحب کے کہنے پر میں نے متعلق پڑھا
 اور آکر بیٹھ گیا۔“ متعلق تھا۔۔۔

وہ جو ابھی اس راہ گذر سے چاک گرہاں گزرا تھا
 اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں
 ”میں آن کر بیٹھ گیا تو لوگوں نے آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ اب ایک ڈرامہ ہوتا ہے
 ناکہ شاعر بیٹھا رہتا ہے کہ اور چیختے دو، اور اصرار کرتے دو۔ اس پر مشاعرے کے منتظین
 کو تو یہی کہتا ہوتا ہے ناکہ ابھی اور شاعر بھی آئے والے ہیں۔ اور وقت ہوا تو بعد میں ان
 کو پڑھا دیں گے۔ شوکت تھانوی کو تو یہی کہ دیتا تھا، مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے۔
 مجھے بھی غصہ آیا اور میں نے کہا کہ اسے تو آج میں قتل کروں گا۔ میں مائیک پر آیا اور
 کہا۔۔۔ حضرات! کیا آپ مجھے سنتا چاہتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہاں سنتا چاہتے ہیں۔ اس پر
 میں نے کہا کہ حضرات اگر آپ سنتا چاہتے ہیں تو میں سنتا چاہتا ہوں، پھر یہ ہمارے درمیان
 میں کون ہے۔ پھر میں نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد تو ایک ہی رات میں مقبولیت مل گئی
 کالجوں میں لڑکے لڑکیوں نے مجھے بلوانا شروع کر دیا۔ مشاعروں میں اور سہاگنوں کے
 دھڑوں میں۔ ایک مرتبہ شورش کشمیری نے اپنے رہالے میں لکھا کہ ایک دن کسی کالج کی
 دہلیزی پر اس کا دم ٹٹکے گا۔“

”نوجوانوں کو آپ نے ہمیشہ متاثر کیا ہے!“ میں کچھ کہنا ہی چاہتا ہوں کہ حبیب جب
 خود بول اٹھتے ہیں

”میں جب کراچی میں تھا اس وقت بھی نوجوانوں میں افسانہ، ہینتا اسکول میں تھا۔ جس
 وقت تو زیادہ وقت ایس ایم کالج میں گذرتا تھا۔ خود بھی لومر تھا۔ لڑکیاں پلٹک پر لے جاتی
 تھیں“

”پلٹک پر ظاہر ہے نظمیں بھی سناتے ہوں گے؟“

”وہ اب یاد نہیں ہیں۔ بس ایسی ہی ہوتی تھیں، تباہ ہو گئے، برباد ہو گئے۔ وغیرہ۔۔۔“

زہمت خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد اب دوبارہ اپنے سوالات شروع کرتی ہیں۔

”یہ جو آپ ترجم سے پڑھتے ہیں تو اس میں کس سے متاثر۔۔۔۔۔“

”میں نے کمانا کہ بنگالی کوادرز میں جب رہتے تھے تو وہاں رات کو گانے بجانے کی آواز

آتی تھی۔ صبح ہوتی تو پھر گانے بجانے کی آواز آتی، بھائی طلبہ بجا رہا ہے، بابا پارمونیم

لئے بیٹھا ہے۔ بہن رقص کر رہی ہے۔ میری آواز اچھی تھی۔ تو وہ مجھے بھی شامل کر لیا

کرتے تھے۔ فکشن میں ساتھ لے جاتے تھے۔“

”جالب صاحب لڑکیاں کس لباس میں بجلی معلوم ہوتی ہیں؟“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جالب کہتے ہیں۔۔۔ بھی کرتا پسند ہے، کرتا جس میں چاندی

کے بٹن لگے ہوں اور چوڑی دار پاجامہ۔ تو ہو گا ہی۔۔۔!

”کمانا کیا پسند ہے؟“

”شہنشاہ اور لوکی تو میرے مزاج سے موافقت نہیں رکھتے کھیلے، گوشت میری نیگم بناتی

ہے۔ وہ بہت پسند ہے۔ ویسے آج کل تو پرہیزی کمانا کمانا ہوں۔ بس ابلا ہوا قیرہ کمانا

ہوں۔“

”بھئی ختم ہوا یا کچھ رہ گیا ہے۔۔۔“ جیب جالب پوچھتے ہیں۔ ہمارے پاس بت سے

سوال باقی ہیں۔ لیکن جالب تین گھنٹے کی مسلسل نشست کے بعد اب کچھ تھک گئے ہیں۔

وہ کل کا دعوہ کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کل ایک سال بھی ہو سکتی ہے، دو سال بھی

اور شاید اس سے بھی زیادہ لیکن ہم اصرار نہیں کرتے۔ ہمیں کل کا انتظار کئے بغیر پھر کسی

دن جیب جالب کو اسی طرح جس بے جا میں رکھ کر بات کرنی ہوگی۔ ان کے ہر انٹرویو

کی طرح شاید یہ انٹرویو بھی تشنہ تکمیل ہے۔ مگر ان کا تو ہر انٹرویو تشنہ تکمیل ہی رہے گا

اس لئے کہ ان کا سفر ابھی جاری ہے، شوق آوارگی اب بھی جہاں کی گرد اڑا رہا ہے۔

(یہ انشہ دیر ہفت روزہ معیار کراچی میں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔)

سجید پرویز میراج بھائی میرا باپ

میں بہت چھوٹا تھا ' چھ یا سات برس کا کہ جب میں نے پہلی بار گھر میں ایک شخص کو دیکھا کشادہ پیشانی ' بڑی بڑی روشن آنکھیں اور گھنے سیاہ بال ' پتہ چلا کہ یہ بھی ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ (بھائی بہنوں میں ' میں سب سے چھوٹا ہوں) حبیب نام ہے۔ حبیب بھائی اور دوسرے بھائیوں میں یہ فرق نمایاں تھا کہ دوسرے بھائی تو مجھے گھر پر ہی نظر آتے ' جبکہ حبیب بھائی گھر سے غائب ہوتے تو مبینہ شکل نظر نہیں آتی تھی۔ والدہ اور والد حبیب بھائی کے لئے پریشان رہتے تھے جبکہ بھائی شروع ہی سے اپنے مشن کی تکمیل میں عملاً مصروف ہو گئے تھے ' لیکن ہمارے سادہ لوح والدین اس بات کو نہیں سمجھتے تھے لہذا انہوں نے بھائی کی آزاد روی اور اپنی پریشانی کا حل یہ سوچا کہ بھائی کی شادی کر دی جائے۔ اس طرح ہماری چچا زاد بہن ممتاز ہماری بھانج بن کر ہمارے گھر چلی آئیں۔ مگر صحیح معنی میں بھائی کو پایہ ہماری اکلوتی بہن کی شادی کے فرض نے کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں وہ ایک ایک پیسہ اماں کے ہاتھ میں لاکر دیتے تھے اور صرف دو آنے اماں سے لیتے تاکہ کافی ہاؤس تک پہنچ سکیں اور یوں ۱۹۵۹ء میں تنہا بہن کی شادی کا بوجھ اٹھایا (اس وقت ہسپورٹ بحال تھا لہذا ہندوستان مشاعروں میں بھی گئے ' نیز قلمی گیت بھی بھائی نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کئے اور رائج معاوضہ سے تین گنا معاوضہ وصول کیا)۔۔۔۔۔ بھائی لاہور شفٹ ہوئے تو میں بھی کراچی سے لاہور پہنچا دیا گیا۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا کرائے کا مکان ' بھائی اناجی کا فوہ پائے کر پکے تھے۔ یعنی قلم دستور میں نہیں مانتا ' میں نہیں جانتا ہو چکی تھی۔ اندر باہر حالات ایک سے تھے۔ ان حالات میں کہ جہاں پیٹ کا جنم بھرتا مشکل تھا ' بھائی اور بھابی نے مجھے تعلیم دلوائی ' یہ ان کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے ماحول کے بچے تو ہانسی لگایا کرتے ہیں۔ میں نے ۱۹۶۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ ہمارے بہنوئی بہت لائق آدمی ہیں۔ انہوں نے میٹرک میں پورے بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ میرے بارے میں

ہتے تھے کہ میں میٹرک میں لٹل ہو جاؤں گا۔ اخبارات کے دفاتر میں تو نتیجہ دو روز پہلے ہی پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے بھائی سے کہا کہ کسی اخبار کے دفتر سے میرا رزلٹ معلوم کر لیں مگر بھائی صاحب اس پر راضی نہ ہوئے دراصل وہ بھی بھائی کی پیشین گوئی پر یقین رکھتے تھے۔ اور اپنے کسی صحافی دوست کے سامنے شرمندہ ہونے کو تیار نہ تھے۔ مگر جب میں نے بہت ضد کی تو وہ مجھے امروز میں ظہیر باہر صاحب کے پاس لے گئے۔ یہ لے چکا تھا کہ لٹل ہونے کی صورت میں اخبار کے دفتری میں میری چٹائی ہوگی۔ میں نے ظہیر باہر صاحب کو اپنا رول نمبر بتایا۔ انہوں نے نتیجہ دیکھا تو میں دوسرے درجے میں پاس تھا۔ انہوں نے جالب بھائی سے کہا کہ مبارک ہو۔ آپ کا بھائی پاس ہو گیا مگر بھائی صاحب سامنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ اور انہوں نے قدرے محنہ کر ظہیر باہر صاحب سے کہا بھائی ذرا غور سے دیکھو یہ تالاق لڑا کا پاس ہونے والا نہیں ہے۔ میں نے ایڈمٹ کارڈ ظہیر باہر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے غور سے رول نمبر دیکھا اور پھر رول نمبر گزٹ میں تلاش کر کے بولے۔ بھی جالب تمہارا بھائی دوسرے درجے میں میٹرک پاس کر گیا ہے۔ تب بھائی صاحب نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چٹیل پاؤں میں پستی اور مجھے سینے سے لگایا اور مضامی بھی ہوئی۔ میٹرک کے بعد مجھے محکمہ انکم ٹیکس کراچی میں ملازمت مل گئی۔ اس زمانے میں چٹل حسین صاحب (الطاف گوہر صاحب کے بھائی) انکم ٹیکس کشنر تھے۔ وہ جالب بھائی کے بہت اچھے دوست تھے اور ہیں۔ انہی نے مجھے ملازم رکھا تھا۔

جالب بھائی سے مجھے والمانہ عشق ہے۔ میں اگر ان کا بھائی نہ بھی ہوتا تب بھی ان کا بہت بڑا پرستار ضرور ہوتا۔ جالب بھائی بہت ہمدرد اور خلیق انسان ہیں۔ خاندان والوں کے کیا کیا کام آئے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کسی بھی کام کے لئے ان کے ہاں انکار نہیں ہے۔ گھر میں اور گھر کے باہر ان کا برتاؤ یکساں ہے۔ یہ جو ان کا حق بچ بولنے کا معاملہ ہے تو یہ خوبی یہ جو ہر انہیں والدہ صاحبہ سے ورثے میں ملا ہے۔ ہماری والدہ منہ پر بچ بولنے والی خاتون تھیں۔ اسی لئے پورا خاندان ہماری والدہ صاحبہ کو برا سمجھتا تھا اور کبھی ان سے ناراض رہتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے جالب بھائی بچ لکھتے اور بولتے ہیں تو اہل اقتدار ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

جالب بھائی جہاں ٹیسے کے بہت تیز ہیں وہاں وہ بے حد خوش مزاج بھی ہیں۔ کبھی خوشگوار موڈ میں ہوں گے تو استا کر دیں گے۔ بچوں کے ساتھ بچے بن جائیں گے۔ ایسے میں اگر کوئی انہیں دیکھے تو حیران رہ جائے۔ میں جب جب ان سے ناراض ہوا تو وہ ناراضگی

بارہ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ شفا میں ان سے ناراض ہو کر گھر پہنچا تو دوسرے دن صبح ہی صبح کھنٹی بجی اور جالب بھائی موجود چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ سجائے، سر قدرے جھکائے، مخصوص لہجے میں کہیں گے۔

حضور حبیب جالب حاضر ہے اور پھر ہاتھ میں پکڑا تھیلا اور جھولی میں ہرا مصالحہ، 'مولیٰ' نمائرو وغیرہ۔ لو بھئی یہ تیر ابھی بھون لو۔ ناشتہ اسی کا کریں گے اور یوں ناراضگی ختم۔ حبیب جالب کے بھائی ہونے کا بھی عجیب نشہ ہے کہ کوئی نظروں میں چنچا ہی نہیں ہے ایک سرور و کیف کا عالم ہے جو رہتا ہے۔

بھائی صاحب کی گرفتاریوں اور قید بند کے طویل سلسلے کا میں بھی ایک قریبی گواہ ہوں بھائی کو گرفتار ہوتے کئی بار دیکھا مگر مرحوم طاہر عباس (جالب کا بیٹا، جس کا بارہ سال کی عمر میں انتقال ہوا) کے نويس والے دن بھائی کی گرفتاری کو میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ گھر کو چاروں جانب سے اہلکاروں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ گھر پہلے منڈل پر تھا۔ نیچے سے کسی نے آواز دی۔ ناصر! ناصر! (ناصر بھائی صاحب کا بڑا بیٹا ہے) میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو تین چار افراد کھڑے نظر آئے۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ شاید ناصر کے اسکول کے اساتذہ ہیں، تعزیت کے لئے آئے ہیں، بھائی صاحب ان سی ملنے نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد نیچے سے بھائی صاحب کی آواز آئی۔ سعید ذرا نیچے آؤ۔ میں نیچے پہنچا، تو بھائی صاحب نے چاروں افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ ڈی ایس پی حضرات ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ پھر مجھے کہا کہ ان کو لے کر اوپر آجاؤ، یہ کہتے ہوئے جالب بھائی اور چاروں ڈی ایس پی حضرات اور میں اوپر آگئے۔ اوپر آکر جالب بھائی نے ڈی ایس پی حضرات سے کہا کہ آپ لوگ انتظار کریں کیونکہ میں ابھی بیت الخلاء جاؤں گا۔ ناشتہ کروں گا اور پھر چلیں گے۔ چھوٹا سا گھر اور پھر گھر میں بٹھانے کے لئے کوئی انتظام بھی نہیں۔ لہذا چاروں ڈی ایس پی حضرات گھر کے صحن میں کھڑے رہے۔ بھائی صاحب بڑے اطمینان سے بیت الخلاء گئے اور پھر ناشتہ کیا۔ (میں نے اس دوران اندھ آلیٹ بنایا تھا) ان تمام حالات سے بے خبر بھائی دوسرے کمرے میں تعزیت کے لئے آئی ہوئی خواتین کے ساتھ مصروف تھیں اور بھائی نے بھی بس اپنی واسنٹ اٹھائی، نہ بیوی سے ملے، نہ بچوں کی طرف دیکھا اور آنے والوں کے ساتھ چلے گئے۔ یہ بہت، یہ جرات، یہ عزیمت انہی کا حصہ ہے۔ میں اور میرا بھتیجا ناصر، محمود علی قصوری صاحب کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے کمشنر لاہور اور اسلام آباد ہر جگہ فون کئے، مگر جالب بھائی کی گرفتاری کی ذمہ داری کوئی

بھی ایجنسی قبول نہیں کر دی تھی اور قصوری صاحب مرحوم نہ جانے طیش میں اہل کاروں کو کیا کیا سنا رہے تھے۔ شام چار بجے گھر پر کچھ اہل کار دوبارہ آئے اور بھائی کا اپنی کیس پہنچانے کے لئے کہہ گئے۔ ہم اپنی کیس پہنچانے کے لئے چلے تو والدہ صاحبہ بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں اور جب ہم والدہ صاحبہ کے ساتھ بھائی صاحب سے ملے تو ماں کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے جالب بھائی کی آنکھوں میں پانی کی ایک ٹکڑی ابھری اور پھر غائب ہو گئی جیسے ایک طوفان ابھرا ہو اور کسی نے مضبوط ترین بند باندھ دیا ہو۔ جالب بھائی کمال صحت، وقار اور عزم کے ساتھ بول رہے تھے۔ چہرے پر قلندرانہ جلال بہت نمایاں تھا۔ وہ مجھے کہہ رہے تھے۔ ارے بھئی! ماں کو کیوں تکلیف دی۔ انہیں کیوں لے آئے۔ ماں نے آگے بڑھ کر بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا کہ بیٹا صحت نہ ہارنا۔

ہاں! ہاں! ماں سب ٹھیک ہے لوہ پھر مجھے کہا کہ ماں کو لے جاؤ۔ اچھا جاؤ اور پھر اسی شام بھائی صاحب کو ایک دوسرے شرکی جیل میں پہنچا دیا گیا۔
بھائی کی تمام عرقیدہ بند کی صعوبتوں کی نذر ہو گئی۔ اب ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ مکمل صحت یاب ہو جائیں



سفید بالوں کے مسئلے کا نہایت آسان حل...

وَسْمُول

33
کیس کالا

سفید بالوں کو
قدرتی ساختہ رنگ
جلد اور
آسان طریقہ

تیار کیا ہے: بائیوٹیک ویرج انشٹیٹیٹ، پوسٹ بیگ، 1192، فون: 400 023۔
ناکسٹ کھشت

منظور اے چوہدری

وہ جالب ہم کو چھوڑ گیا

جالب جو اس کا پیا مبر تھا، حق کا پیکر، خدا کی کے دل کی آواز، ضمیر کا قیدی تھا، وقت کا منصور، اس کو اپنی سچائی پر پختہ ایمان تھا۔ اور اپنے شعور سے آگہی رکھتا تھا۔ وہ شاعری نہیں کرتا تھا، عوام کے دکھ درد اپنے شعروں میں پیش کرتا تھا، وہ اپنی ذات میں ایک انجن اور تحریک تھا، اس نے ساری عمر قلمی جہاد کیا۔ وہ ظلم و جبر کے انحصروں میں ایک روشن چراغ تھا۔ جس کو موت کے آنندھی نے بجھا دیا اور ہم سے چھین کر بہت دور لے گئی۔ جالب کو اپنے قلم کی آزادی برشتے سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ خود کہتا ہے کہ:

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اجالا مجھے کہا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر اسن عالم مجھے اپنی ذات کا علم میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہو نہ والا
اس کے ہر لفظ سے مقصد ریت پہنچا ہے۔ جالب نے خود کوئی بار کہا کہ علامہ اقبال نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ ”آٹھو میری دنیا کے عربوں کو جگا دو“ اور ڈیوٹی کو سر انجام دیتے ہوئے مجھے پندرہ سو روپے جیل جانا پڑا۔ اس نے اپنی زندگی کے حسین لمحے عوام کے حقوق کی خاطر باہر سلاسل گزارے۔ جالب پاکستان کے عوام کے دلوں میں بستا ہے۔ اور جب تک باشعور لوگ زندہ ہیں۔ جالب کا نام زندہ رہے گا۔ لیکن صد افسوس کہ جالب آج ہم میں نہیں ہے۔

تھامز م جواں جس کے دم سے وہ جالب ہم کو چھوڑ گیا
وہ منج روشن کارا ہی دنیا سے منہ موڑ گیا

۱۴ اپریل بروز جمعہ جالب کا چہلم تھا۔ اپنی رہائش گاہ واقع ۱۹-۴ نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن

لاہور میں آپ ۱۲ مارچ کو لاہور میں فوت ہو گئے۔

جالب نے بھرپور اور با مقصد زندگی گزاری۔ اسے اس کا شعور تھا۔ جالب خود کہتے ہیں کہ:

سوچ کا اک دیا جلا تو دیا
چہرہ تیرا مگر دیکھا تو دیا
جانب گنوا کے جلا کے گھر اپنا
پاس جو کچھ تھا لٹا تو دیا
اک انسان نے بے وقاروں کو
سر اٹھانے کا حوصلہ تو دیا
شورخون دوراں نے اسے جالب
درد مندوں کو کچھ جگا تو دیا

یہ امن کا پیا میر ۱۹۲۸ء کو مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کے ایک دیہات میانی افغاناں میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ اور والدہ کا نام راجہ بھری تھا۔ آپ کے بھائیوں میں مشتاق مبارک جس سے جالب بے حد پیار کرتے تھے۔ جالب سے بڑے تھے۔ باقی عبدالحمید خان، سعید پرویز اور ایک بہن رشیدہ بیگم تھیں۔ اپنے بڑے بھائی کے بارے میں تو آپ یہاں تک کہتے کہ اگر مشتاق مبارک نہ ہوتا تو میں آج جالب نہ ہوتا۔ بلکہ ایک عام سا دیہاتی ہوتا۔ مشتاق مبارک شاعر بھی تھے۔ اور کراچی کے ادبی حلقوں میں ایک اچھا خاصا نام تھا۔ جالب جب دہلی میں لگاؤں سے آکر بسے تو انگریزوں کے اقتدار کا سورج ڈوب رہا تھا۔ اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت تھی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم دیکھ کر جالب بھی انگریزوں سے نفرت کرنے لگا۔ پھر برصغیر کی تقسیم دیکھی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل عام دیکھا۔ قیامت خیز مناظر دیکھے۔ مذہب کے نام پر آدمی کی تقسیم دیکھی تو جالب کی عقل دنگ رہ گئی۔ جالب جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو اس وقت اٹھارہ سال کے نوجوان تھے، دہلی سے کراچی آگئے بڑے بھائی کی وساطت سے ادبی حلقوں میں تعارف ہوا۔ پھر جالب تعارف کے محتاج نہ رہے۔ جالب کا سیاسی سفر اس وقت شروع ہوا۔ جب مشتاق احمد گورمانی کے دور میں اسٹوڈنٹس پر گولی چلی تو جالب تڑپ اٹھا۔ جالب ظلم و جبر کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے حیدر بخش جتوئی کی باری تحریک میں شامل ہو گیا۔ یہ تحریک مقامی وڈیروں کے ظلم و ستم کے خلاف باریوں کی تحریک تھی۔ باریوں کی یعنی مظلوموں کی تحریک ہو اور جالب کی ہر سوز منترم آواز ”حیدر بخش جتوئی اے سائیں“ جالب نے باری تحریک کو عوامی رنگ دے کر جان ڈال دی۔ اور پہلی مرتبہ حیدر بخش جتوئی گرفتار ہوئے ۱۹۵۴ء کو پھر یہ سیاسی سفر جاری رہا۔

آج اس شہر میں کل نئے شہریں اڑتے ہوں کے پیچھے اڑتا رہا

حبیب غالب پر آوارہ کالزام لگا تو خود بولے:

لیک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

اسی دوران ایسا ہوا کہ علاؤ الدین اداکار بڑا انسان دوست اور قدردان انسان ہوا ہے جو کراپنے وقت کا سایہ ناز اداکار تھا۔ وہ غالب کو فلم انڈسٹری کی طرف لانا چاہتا تھا کہ غالب انڈسٹری کے لئے لکھے اور اس کے حالات ٹھیک ہو جائیں۔ وہ کو شمش کر کے غالب کو لاہور لے آیا اور اپنے ساتھ لکھنؤ لایا۔ غالب میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ کبھی اس پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، اس وقت کے مشہور فلم ڈائریکٹر جعفر شاہ بخاری اپنی گاڑی میں آئے اور غالب میکلوڈ روڈ لاہور میں ایک پان کی دوکان سے پان خرید رہے تھے کہ گاڑی ٹھوڑی دور رکی اور جعفری صاحب نے اپنا آدمی بھیجا کہ غالب کو بلا لاؤ۔ اس سے فلم کے لئے گانے لکھوانے ہیں۔ اب غالب لاہور لائے بھی اسی مقصد کے لئے گئے تھے کہ فلموں میں گانے لکھیں گے۔ بڑی دیر بعد یہ چانس مل رہا تھا۔ لیکن غالب اس بات پر برا مان گئے کہ کوئی کار میں بیٹھ کر اسے اپنے پاس بلائے اس آدمی کو کہا کہ ”جا کر کہہ دو کہ میں نہیں آتا“ پھر بخاری صاحب خود آئے اور غالب نے کہا ”بخاری صاحب عزیمتوں کی عزت ایسوں سے زیادہ نازک ہوتی ہے“ اور یہ خودداری ساری زندگی نبھائی کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ پابند سلاسل رہ کر کبھی قدم ڈنگائے نہیں۔ کبھی لکھنؤ نہیں آئی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی کا کنٹ دینا چاہا تو غالب نے کہا کہ میں NAP نیشنل عوامی پارٹی میں ہوں اور اصولوں پر چھوڑ نہیں کر سکتا اسے شکرا دیا۔ ہزاروں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ آخری دنوں میں جب ہسپتال میں تھے۔ تو حکمرانوں نے کہا کہ ہم آپ کو علاج کے لئے باہر بھیج دیتے ہیں تو غالب بولے کہ ”عوام کو تو اسپرین کی گولی نہیں دیتے ہو اور مجھے بیرون ملک بھیجا رہے ہو۔ نہیں جاؤں گا“ اور کبھی سرکاری امداد قبول نہیں کی۔ پھر روزنامہ جنگ والوں نے غالب کو علاج کے لئے بھیجا۔

غالب ایک تاریخ ساز شاعر تھے وہ اپنی شاعری کے ذریعے ”عوامی تاریخ“ لکھ گئے ہیں۔ جب بھی کسی نے پاکستان کی سیاسی زندگی کا حقیقی روپ دیکھنا ہوا اور حکمرانوں اور عوام کے تعلقات کا اندازہ لگانا ہو تو وہ غالب کے کلام کا مطالعہ کر لے۔ غالب نے عوامی تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے۔

۱۹۷۲ء میں الیوب خان کے آئین کا بڑا چرچا تھا۔ مری کے مشاعرے میں غالب کو مدعو کیا گیا

جس میں سرکاری افسر اور عوام کا جم غفیر تھا۔ غالب نے اپنی نظم ”دستور“ پڑھی تو بیل چل پڑ گئی۔ عوام کا جوش و دلور قابل دید تھا۔ حبیب غالب کو بلا یا گیا تو کسی کو توقع نہ تھی کہ غالب ایسی نظم کہے گا جن کا عوام کا مجمع ہو پھر غالب کی مترنم آواز عوام کا ضمیر بل اٹھا:

میں بھی خائف نہیں تختِ دار سے
میں بھی منہور ہوں کہہ دو اختیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہیل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
حامِ رندوں کو ملنے لگے تم کہو
بھول شاخوں پر کھلنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سنے لگے تم کہو
اس کھیلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

ہجوم نے جلسے کے بعد حالب کو کندھوں پر اٹھا لیا اور ایوب خان مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے
اس کے بعد حالب فاطمہ جناح کے جلسوں میں جاتے فاطمہ جناح ہر جلسہ میں حالب کو ساتھ رکھتی تھیں۔
ایوب خان کے خلاف نفرت میں حالب کا حامیہ ہاتھ تھا۔ اس وقت کے گورنر نواب آف کالا باغ نے
حالب کی گرفتاری کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن حالب ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے اور عوام کے ہجوم میں وہ لے
گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ حالب کے نئے عوام کے دلوں میں بسنے لگے۔ حالب اب ایک عوامی شاعر بن کر
اُبھرے، حالب بولا:

عام ہوئی غنت و گردی چپ ہیں سپاہی باوردی
شمع نوازے اہل سخن کالے باغ نے گل کڑی

اسی طرح حالب وقت کے ساتھ ساتھ عوامی تاریخ رقم کرتے جاتے ہیں۔ جب یحییٰ خان کے
دور میں مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن ہوا تو عوام کا منیر بولا:

محبت گولیوں سے بوری ہے وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گھماں تم کو کہ راستہ کٹ رہا ہے یقین تم کو کہ منزل کھو رہے ہو

حالب بھٹو کو ایک اچھا انسان سمجھتا تھا، لیکن جب بھٹو کے دور میں ظلم و تشدد ہوا تو بولے:

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا لاڈ کاٹنے چلو ورنہ تمھارے چلو

پھر منیاء الحق کا دور آیا، مارشل لاء لگا ہزاروں سیاسی کارکن جیلوں میں گئے شاہی خلیق کی سیر کی۔
اذیتیں سہیں حالب خود اکثر جیل میں رہے تو ہم حضروں نے کہا کہ ظلمت کو منیا لکھو انعام ملے ہیں مرمر

’کوصبا کہو خطاب ملتے ہیں۔ بندے کو خدا کہو ایوارڈ ملتے ہیں، حالب نے کہا جو منیر ماسے کا، عوام جاپیں گے وہ لکھوں گا حالب بے ساختہ بول اٹھے؛

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہڑا دیوار کو در، کر گس کو ہٹا کیا لکھنا
اک حشر بہا سے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنہگارے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ و روا اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا
لوگوں ہی پہ اٹھ جاں واری کی ہم نے انہیں کی غنوازی
ہوئے ہیں تو ہوں یہ ماتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست شن کیا لکھنا

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا

حالب عہد بہ عہد عوام کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا انہیں صراطِ مستقیم بتاتا رہا اور سچائی سے آگاہ کرتا رہا، اور اپنے جینے کا حق ادا کرتا رہا، اپنے خیالات کا ہر چار کرتا رہا جب عوام دوست، جمہوریت پسند اور ترقی پسندوں کے خلاف سلاؤں نے شور ڈالا تو حالب نے رہنمائی کی، بولے؛

خطرہ ہے درباروں کو
شاہوں کے غمخواروں کو
نوابوں، خدائوں کو
خطرے میں اسلام نہیں
خطرے میں اسلام نہیں

پھر عوام نے حالب کی آواز میں آواز ملائی اور کہا کہ:

خطرہ ہے سرداروں کو
اسلام کے ٹھیکیداروں کو
امریکے کے داروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
خطرے میں اسلام نہیں

جب جمہوریت ہی کے نام پر عوام کے حقوق پر ڈاکر ڈالاکھا تو حالب عوام کو اپنی جمہوری بھی بتاتے رہے اور نام نہاد جمہوری قدروں کا پردہ بھی چاک کرتے رہے :

دیس میرا آزاد ہے یا رو' دُور نالے جمہور ہی اے
حق دی گل میں کہہ نہیں سکدا اپنی کی جمہوری اے

حالب کی شاعری میں ہر دُور کا منظر اور حقیقی عوامی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا مقدمہ لڑتا رہا۔ اس ملک کے لئے 'اس ملک کے لئے عوام کی خوش حالی کے لئے' مزدوروں، کسانوں کے لئے، غریب عوام کے لئے وہ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا تھا۔ وہ تو پاکستان میں امن، خوش حالی اور مساوات کا حقیقی روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ انسان دوست اور انسان سے پیار کرنے والا شخص تھا۔ حالب خود کہتے ہیں:

اپنا تو منشور ہے حالب سارے جہاں سے پیا کھو

عوام نے حالب کو پیا رکھی دیا۔ لیکن حالب نے بھی عوام سے وفا آخری وقت تک نبھائی۔ عوام دوستی کے صلے میں تو حالب نے ۱۴-۱۵ مارچ کو حالب نے صرف عوام کی خاطر۔ حالب نے عوام کی بڑی بھاری قیمت چکانی زندگی کے حسین لمحات پاہند سلاسل رہ کر گزار دیئے۔ جنرل منیا لختی کے دُور میں جب موہانی تعصب پھیلا یا گیا، پنجابی کو سندھی گالی دینے لگا مہاجر کو سندھی اپنا دشمن خیال کرنے لگا سندھ میں احساس محرومی بڑھا۔ منیا نے فوجی دنیا کے افسروں کو سندھ میں زمینیں الاٹ کیں اور حان بوجہ کر سندھ میں بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر پنجابیوں کو لگا دیا جس سے مارشل لا کے خلاف نفرت کی بجائے پنجابیوں سے نفرت کی جانے لگی تو ایسے حالات میں ۱۹۸۳ء میں لاہور میں کورٹ بار کے زیر اہتمام ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں حالب مدعو تھا حالب نے حالات کو پرکھا اور موقع کو غنیمت جانا اور بولے :

جاگ میرے پنجاب کہ پاکستان چلا	وٹ چلے سب خواب کہ پاکستان چلا
جن کو ذات کا غم ہے وہ کب ملے ہیں	بے بیس لوگوں پر بند و قیوس تانے ہیں
قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا	جاگ میرے پنجاب - - - - -
سندھ بلوچستان تو کب سے رہتے ہیں	اور اہل پنجاب ابھی تک سو تے ہیں
آنکھیں ہیں پُر آب کہ پاکستان چلا	جاگ میرے پنجاب - - - - -

اس کے بعد بے نظیر کا دُور آیا تو حالب کو تھوڑا سا سکون ملا کہ اب کوئی سیاسی قیدی جیل میں نہیں جائے گا۔ عوام کی حالت سدھر جائے گی۔ مہنگائی کم ہوگی۔ عوام کا معیار زندگی بلند ہوگا لیکن

یہ سب خواب تھے حالہب کے جو پورے نہ ہو سکے۔ عوام جوں کے توں محروم اور بے سہارا رہ گئے۔
میں دبے، مرجھائے چہرے۔ حالہب سے نہ رہا گیا۔ اور کہا:

وہی حالات ہیں فقیروں کے دن بھرے ہیں فقط فریادوں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض پاؤں تنگے ہیں بے نظیروں کے

اور پھر بولے:

ناں جا اسمہ یکہ نالی کرٹے ساتوں تیرا بہت خیال کرٹے

حالہب 'NAP' کے وقت سے ولی خان کے ساتھی چلے آ رہے تھے جب چار پارٹیوں سے مل کر
عوامی نیشنل پارٹی ANP، یعنی راجپوت کسان پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی PNP، نیشنل ڈیموکریٹک
پارٹی NDP اور پاکستان عوامی تحریک، پانچ گروپ) تو حالہب بھی NAP میں شامل تھے اور ولی خان کو اپنا
لیڈر مانتے تھے۔ اور جب نواز شریف کے دور میں ANP نے اسلامی جمہوری اتحاد کا ساتھ دیا اور نواز
حکومت میں شامل ہو گئی تو حالہب رنجور ہو گئے۔ اور ایک انٹرویو میں صاف کہہ دیا کہ اب ولی خان میرے
لیڈر نہیں ہیں نہ میں NAP کا ہوں، میری پارٹی اب عوام ہیں۔ جس پارٹی کی خاطر انہوں نے بھٹی کی طرف
سے پیش کردہ وہی اسمبلی کا ٹکٹ لڑا تھا اس کو اپنے اصولوں پر چلتے ہوئے چھوڑ دیا۔ ایسے اصول پرست
سیاسی زندگی میں بہت کم ملتے ہیں باقی نواز شریف کے ہمسے میں کسی نے پوچھا کہ آپ نواز شریف کے خلاف
کیوں ہیں تو حالہب نے کہا بھائی میری ساری زندگی سیاسی سفر میں گزری ہے جلسوں جلسوں میں
گیا ہوں برجہ جوری تحریک میں شریک ہوا ہوں جیل میں رہا ہوں پورے اس سیاسی سفر میں نواز شریف
کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ میں کیسے اسے اپنا لیڈر مان لوں اب نواز حکومت ختم ہو چکی ہے اور گوہا گوہا
فخرہ لگانے والی بابے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ آج حالہب زندہ ہوتے تو بے نظیر سے سخت ناراض ہوتے۔

ایک دفعہ حالہب ہمارے ایک دوست کے یہاں ماڈل ٹاؤن لاہور میں قشرف لائے جہاں اکثر
آتے جاتے تھے راقم بھی وہیں پر رہائش پذیر تھا کہ حالہب صاحب رات کو تقریباً نو بجے آئے۔ اس دن بڑے
موڈ میں تھے ایم آر ڈی کی تحریک چل رہی تھی۔ مارشل لا کا زمانہ تھا ہم حالہب سے سوال کر رہے تھے
وہ بڑی مستانہ سے جواب دے رہے تھے ہم نے تو حالہب کو صرف شاعر سمجھا تھا وہ تو بلا کا دانشور تھا میں
نے حالہب کی کافی ساری نظمیں یاد کر رکھی تھیں جو کہ ہم ایم آر ڈی کے جلسوں میں پڑھتے تھے جب میں نے
حالہب کو ان کی نظمیں ترنم سے سنائیں تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے آپ جیسے ساتھیوں کو دیکھ کر میرا
حوصلہ بلند ہو جاتا ہے حالہب نے خود بھی بہت سی نئی نظمیں سنائیں

ہم ایک دفعہ حالہب کو رائے ونڈ میں یوم مٹی کے جلسے میں لائے تھے جس میں مزدور رہنما اوطار علی خاں

بیشتر نظر اور دیگر رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ رات کے اٹھ بج گئے تھے لیکن حالب کی مسکورتن آواز اور مترنم
 نظمیں سن کر ہر کوئی چل رہا تھا اور پورا مجمع حالب کا شیدائی بن گیا اس سے پہلے حالب رائے ونڈ میں نہیں
 آیا تھا لیکن اس جلسہ کے بعد ہر ایک کی زبان پر حالب کا نام تھا حالب کو اپنی سہائی کا یقین تھا۔ حالب کے
 بارے میں مختلف لوگوں کی رائے :

آئی اے رحمن

حالب ایسا ہی آزاد، خود دار، نڈر اور خوش گو تھا جیسا کہ وہ اشعار میں نظر آتا ہے۔

محسن بھوپالی

تذلیل کے حسروں سے رنجو نہیں ہوتا تحسین کے جلوں سے مغرور نہیں ہوتا
 جو کچھ بھی کہا اس سے انکار نہیں ہوتا اور خوف حراست سے مستور نہیں ہوتا
 حقیقات بھی کہتا ہے بھر ظلم بھی سہتا ہے اور ملک میں رہتا ہے مغرور نہیں ہوتا

سید سبط حسن

اُردو زبان نے نظر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ کچھ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب حالب ہے۔
 ان کا رہن سہن عوامی ہے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے ان کی قدریں عوامی ہیں ان کی
 محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں اور وہ عوام کے دکھ درد، آرزوں اور اسگوں کی ترجمانی عوام کی زبان میں
 کرتے ہیں۔

حالب نے جو کچھ کیا وہ اس سے مطمئن نظر آتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ایک انسان
 جس نے اپنے جسم و روح کا رشتہ بھی قائم رکھنا ہو۔ وہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔ حالب خود کہتے ہیں۔

ذرے ہی سہی کوہ سے ٹکراؤ گئے ہم دل لے کے سرِ عرصہ غم آؤ گئے ہم
 اب نام رہے نہ رہے عشق میں اپنا روداد و فادار بہرہ تو گئے ہم
 اٹھیں کر نہ اٹھیں یہ رونا اُن کی چال لوگوں کو سرد نظر آؤ گئے ہم

(ماہنامہ منشور گراچی مئی ۱۹۹۳ء)





پادشاه

حبیب جالب

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ لمبے فن میں ڈھل کر صدیاں بن جاتے ہیں۔ اُس کی ایک مثال تو مولانا ظفر علی خان کی استغناء دشمن شاعری ہے۔ اُن کے فوراً بعد حبیب جالب کا نام آتا ہے۔ اُس نے شاعری کا آغاز روایتی موضوعات سے کیا اور کچھ ہی عرصے میں اُس نے اپنی انفرادیت یوں تسلیم کرالی کہ اس شاعری کو سہل منتزع کی ایک بیخ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سلاست، اظہارِ ہمت، مشکل فن ہے۔ خاص طور سے جب اظہارِ ایسے جذبہ بات و قصورات کا ہو جن کو فن میں منتقل کرتے ہوئے بیشتر اُردو شعرا نے طویل تراکیب اور پے در پے اہنما فتوں اور عری فارسی کے بھاری بھر کم الفاظ کی بھرمار کر دی ہو۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ سلاست، اظہارِ اُردو شاعری کی ایک قدیم روایت سے باقاعده بغاوت ہے اور جالب نے ابتدائی دور کی کمزوریوں میں اپنے آپ کو اس طرح کا ایک کامیاب باغی ثابت کیا۔

اُس کے بعد جالب نے اپنے فن میں اظہارِ ایک اور صفت کو اتنی خوبی اور تسلسل سے برتا کر وہ پاکستان کی گزشتہ ۳۰ برس کی تاریخ میں آزاد خی اظہار اور حرارتِ اظہار کی ایک عظمت بن گیا۔۔۔۔۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادی و حرارت کے اظہار میں بھی وہ سلاست، اظہار سے دست کش نہ ہو بلکہ ہمیری رائے کے مطابق، اُس دور میں جالب کی ملک گیر مقبولیت میں اُس کے موضوعات کی اہمیت اور ہمد گہری کے علاوہ اُس کی سلاست، اظہار کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جو بھی کہتا ہے، کچھ اس طرح عام بول چال کے انداز میں کہتا تھا کہ اس کا کلام، پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں براہِ راست اُنکر اُس کی شخصیت میں بچ بس جاتا تھا۔

حبیب جالب ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیرو اور تمام گزشتہ ۳۰ برس کے ادبی منظر میں اُس کی شخصیت شاید واحد شخصیت ہے جس نے بجائے خود ایک تحریک کا منصب ادا کیا۔ ترقی پسند ادب

تقسیم، ہجرت اور فرقہ واریت کے شکار
برصغیر کے کروڑوں افراد کی زندگی کے
عظیم تاریخی المیہ
پر مبنی

ہند کشور و کرّم

کے ناول



کادوسبرائیدیشن

قیمت ۵۰ روپے

پبلشر: ایٹا ایڈوٹرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۱

حبیب جالب نمبر ۱۹۹ء

۱۹۳

عالمی اردو ادب

کی تحریک تو اب تک رواں دواں ہے مگر اُس کی تنظیم آج سے نصف صدی پہلے انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور تنظیم کی ضرورت موجودگی میں کسی واحد شاعر کا تحریک سارے بن کر بنائیاں ہو نا بہت ہی دشوار امر ہے۔ حبیب جالب نے یہ مرحلہ پامرجی سے طے کیا اور اسی لئے وہ معاصر گردو شاعری میں حق گوئی اور بے باک گوئی کی ایک علامت بن گیا۔ ہر فرد اپنی اپنی معاشرتی مجبوریوں کا اسیر ہوتا ہے اور شعر ابھی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اس لئے وہ اس اسیری سے متعلق نہیں ہوتے۔ حبیب جالب بھی آپ کی اور ہمدانی طرح اسی معاشرے کا ایک رکن تھا مگر اُس کا امتیاز یہ تھا کہ اُس نے اس طرح کی کسی مجبوری کے ساتھ کوئی کجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اُس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا گا۔ اُس نے نہ تو دور از کار علامت کا سپہرا لے کر خود کو چلن کے نیچے چھپا یا اور نہ استعارے کو پھیلا کر اپنے ذاتی الغیض کو فنی پینتروں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہ راست کی اور قطعی طور پر مہم اور دو ٹوک انداز میں کی اور اُس نے یہ سب کچھ اُس دور میں کیا جب پہنچ بولنا اُنہاں سرکاٹ کر کھینچ لیا جاتا تھا۔

بے شک اس سے پہلے متعدد شعراء مغل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابلِ قدر کام کر چکے تھے اور غزل کو قدیم دور کے معین موضوعات کے جس سے نکالنے کے لئے زمین ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں بھی ویرانوں میں بدل جاتی ہیں۔ اُس دور میں صرف جالب ہی ایک ایسا شاعر تھا جس نے چھپ چھپ کر جنوں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے اُن ممنوعہ جنوں کا رخ کیا اور اُن میں حق و صداقت اور حوصلہ و جرأت کی ایسی قطعی کاشت کیں کہ خود اُس کے حصے میں تو قہر و جند کی محبوبیتیں آئیں مگر اُس نے آنے والی نسلوں کے لئے پہنچ بولنا آسان بنا دیا۔

یہ طے ہے کہ اُس نے جو کچھ بھی کہا، ہجرت، انگریز جوصلے اور غلوصلے کے ساتھ کہا۔ یہ حوصلہ اسے صداقت کے اقتدار نے بھی دیا اور ملک کے اُن عوام کی حمایت نے بھی جن کی محرومیاں اور جن کے بنیادی حقوق کی کسے پامالی جالب کی شاعری کا موضوع بنی اور اُس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گیا۔ یہ شہرت اور مقبولیت اور عزت اُس پر آسمان سے نہیں پھٹ پڑی تھی۔ اُس نے یہ سب کچھ شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا کہ اُس کی عظیم جدوجہد ہی اُس کا استحقاق تھا۔ پاکستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ میں اُس کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

(فنون لاہور جنوری۔ اپریل ۱۹۹۳ء)

www.3dbooks.com



زبین کا آدمی

حبیب جالب نے بہت کچھ کہا اور خود اپنے بارے میں جو غنقر کہا وہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ کسی اور کو کہنے کو بچا کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی شاعری دس کروڑ عوام کی جہوریت ہے۔ یہ شاعری لوگوں کے لئے ہے، 'لوگوں کی ہے اور لوگ ہی اس کے تخلیق کار ہیں۔ ایک وسیع زمین پر پھیلتی لوگوں کی زندگی اور نصف صدی تاریخ کے آثار چٹھاؤ میں، شاعری کو جو کردار ادا کرنا تھا، وہ سب سے زیادہ حبیب جالب کے حصے میں آیا۔ آج یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ گو ابی کے لئے اس کا کلام سامنے پڑا ہے۔ اس کتاب کو جہاں بھی شروع کرو، دو حوالے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وقت اور سیاست، لوگوں کی حالت اور احساس۔ عالمی سطح پر اور ملک کے اندر کی زمین پر جو کچھ ہوا اور جس طرح سے لمبی ہو، حبیب جالب نے اُس پر غفلوں کا جال پھینکا۔ اور ہمیشہ لوگوں کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر۔

جب لمبی دیکھیں جہاں سے لمبی دیکھیں، جس دور کی نظم کو دیکھیں، تاریخ کا جھروکہ کھلتا ہے۔ اسی جھروکے سے وقت کا آسمان بھی دکھائی دیتا ہے، دنیا میں بڑا ہو، اسامہ اور عوام کے مابین ونگل کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا ہے وہ زمین جس پر دس کروڑ عوام کے ساتھ جالب خود رہتا رہا ہے۔ جالب کی 'امیدیں' انتظار اور تجنیں، 'غفرتیں' وہی ہیں جو پاکستان کے محنت کش عوام کی ہیں۔ جالب کی مرئی ہے، 'مزدورت، خواہش، نظر' اور فلسفہ سبھی کچھ لوگوں کی آزادی، 'خوش حالی اور ترقی کے ساتھ جوڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ شاندار انقلاب ہے، عوامی جہوریت ہے جس کی زندگی کو مزدورت ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ ہے وہ زندگی کے سنائی ہے، یہاں صرف جالب ہی نہیں

اس کھلے حیثیت کو ذہن کی لوٹ کو حالب نے نہ مانا تو لوگوں نے بھی نہ مانا۔ مگر لوگوں کے خلاف تو مسلسل سازشیں چل رہی تھیں۔ اس سازش کو بے نقاب کرنا بھی ضروری تھا عوام کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی طاقت کا شعور دینا بھی۔ صدیوں کی پسپائی اور جہالت نے اس خطے کے عوام کو اپنی طاقت سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ دس کروڑ پر چند لوگوں کی بادشاہی۔ حالب اس بادشاہی کو نہیں مانتا۔ وہ اس طاقت کو برائے راست مخاطب کرتا ہے:

مشتعلیں کرو روشن دور تک اندھیرا ہے کب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
یہ ملیں یہ جاگیریں کس کا خون پیتی ہیں بیکروں میں تو ہیں کس کے بل پر جیتی ہیں
کس کی محنت کا پھل دشتا بن گئی ہیں کاشن تم کبھی سمجھو دس کروڑ انسانوں!

انہیں دس کروڑ انسانوں کی پناہ میں گھرے ہو کر حالب میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ اعلان کرنے لگا "اپنی جنگ جاری رہے گی! اس جنگ میں وہ پورے مشرق میں پھیلے ہوئے عوامی محاذوں کا اتحادی ہو گیا۔ محل کے خلاف کشا کے ساتھ مغرب کے خلاف مشرق کے ساتھ، سامراج کے خلاف پرتگال کے ساتھ۔ مرزاؤں کے خلاف گزروں کے ساتھ۔ سیٹھ کے خلاف سیل میں کے ساتھ۔ حالب کی جنگ کا محاذ لہا ہوتا چلا گیا۔ اس کی مقبولیت لوگوں میں پھلتی پھوٹی رہی۔ کتنی نظائیں اگرچہ سیاسی نہیں مگر کس بہت مقبول عام گیت کی طرح گلیوں اور بازاروں میں گائی جانے لگیں۔

ایوب خان کی آمریت میں زبان بندی کے سخت دستوروں کے ساتھ گماشتہ سرماہ داروں نے اس ملک میں قدم رکھا۔ سامراج نے عوام کے خلاف، انقلاب کے خلاف قلعہ بندیوں کیں۔ حکمران طبقے کو جیش کا خوگر بھی بنایا۔ دولت کی ایڑائی دولت کا ارتکاز ہوا تو مفلسی و بد حالی خوب پھیلی۔ حالب کی آواز اٹھ رہی:

بیس گھرانے آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
حکمران ایوب زندہ باد
آج مجھ ایم پر جاری ہے
کالی صدیوں کی بے داد

پاکستان میں کالی صدیوں کی ایک سائنس ہو گئی تو بی صدی میں یہاں نیوکلونیل دور اتر آیا۔ سیٹھ سینٹھ کے معاہدوں کا پابند ہو کر یہ ملک قعر غلامی میں اترتا چلا گیا۔ مگر حالب کو یہ سب کچھ منظور نہیں تھا۔ وہ سامراج کے مقابل تن کر کھڑا ہو گیا اور سامراج دوست جنکرائوں کا دشمن بن

گیا۔ اس کی جب الوطنی بڑھتی چلی گئی۔ وہ سارے عوام کو خوش حال اور ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ سب کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔ علم و تعلیم کے دروازے سب پر کھلے ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے اگر سارے راج سے آزادی ہو۔ جاگیر داری دوسرے داری کا نظام ختم ہو۔ اگر نوک راج ہو۔ محنت کش کی برتری ہو، تب ہی پاکستان کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ ملک بنا تو کچھ بھی ہونا چاہیے۔ پاکستان کا منشور غالب کے لفظوں میں اس طرح ہونا چاہیے:

روٹی کھڑا اور دوا
مفت مجھے تعلیم دلا
گھر سے نکلو چھوٹا سا
میں بھی ہوں سلطانِ دلا

مسلمانوں کے حق کی حفاظت کا تقاضا تو یہ ہے کہ:

کھیت جوڑیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ

جانب کی شاعری کا پھیلاؤ اتنا ہی ہے جتنا پاکستان کے عوام کا تیسری دنیا کے مظلوم اور ظلم کے خلاف صف آرا ہونے والے انسانوں کا۔ جہاں کہیں بھی ہو کچھ بھی ہو غالب دیوے ہوتا تھا، کراچی میں گولی چلے یا بنگال کی جنگ یا لبو لبان کی جائے۔ فلسطینی بگڑے گھر ہوں یا لبنان جلے۔ طلبہ شہر بدر کے جائیں یا اخبار ضبط ہو۔ عورت کی حیثیت گرائے کا قانون بنے یا نیلوز نجس رہیں کرنا چنے سے انکار کر دے۔ غالب نظم لکھنا، مظاہروں میں جاتا۔ پولیس کی لاشیاں لکھتا۔ چہریت کی تحریک میں آگے آگے چلتا۔ حاکم اس کی طاقت کو سمجھتے تھے۔ لیکن کسی حاکم نے اس کی بات کو نہیں سمجھا حالانکہ وہ صاف صاف جتا دیا کرتا تھا۔ اور آخر میں اس کی کہی بات ہی درست بھی ثابت ہوتی:

محبت گولیوں سے ہو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گھماں تم کو کر رستہ کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منہ زل کھو رہے ہو

اس دور میں لوگوں کی طرف کے شاعر کو جو کرنا چاہیے غالب نے وہ کیا۔ اپنی قلمی کٹنٹ کے ساتھ اپنی سچائی کا غالب کو خود بھی پورا یقین تھا۔ گاہے گاہے وہ اس کا اعلان بھی کیا کرتا تھا۔ نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی۔ خوشامدنی اور درباری سے اسے نفرت تھی۔ ان سے بھی جنہوں نے لو بھلا لہجے کے لئے فن کی حرمت بیع ڈالی۔ ایک فرد کی زندگی کی اوقات ہی کیا ہے، خواہ وہ شاعر ہو یا ادیب۔ یہ بات غالب خوب سمجھتا تھا۔ اس نے کئی بار ایسے شاعروں، ادیبوں

کی زنداکی جود کھاوے کے لئے لکھتے ہیں یا لومہ لڑنے کے لئے۔ عوام کے دکھ درد سے الگ رہ کر اپنی اور اپنے حاکم کی خوشی چاہتے ہیں۔ حبیب جالب کی شاعری کا اثر پھیلتا تھا۔ اچانک کی طرح اس کی آواز اثر رکھتی تھی۔ سخت اندھیری اور لمبی راتوں میں غریب کی کندھ کا یہ دیوا آخر ٹھہ گیا۔ مگر ایک بے مثال جبر و جہد کی مثال چھوڑ گیا۔ آندھیوں سے لڑتے ہوئے ہیرا خ کا استعارہ اب جالب کا نام ہو گا۔ نئے شاعر کے لئے اس نے بہت پہلے وصیت لکھی تھی۔ سچ ہی لکھتے جانا:

دینا ہڑے کچھ ہی ہرجا نہ سچ ہی لکھتے جانا	مت گھبراتا مت ڈر جانا سچ ہے لکھتے جانا
باطل کی منہ زور ہوا سے جوندہ کبھی ہتھ پائیں	اودھ میں روشن کر جانا سچ ہی لکھتے جانا
پل دوپل کے عیش کی خاطر کیا دینا کیا چھکنا	آخر سب کو ہے مر جانا سچ ہی لکھتے جانا
لوح جہاں پر نام تہاں لکھا ہے گا یو نہی	جالب سچ کا دم بھر جانا سچ ہی لکھتے جانا

سچ لکھنے والے نے زندگی بھر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور تنگ بستر مرگ پر بھی جاری رکھی۔ جالب تو چلا گیا۔ جب تک جیسا اس نے سچ ہی لکھا۔ جب اس کی آواز نے ساتھ دیا وہ کڑی اور سخت سچائیوں کو مدھر گیت بنا کر گاتا رہا۔۔۔۔۔ آخری دم تک سچ لکھنے کا اس کا مشن پورا ہوا۔ مگر اس کے خواب پورے نہیں ہوئے۔ نئی دنیا کی شاندار حقیقتیں جالب کی آنکھوں کے خواب تھیں وہ اندھیری غریب بستیوں میں ہیرا خاں دیکھنا چاہتا تھا سماج کو انقلاب آشنا دیکھنے کا تمنا تھی۔ انسان کی عزت ابرو کا خواہاں تھا۔ قوموں اور قومیتوں کی آزادی کا حامی تھا۔ استعمالی نظام کا خاتمہ چاہتا تھا۔ اسے فسرت تھی۔۔۔ سامراجوں سے، ڈکٹیٹروں اور سٹیٹوں سے۔ پولیس کی لاشی اور جاگیر داری کے بدمعاش کلچر سے۔ جالب روشنی چاہتا تھا علم کی عقل اور انسانیت کی۔ اس نے محنت کش کو آسودہ زندگی دینے کے وعدے کر رکھے ہیں۔ اس کی شاعری میں ایک آدرش ہے۔ ایک مستقبل کا خواب۔ مستقبل جو زندگی کو آسودہ کرتا اور آگے بڑھتا ہے۔ محرومیوں سے نکالتا استحصال سے بچاتا ہے۔ خوش حالی کے کعبہ لہا رہا ہے، بھکاری بچوں کے لئے اسکول کھولتا ہے۔ بے بضاعت عورتوں کے لئے آبرو مندی کے مقام بناتا ہے۔ وہ مستقبل جو اس صدی کے شروع میں دنیا کی دھرتی کے کچھ حصوں پر اتر آ تھا جس نے کارخانے کھولے۔ برائقل ہاؤسس بند کئے۔ جس نے کسان کے لئے کیون بنائے۔ مزدور کے لئے شاندار یونین قائم کی۔ اسی مستقبل کے لئے پاکستان کی دھرتی بھی آس لگائے بیٹھی ہے۔

جالب وعدہ کر کے گیا ہے کہ آس ٹوٹے گی نہیں۔ وہ صبح ضرور آئے گی اور وہ جہد حسین جس کا وعدہ ہے۔ جس کا انتظار ہے اس دھرتی کو۔ اسس بر لمبی ہوئی ہر ایک غریب بستی کو وہ کہتا ہے:

میں ضرور آؤں گا اک عہد حسین کی صورت
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحقیر کی نظر سوں سے نہ دیکھے گا حسین
پیارے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
ہمارا آگائے گی نگاہوں کو سلکوں جیسے گی

یہ زمیں خلد بریں کی صورت

میں ضرور آؤں گا اک عہد بریں کی صورت

اس عہد میں کیا کچھ ہوگا۔ دیی حالہ کے خوابوں کی تعبیر ہوگی۔ وہی انسان کی عزت ہوگی۔
دیی غلامی سے نجات ہوگی۔ سبھی کچھ بدل جائے گا۔ نظام بھی کتاب بھی اور زبان بھی:

ایسے الفاظ نہ اور اقلت میں ہوں گے

جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے

ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے

چند لوگوں ہی کی تشکیم کا پہلو نکلے

خون نہ روئے گا کبھی درد کی تنہائی میں

دل کسی خاک نشین کی صورت

میں ضرور آؤں گا اک عہد حسین کی صورت

وہ عہد حسین جس میں اولاد آدم غلاموں اور آقاؤں کے گھبرے تو ذکر ایک جگہ کھڑی ہوگی حاکم
محکوم، ظالم مظلوم بنانے کا دستور مٹ جائے گا ایسے الفاظ بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے انسان کا وقار

مخروج کیا جاتا ہے: کسی لہجہ سے نہ مخروج سماعت ہوگی

جہل سے نازاٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو

یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا

آس کے دیہ بچانے نہ پڑیں گے ہم کو

غم کے ماروں کی ہر شاخ چمک اٹھے گی

صبح فرخندہ جمیں کی صورت

میں ضرور آؤں گا اک عہد حسین کی صورت

کیوں نہیں، حالہ بزین کا آدمی تھا۔ زمین کا آدمی ہمیشہ لوٹ آتا ہے۔ اور کسی نئے عہد میں
ہی اس کی واپسی ہو کر تی ہے۔ (ماہنامہ منشور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

اردو اکادمی، دہلی کے سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات

کے

کتلی روپ

- | | | |
|---|-------------------------------|----|
| ☆ دہلے (جلد اول) | مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین | ۳۶ |
| ☆ دہلے (جلد دوم) | مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین | ۵۰ |
| ☆ مولانا یحیٰ کلام آزاد شخصیت اور کارنامے | مرتب : ڈاکٹر طیفی انجم | ۳۸ |
| ☆ دانش نامی حیات اور کارنامے | مرتب : ڈاکٹر جلال قریشی | ۳۶ |
| ☆ خواجہ حسن نظامی حیات اور کارنامے | مرتب : خواجہ حسن نظامی | ۳۹ |
| ☆ اردو صحافت | مرتب : انور علی بانوی | ۳۳ |
| ☆ دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل | مرتب : صدیق الرحمن قندلوی | ۳۳ |
| ☆ اردو فن | مرتب : کمال قریشی | ۳۰ |
| ☆ نیا اردو انسانہ تجزیہ اور مباحث | مرتب : پروفسر کرنلی چند نارنگ | ۶۰ |
| ☆ نئی تعلیمی پالیسی اور تدریس | اردو اکادمی کی پیش کش | ۳۰ |
| ☆ اردو مریض | مرتب : ڈاکٹر شاربہ مدلولی | ۵۰ |
| ☆ نیا انسانہ مسائل اور مضامینات | مرتب : پروفسر قمر بخس | ۳۸ |

اردو اکادمی، دہلی۔ مکتبہ سجدہ، دریا گنج، نئی دہلی-۲
فون : ۳۲۷۳۱

جالب کے دو کبیوتر

پاکستان سے علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرے کی آڈیو کیسٹ اوسلو پہنچی تو دوستوں نے شوق سے ایک اجتماع کا اہتمام کیا اور کان سپیکروں سے لگا دیئے۔ جالب کی باری آئی تو وہ اشعار سناتے سے پہلے بولے۔۔۔۔۔۔ ”علامہ اقبال ڈیوٹی لگا گئے تھے، آٹھ سو مہری دنہا کے غریبوں کو جگادو۔۔۔۔۔۔ اور میں ڈیوٹی لگھکتانے کے نتیجے میں کوئی پندرہ مرتبہ جیل جا چکا ہوں۔“

”گنہگار در“ ۱۹۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی تو جالب کی پہلی کئی کتابوں کی طرح اسے بھی بین کر دیا گیا۔ سوڈن کے ایک مکتبہ نے اس مجموعہ کا نیا ایڈیشن شائع کر دیا۔ تب ناروے سے حبیب جالب کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا گیا کہ وہ اوسلو تشریف لائیں۔ سکندریے نیویا کی خوش قسمتی کہ شاعر کا جواب اشہات میں آگیا۔ اب ضرورت تھی ایک خط کی جو نارویجن حکام کے نام اس مہارت سے لکھا جاتا کہ اسلام آباد میں نارویجن سفارت خانہ ہمارے مہمان کا ویزہ روکنے کی کوشش نہ کرتا۔

ویزہ نہ ملنے کے خدشات اس نے بھی تھے کہ سوڈن سے شائع ہونے والے ایڈیشن کے پیش لفظ میں سید حسن صاحب نے لکھا تھا۔۔۔۔۔۔ ”مہنگائی کے اس دور میں ایک اور چیز (خون کا وہ پہلہ ذکر کر چکے تھے) بہت سستی تک رہی ہے اور وہ ہے غذائی کمی کی تہمت۔ یہ تماشا ہم گزشتہ چوتھائی صدی سے دیکھ رہے ہیں۔ جو شخص استبداد کے تاریک ملک کو اللہ کی

رستی نہیں کہتا، پاکستان کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ پھر حبیب جالب میں کون سے سرخاب کے ہرنگے لگے کہ اس پر یہ الزام نہ لگتا۔

چنانچہ ملے پالے نادر و بجن حکام کے نام و نیزے کے لئے خط کسی نادر و بجن دوست کی مدد سے لکھا جائے۔ یہی وہ لکھنؤ صاحب انیتا سے جالب کا غائبانہ تعارف کرا یا گیا۔ اُس نے بتا یا کہ خط میں یہ مت لکھو کہ اُس کے دشمن کیا کہتے ہیں بلکہ یہ بتاؤ کہ خود شاعر اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اُس کے دوستوں کا اُس کے بارے میں کیا خیال ہے۔

جالب کا اپنے بارے میں ایک موقف تو بہت واضح تھا۔ اُس نے کئی موقعوں پر کہا تھا کہ معاشرے میں دو ادارے ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ایک دربار کا ادارہ اور دوسرا عوام کا۔ خود کو انہوں نے ہمیشہ عوام کے ادارے سے منسوب کیا تھا۔

دوستوں کے بارے میں سوچتے ہی فراق گورکھپوری کا خیال آتا جنہوں نے کہا تھا —
 ”میرا بانی کا سوز اور سرور اس کا نذر جب بیکجا ہو جاتے ہیں تو اُسے حبیب جالب کہتے ہیں۔ پھر فیض صاحب کی مات بھی یاد آتی۔“ دلی دکنی سے لے کر آج تک کسی بھی شاعر کو اتنے سامعین میسٹر نہیں آتے جتنے حبیب جالب کو ملے ہیں۔

اس آئندہ کو تو فوراً جھٹک دینا ہی مناسب لگا۔ دلی دکنی، فراق گورکھپوری، میرا بانی اور سرور اس — یہ سب نام مغرب کے لئے اجنبی تھے۔ پھر اُس کتاب کا خیال آیا جو لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے جالب کی پچاسویں سالگرہ پر اُسے پیش کرنے کے لئے لکھی اور شائع کی تھی۔ اُس میں جالب کو اُس کی کارکردگی پر خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس کے لئے سوال تھا کہ کوئی اس خراج تحسین کا کسی مغربی زبان میں خلاصہ تیار کرے۔ چنانچہ اس پتھر کو بھی جوم ہی کر چھوڑا پڑا۔

تب کراچی پریس کلب کی اُس تقریب کا خیال آیا جس میں حبیب جالب کو لائق ممبر شہب دی گئی تھی۔۔۔۔۔ اس موقع پر سبط حسن صاحب نے قدیم یونان کے ادیب سوفوکلز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ حبیب جالب جیسا شاعر تھا۔ اُس نے بہت پہلے یہ بتا دیا تھا کہ اگر ریاست کے قانون اور فرد کے ضمیر میں تعادل ہو جائے تو انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے سوفوکلز کے ڈرامے ”آئینی گوئی“ کی عنقریبھی بھی سنائی۔ جس کے مطابق بھائی کی لاش بے گور و کفن رکھی ہے اور اس کی تجہیز و تکفین کرنے والے کے لئے موت کی سزا ہے۔ بہن مرنے کی ہوا کئے بغیر اپنے بھائی کو دفنانا ہے اور ساری جاتی ہے۔ سبط صاحب کے مطابق سوفوکلز نے یہ نتیجہ نکالا کہ

حبیب بھی ضمیر اور ریاست میں تعادم ہو تو انسان کو اپنے ضمیر سے وفاداری نبھانی چاہیے۔
 اس گفتگو میں سید حسن صاحب نے بتایا کہ مملکت اور وطن دو الگ چیزیں، دو الگ حقیقتیں ہیں
 مملکت تو انسان کی بنائی ہوئی ایک مصنوعی چیز ہے جب کہ وطن ایک قدرتی حذر ہے۔ وہ ماں کا پیار
 ہے۔ اُس سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے؟ حبیب جالب اس فرق کی زندہ مثال ہیں۔ انہوں نے
 اس فرق کو محسوس کر لیا ہے کہ مملکت اور وطن میں فرق کیا ہے۔ اُن کی شاعری وطن اور اہل وطن کی
 محبت سے بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے بگھیا لہو لہان ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وطن کو مانتا ہوں
 لیکن جو بھی قانون تم بناؤ، دستور بناؤ اور حکم دو۔ اُس کو بھی میں آنکھیں بند کر کے مان لوں
 یہ ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے حبیب جالب ہمیشہ سے مادر وطن کی محبت کی علامت ہیں اور ان
 کا کلام، اُن کی زندگی ایک سکون پرور سعادت مندی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کر کے اپنی مادر
 وطن سے محبت کا اعلان کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کا خلاصہ سن کر انیتانے خوشی خوشی خط لکھ دیا۔ اسلام آباد میں نارویجیوں
 سفارت خانے نے دیرہ جاری کر دیا۔ جالب کی سیٹ بک ہو گئی۔ مقررہ تاریخ کو اسلام آباد ایئر پورٹ
 سے جہاز پر سوار ہونے کے لئے ڈیپارچر لاؤنج سے دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز پر سوار
 ہونے کے لئے نکلے۔ جالب ابھی جہاز کی سیڑھیوں تک نہیں پہنچے تھے کہ حکومت کے کارندوں نے
 اُن کو بیرون ملک کے سفر سے منع کر دیا اور ان کا پاسپورٹ بحق سرکار منبط کر لیا۔

ابہ اوسلو میں دوسٹوں کے فرائض دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ تھا پاکستان میں
 جالب کے حقوق کے لئے مشیر کے دوسٹوں سے رابطہ قائم کرنا اور دوسرا حصہ تھا سکندریہ نیویا میں
 اہل قلم کو متحرک کرنے کی کوشش۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انیتا کو جالب کی شاعری اور زندگی
 کے ساتھ تفصیلی تعارف کی خواہش پیدا ہوئی۔ ناروے میں پاکستان اور پاکستانیوں کے مثبت
 تعارف کے لئے متحرک دوسٹوں نے خوشی خوشی یہ ذمہ داری نبھائی۔

تہا انیتانے بتایا کہ جالب کی کہانی اُسے ناروے اور سوڈن کی دیو مالائی یاد دلاتی ہے۔ جس
 میں جبرأت اور صاف گوئی کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس میں گرمی اور روشنی کے دیو تاخیر کی
 علامت ہیں۔ شدید سردی اور تاریکی کے صغیریت، دیوتاؤں کے دشمن ہیں۔ سب سے بڑا دیوتا
 اُودین ہے جو دھنک کے پل کے ہار رہتا ہے۔ اُس کے کندھوں پر درد پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک
 خیال اور دوسرا حافظ۔ وہ دن میں ایک مرتبہ ساری دنیا کا چکر لگاتے ہیں اور اودین کو دنیا بھر
 کے حالات سے باخبر کرتے ہیں۔ اُودین منتخب سورماؤں کے لئے منیافتوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

یہ وہ پہلا درجہ جو مسلمان جنگ میں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کو کھواروں نے دھنک کا ٹیل ہار کر کے دباں بھونچا ہاتھا۔ یہ سورے لڑتے ہی اور مرتے ہیں لیکن ان کے زخم معجزانہ طور پر مندمل ہو جاتے ہیں۔ تو یہ زندہ ہو کر کھر لڑتے ہیں۔ دیو مالا کے مطابق ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب سورج دھند ہو جائے گا۔ زمین سمندر میں ڈوب جائے گی۔ ستارے اور آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ مھر خداوند خدا دنیا آسمان اور نئی زمین بنائے گا جو سمندر سے نمودار ہوگی۔ دنیا نیکی سے بھر جائے گی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی ہوگی اور ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو جائے گا۔

اس دوران خبر آئی کہ عابد حسن منٹو نے حالہ کے پاسپورٹ کے لئے قانونی چارہ جوئی شروع کر دی ہے۔ مھر بہت جلاک پاسپورٹ مل گیا ہے۔ تب حالہ یورپ آکر پہونچا۔ میترو اور لورٹ نے اس کا استقبال کیا۔ اب اس نے ہر دیس میں بیٹھے اپنی وطن کی محبت میں ملاقات کے لئے ترتیب دی گئی شاموں میں پہونچتا شروع کیا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کی شام یورپ کا ایسا پہلا اجتماع اوسلو میں تھا۔ پتے کے اپریشن کے بعد اس کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ وہ قدم داسٹافن کے سورما کی طرح جرأت اور صاف گوئی کے ہتھیار لے کر ہمارے مھر مسلمان زار میں دیوارِ حضرت کو لٹکا رہا تھا۔

انیتا اُسے تاروے کے آزاد خیال روزنامے ”داگ بلاڈ“ کے دفتر لے گئی۔ اگلے روز پورے محلے کا انٹرویو لیا۔ حالہ کے کھڑا پ کے ساتھ۔ صحافی نے سرفی لگائی تھی: ”وہ جو لکھے سب ہیں۔“

”بین الاقوامی اداروں نے ابھی تک حالہ کو بھجواتا نہیں؟“ ایک روز انیتا نے پوچھا۔

”صرف ایسٹری نیٹل نے۔ انہوں نے اسے فوجی آمریت کی قید کے دوران حمید کا قہدہ دی قرار دیا تھا۔“ ایک دوست نے بتایا۔

مھر سنا کہ حالہ یورپ سے واپس پاکستان چلا گیا ہے۔ وہ سالہا سال تک مسلمان جنگ میں ایک دیو مالا کی کردار کی بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس کو کئی زخم آئے۔ وہ مندمل ہو گئے تو وہ قدیم سورماؤں کی طرح مھر دیوارِ حضرتوں کے ساتھ خبردار آ رہا ہو جاتا جو شتر کے مظاہر تھے۔ صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ اس کے پاس نظر بیٹے اور حافظ کے دو کپڑے جو دنیا بھر کی صورت حال سے اُسے بھر پور بنا کر رکھتے تھے۔

اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ مورخ ۱۲ مارچ ۱۹۹۲ء کو حبیب حالہ دھنک کا ٹیل ہار کر گیا ہے۔ انیتا کو یقین ہے کہ اودین ایک بہت بڑی ضیافت کا بند ولہت کرے گا جس میں حبیب حالہ کے ساتھ کل عالم کے دوسرے افس جیسے سورما بھی مدعو ہوں گے۔

اوسلو میں بہت سے دوست انیتا کی باتوں پر اختیار نہیں کرتے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ انیتا کی بات سچ ہو رہی ہو حالہ کے کبوتران کے پاس آتے رہیں گے۔

حبیب جالب ایک پاکہر ملاقات

وہ بھی حبیب ملاقات تھی۔ ۱۰ تا ۱۲ فروری ۱۹۸۹ء کو لاہلی میں دوسری عالمی اردو کانفرنس تھی۔ سمینار میں، میں بھی مدعو تھا۔ ۹ فروری کو دہلی پہنچا۔ راقز الونو۔ عالمی اردو کانفرنس کے دفتر میں، منتظمین، سربراہ اور وہ شخصیات اور بعض مدعوین موجود۔ کانفرنس کا انتظام کچرانا باصابطہ، مقفیع اور مستبحہ کر بہت کم کانفرنسوں دھڑے میں ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ مدعوین کے قیام کا انتظام ہوٹل جن پتہ اور ہوٹل رنجیت میں۔ مدعوین کے ناموں اور ہوٹلوں میں ان کے لئے مختص کردہ کمروں کے نمبروں کی فہرست لئے منتظمین موجود۔ دو ایک منٹ میں ہتھوڑا گیا کہ میرا قیام ہوٹل جن پتہ کے کمرہ نمبر ۳۴ میں ہوگا۔ اور چند منٹ میں ہوٹل جن پتہ۔ استقبالیہ پراسی اندر اخراجات کے بعد میں اپنے کمرے میں۔ یہ ڈبل روم تھا۔

چائے پانی اور کچھ سسٹانے کے لئے لیٹا ہی تھا کہ کمرہ کی گھنٹی بجی، دروازہ کھولا۔ روم لوائے کے ہمراہ ایک صاحب، وجیہ شخصیت، اونچا قد، تن و توش معقول، ایک جہاں کے خوب و خراب کو دیکھی ہوئی آنکھیں، قدرے گندمی مائل رنگ، نیچے نقوش، چہرے، بالوں اور لباس، غرض ہر طرح آراہ و خود میں، طرح دار، آشفٹ مزاج! ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندوستان سے دور، گویا اس معاشرہ میں رہتے ہوئے اس معاشرہ سے دور، بےزار نہیں بے نیاز۔ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ میں حبیب جالب سے مل رہا تھا۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ میں بھی ان کے لئے ایسا نیا نہیں۔ وہ صابر دت کے ”فن اور شخصیت“ کے فیض احمد فیض اور قتیل شفائی نمبروں میں خاص طور پر مجھے پڑھ چکے تھے۔ ان کے کئی اشعار میرے نوٹ زباں تھے۔

چند ایک اشعار تو اسی وقت یاد آگئے۔

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو چیتا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہرگز سائیں انگلستان ہوتا
مری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلے سے میں جو اردو دان ہوتا
زمینیں مری مرصوبہ میں ہوتیں
میں والہ صبر پاکستان ہوتا

میں نے عرصہ قبل جب یہ اشعار پڑھے تھے اور اپنے کسی مضمون میں ان کا حوالہ دیا تھا تو سوچتا تھا۔ یہ شاعر کیا ہو گا جس نے اس جرأت کے ساتھ اور اس دو ٹوک انداز میں اظہار خیال کیا ہے، طنز کتنا کاری تھا، ضرب کتنی شدید تھی۔ مجھے ایسی توقع نہیں تھی کہ کبھی حبیب جالب سے مل سکوں گا اور اب جو ملنے کا موقع ہوا تو ایسا کہ ایک ہی کمرے میں ان کے ساتھ رہا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں میں رسمی انداز رہا اور پھر وہ ایسے ملے جیسے کوئی اپنے چھوٹوں سے ملتا ہے اور میں نے بھی اپنے کسی بزرگ کی طرح ان کا احترام کیا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل ہی حبیب جالب کی طبیعت خراب تھی۔ وہ نہ آئے، لیکن دہلی کی یاد، جس سے ان کے کئی اشعار بہکتے اور آباد ہیں۔ اور دہلی کے دوستوں کی یاد انہیں یہاں کھینچ لائی۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ اس سے پہلے بھی انہیں ہندوستان آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور اب جو اجازت ملی تو انہوں نے غنیمت جانتا۔ سفر خواہ طیارہ کا ہو اور خواہ کتنا ہی مختصر، بہر حال سفر ہوتا ہے اور پھر ایسے شخص کے لئے جس کی طبیعت ناساز ہو۔ جالب صاحب کی طبیعت کچھ اور خراب ہو گئی۔ انہوں نے سوٹ کیس سے دو اسٹیاں نکالیں، نجد سے پانی لانے کے لئے کہا۔ وہ وقفہ وقفہ سے دو اسٹیاں استعمال کرتے رہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ میں ان کی مدد کرتا، سنبھالتا۔ ہاتھ روم جانے کے لئے انہیں سہارا دیتا۔ انہیں اس کا احساس تھا۔ میں جو ان کے لئے ایک ”اجنبی“ تھا ان سے ”اپنوں“ کی طرح پیش آ رہا تھا۔ وہ تکلف کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی حالت ایسی نہیں تھی۔ میں مکمل حد تک لکھنے بیٹھنے، دوا کے استعمال میں اور ہر طرح ان کی اعانت کرتا۔ وہ سرتاپا مومن ہوتے اور دعائیں دیتے۔ شام ہوتے ہوتے ان کی طبیعت کچھ اور خراب ہو گئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کہا۔ اسی دوران قلیل شفائی صاحب پاکستان سے اور اسد مفتی بالینڈر سے عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ ان دونوں سے جالب صاحب کے نہایت گہرے مراسم۔ اسد مفتی تو جالب صاحب کے عقیدت مندوں میں نکلے۔ جالب صاحب کے کہنے پر میں نے ان دونوں کو جالب صاحب کی ناسازی مزاج کی اطلاع دے دی۔ وہ دونوں آئے اور چند احباب بھی۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی آگیا۔ اس نے دو اسٹیاں لکھیں۔ میں نے لاکھ امرار کیا کہ دو اسٹیاں لے آتا ہوں۔ وہ ہندوستان

میں سمجھان ہیں اور میزبان کے فرائض مجھے انجام دینے چاہئیں لیکن اسد مفتی نہیں مانے وہ گئے اور دوستیاں لے گئے۔ بعد میں وہ اور قاتل شفا فی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ رات بھر حالب صاحب بے چین سے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے قدرے آفاقہ ہوا۔ اب وہ شعروادب کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو شاعری۔ مروجہ رجحانات، نئے میلانات، کچھ تو فحاشات، کچھ نا اُمیدیاں۔ معاشرتی اور سیاسی حالات۔۔۔ انہیں صرف پاکستانی عوام سے اور دہلی کی اُمریت سے شکایات نہیں تھیں۔ انہیں دنیا کے خواہ کسی بھی علاقے کے ہوں مظلوم اور مقہور عوام سے ہمدردی تھی۔ انہیں جابر، آمر اور ظالم حکمرانوں سے ہمدردی نہ تھی خواہ وہ دنیا کے کسی علاقے کے ہوں اور خواہ کسی عنوان سے حکومت کرتے ہوں۔ انہوں نے کبھی کسی ملک کا نام نہ کرنا کسی شخص کے ساتھ گفتگو نہیں کی۔ وہ مجموعی طور پر انسان کے دکھ درد اور انسانیت کی اصلاح و فلاح کی بات کرتے۔ انہیں امریکی اور برطانوی سامراج سے نفرت تھی لیکن امریکی اور برطانوی عوام کے بارے میں انہوں نے بُرا نہیں کہا۔ وہ سمجھتے تھے یہ حکمران ہیں جو اپنے ذاتی اور خاندانی مفادات کے لئے عوام کے حق میں قہر و غضب پینے ہوئے ہیں۔ ریگن اور برطانوی حکمرانوں ہی کے بارے میں انہوں نے برملا اور نام لے کر نہیں کہا بلکہ ایوب خان کے بارے میں بھی انہوں نے کسی رورجائیت کے بغیر قلم اُٹھایا۔ ایوب خان کے دور میں حبیب حالب کی شاعری کی بڑی دھوم مچتی۔ انہوں نے اپنے کئی اشعار میں ایوب خان کا نام لے کر اظہارِ خیالات کیا ہے۔ اور ایسے میں ان کی نظم ”بیس گھرانے“ غیر معمولی مصروفیت کی حامل ہو جاتی ہے جس کو ایک زمانے میں شہرت بھی حاصل رہی۔۔۔ حبیب حالب کی شاعری ہے بھی احتجاج اور بغاوت کے عناصر سے بھرپور۔ ایسے موضوعات پر گفتگو کرتے وقت اُن کا لہجہ اور اُن کی شخصیت بھی احتجاج اور بغاوت کی تفسیر اور تعبیر ہو جاتے ہیں۔ وہ گفتگو کر رہے تھے۔ اپنی علالت کے سبب انہیں دھیسے بچے ہی میں بات کرنی چاہیے تھی لیکن یہ اُن سے کہاں ممکن تھا۔ وہ تو کھپکھپکے ہیں۔

اور سب بھول گئے مترف صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا
لاکھ کچھ رہے ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے برا جارت لکھنا
اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحب شروت لکھنا

اُردو میں احتجاجی شاعری ابتدا سے رہی ہے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مسائل، معاملات اور اقدار کے خلاف احتجاج ہمارے شاعروں کے فیر میں رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی شاعری مہم اور اشارتی نہیں ہو سکتی۔ احتجاج واضح اور برملا ہونا چاہیے اور ایسا جو فوراً سمجھ میں آجائے۔ اُردو

کی احتجاجی شاعری میں حبیب جالب کی شاعری کو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل رہے گا کیونکہ انہوں نے جو بات بھی کہی بر ملا کہی ہے۔
ہم کبھی نہ چھوڑیں گے بات بر ملا کہنا ہاں نہیں شعرا اپنا دُرود کو دوا کہنا

یا

مجرے خفیف ہیں مرے ہمعمر اس نے میں داستانِ عہدِ ستم کھل کے کھر گیا
قطع نظر اس کے اُن کے شعری مجموعوں کے عنوانات ”سرمقتل“، ”عہدِ ستم“، ”ذکر بہتہ
خون کا“ اور ”گوشتے میں قفس کے“ وغیرہ اُن کے احتجاجی مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔
حبیب جالب نے قید و بند کی مصوبتیں سہیں، حکمرانوں کو لٹکارا، اُن کو چیلنج کیا، اُن کو اُن کے
انجام سے باخبر کیا۔ اُس کی پروا کئے بغیر کہ خود اُن کا انجام کیا ہوگا؟ حبیب جالب سے گفتگو کرتے
ہوئے مجھے جو اُن کے اشعار یاد آئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا۔
تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پر استناب ہی یقین تھا

ایسا بانکا اور طرح دار شاعر جس نے عوامی جذبات و احساسات، مظلوموں اور بے کسوں کی دلی
کیفیات کی اپنے قلم سے مصوری کی، قطعی ایک جڈاگانہ ماحول میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس دورانِ قلیلِ شغاف
اور دیگر اصحاب بھی آتے رہتے۔ عالمی اُردو کانفرنس کے اجلاس جاری تھے۔ مجھے شرکت کرنی تھی۔
حبیب جالب صاحب نے کہا کہ وہ تو اب مشاعرے میں شرکت کریں گے میں اجلاس میں شرکت کے لئے
روانہ ہوا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اُنہیں تنہا چھوڑوں لیکن منتظمین کے تعاون سے دوا اور اُن کے کھانے کا
انتظام کر کے روانہ ہوا۔ عالمی اُردو کانفرنس کے منتظمین کا رویہ نہایت مخلص اور ہمدردانہ تھا۔
میں صبح کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد واپس ہوا۔ حبیب جالب صاحب قدرے بہتر تھے۔
اتنے میں وہ اُٹھے اپنے سوٹ کیس سے کتابوں کا پیکٹ نکالا جس میں اُن کے کلیات ”حرفِ سردار“ کی چند
کاپیاں تھیں۔ ایک کاپی نکالی اور اُس کے سر درزی کے بعد کے کسی صفحہ پر لکھا: ”مخلص دوست، ہمدان
اطم حادید کی نذر۔ حبیب جالب، ۱۰ فروری ۱۹۸۹ء“۔ میرے جذبات عجیب تھے۔ اُن سے
ملاقات ہوئے ابھی ۲۷ گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے لئے ایسا کیا کیا تھا۔ لیکن انہوں نے
اس قدر محسوس کیا۔ یہ دراصل اُن کا خلوص، عنایت اور شفقت تھی۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ”حرفِ
سردار“ کی بیکاپی قبول کی۔ قبل ازیں حبیب جالب کے بس ایک دو شعری مجموعے نظر سے گزرے
تھے اور بعض جرائد میں اُن کا کلام دیکھا تھا لیکن اب جو اُن کا کلیات ملا تو پتا چلا کہ اُن کے تاحال کتنے

شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ”مہرگ آوارہ“، ”سرمقتل“، ”عهدِ ستم“، ”ذکر بیت خون کا“، ”گوشتے میں قفس کے“ اور ”گنبد بے در“۔۔۔۔۔۔ ”سرمقتل“، ”ذکر بیت خون کا“ اور ”گنبد بے در“ تو ان کے وہ مجموعے تھے جن کو حکومت پاکستان نے ضبط کر لیا تھا۔ ”حرف سردار“، ”اُن سارے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ اتنے میں انہوں نے بتایا کہ میرے جانے کے بعد جو اہلال نہرو پبلیشرز سے کچھ طلبہ آئے تھے اور انہیں مدعو کر کے گئے ہیں۔ دعوت نامہ تحریر ہی بھی تھا۔ مجھے بتایا۔۔۔۔۔۔ جڑے سرور تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اپنے احباب کے بارے میں بے اختیار انداز میں ٹوٹ ٹوٹ کر گفتگو کرتے رہے۔ علی سردار جعفری، اسد حسین، محمد حسن و مخدوم اور نہ جانے کن کن کے بارے میں۔ لیکن سب کے بارے میں ان کا انداز اپنا شیئت کا تھا۔ تقسیم ہند اور ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کے بارے میں اہل سیاست جا نیں لیکن حبیب عالم تبھی اور ادبی طور پر اُس کو بہت بڑا زبان تصور کرتے تھے بلکہ آپنی نے جب بھی گفتگو کی پاکستان کو اپنا سمجھا اور نہ ہندوستان کو غیر۔ بلکہ یہ دونوں ممالک اُن کے اپنے تھے۔ اُن کی تو ایک نظم کا مصرعہ ہی ہے یہ ہے

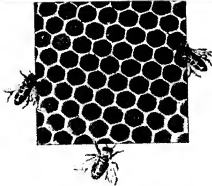
شاعروں میں رہے۔ مشاعرہ پڑھنے کے بعد ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ انہوں نے غیر معمولی بارش جو نہیں لیا جانا چاہیے تھا ان کی صحت بہ برداشت نہیں کر سکی۔ منتقلین فوراً انہیں دواخانہ لے گئے۔ میں متراد و سوشلسٹ تھا لیکن کیا کرتا۔ ان کے ساتھ بس، ایک ادھر کوئی گیا تھا۔ مشاعرہ



کے خاتمے پر کھانے سے فارغ ہو کر رات دیر گئے جب میں ہوٹل پہنچا کروہ معقل پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دواخانہ میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اُس وقت دواخانہ جانے کی صورت نہ تھی میں نے سوچا تھا کہ صبح دواخانہ ہو آؤں گا لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ مجھے صبح ۹ بجے کی ٹرین سے واپس ہونا تھا۔ کانفرنس ختم ہو چکی تھی، شرکار واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے بھی جلد ہی تھی۔ منتقلین سے رابطہ بہت آگیا لیکن وہ کیا کرتے وہ بھی مجبور تھے۔ میں نے حبیب جالب صاحب کے سامان کے بارے میں ققیل شفاقی صاحب سے کہہ دیا اور کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح اُس وقت ہوٹل جن ہتھ (دہلی) سے لوٹا، اُن سے واپسی میں ملاقات نہ کرنے کا افسوس رہا، آج بھی ہے۔ ہاں اُس کے بعد کسی بھی سمینار وغیرہ میں دہلی میں ققیل شفاقی صاحب سے ملاقات ہوئی، حبیب جالب کا بھی ذکر آیا۔ اور آج جب اُن کے تعزیتی اجلاس کے بارے میں پڑھا تو آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے تو انہیں بیمار دیکھا تھا لگا اسی بیماری نے آخر ان کا کام تمام کیا ہو۔ **إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ** میرے اُن سے کچھ ایسے مراسم نہیں تھے۔ میں نے کچھ ایسی ملاقاتیں بھی نہیں کی تھیں۔ خط و کتابت بھی نہیں رہی۔ بس یہی دو تین روز کی ملاقاتیں جو آج بھی تابندہ ہیں اور میرے وجود میں ہمیشہ تابندہ رہیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ حبیب جالب نے جو سوچا، وہ کیا اور وہی لکھا۔ اُس کو اپنا فن ہی نہیں اپنی زندگی بھی بنالیا۔ ایسے لوگ کہاں ہیں؟

(ہماری زبان نئی دہلی ۸ جون ۱۹۹۳ء)

یہ تصویر 22 سال کی انتہک خدمات کا نتیجہ ہے



گھر کی تصویر۔ دراصل یہ بھارت کے طول و عرض میں پھیلے زائندہ 55 لاکھ گھروں کی تصویر ہے اور اس کے بعد کی تصویر مزیداد و خوش و خرم کنواں کو دکھاتی ہے۔ مکان فراہم کرنا کہ جنہیں وہ اپنا کہہ سکیں اور آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ہڈیوں کی گزشتہ بائیس سال سے زائد عرصہ کی کامیابیوں کی نشاندہی کرنے والی سرگرم محفل مکینوں کے جتنے کی یہ تصویر کسی بھی دیگر تصویر سے کیوں لگتی ہے۔

- 12660 کروڑ روپے لاگت کی 9550 سکیموں کے تحت 55 لاکھ سے زائد گھروں کو سرمایہ فراہم کیا گیا۔
- کل 5377 کروڑ روپے کا اجراء کیا گیا، 5000 سے آگے بڑھنے کا سبب مل ہار کر رہا گیا۔
- دیہی علاقوں میں 25 لاکھ مکان فراہم کئے گئے۔
- تیس ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں کمزور اور کم آمدنی والے طبقوں کے لئے 90 فیصد تک قرضے کی فراہمی۔
- بنناحقوں کے چھ لہجوں اور سولہ کوکر پیچھے قاتالی کے موثر اور غیر روایتی جدید طریقوں کا استعمال کم لاگت مکانوں کی تعمیر کا ایک مربوط حصہ ہے۔
- بیس لاکھ سے زائد بنیادی اور کم لاگت صفائی کی اکیٹیوں کا قیام نہر صحت کے لئے مفید پانی کی فراہمی۔
- مکانات کی تعمیر کے بعد بدستور سامان کی کمانڈی کو فروغ دینے کے لئے ملک بھر میں 175 جہازیں مرکزوں کا حال۔
- موجودہ مکانات کے اسٹاک کو محفوظ رکھنے کے لئے مکانات کی مرمت اور تجدید کاری۔
- بہتر فیکٹوری کی فراہمی کے لئے انسٹی ٹیوٹ آف ہاؤسنگ اسٹڈیز روڈ ٹرام کے اشتراک سے ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا قیام
- اور اس کے علاوہ..... ملاحظہ کیجئے کہ اس سال ٹیکس سے قبل 88.4 کروڑ روپے کا سامان۔ اور آپ کو 9 ہڈیوں ایک ایسی تصویر جو اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں دیکھی۔

عوام کے لئے گھر مہیا کئے جا رہے ہیں

ہڈیوں ٹیکس 31-61037 اپنی پورٹی سی ٹی بی گرام: ہڈیوں ٹیکس 4625308 110003 جون 699534

نور علی آفس: صدر اس راجنل آفس احمد آباد، بنگلور، ممبئی، بھوپال، بھونیشور، کلکتہ، چنئی، گڑھ، دہلی، گواٹی، حیدرآباد، پور، لکھنؤ، ترانوہ، تراندرم، ڈوبلیمنٹ آفس، جوں، پٹنہ، پورٹ، بلیر، گوا، شملہ، ہانڈیگرہ

لوک نشتر

فییم صاحب کا ایک شعر ہے۔

رہی فراغت بجز ان تو ہو رہے گا لے تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے
جب میں اس شعر کی روشنی میں حبیب حالب کی زندگی کو دیکھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ
حالب نے پوری زندگی مجھ کی فراغت کے ساتھ بڑے اطمینان، اہتمام اور یقین کے ساتھ گزاری اور
ان کی استواری جہد کا جو عالم تقادہ برصغیر میں کم شعراء کی زندگی میں آیا ہے حالب کی شاعری پر
ابھی تحقیق ہونا باقی ہے کیوں کہ اب تک ان کی شاعری کے بارے میں الزامات تو بہت لگائے گئے
لیکن سنجیدگی سے ان پر تحقیق نہیں کی گئی۔ حالب کی شاعری کو صحافتی شاعری، حادثاتی شاعری وغیرہ
کہا گیا ہے لیکن واقعاً صورت حال اس سے بہت مختلف ہے۔

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے

یا پھر

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
درج بالا دو اشعار کو دیکھا جائے تو انہیں کسی بھی طور صحافتی اور حادثاتی شاعری قرار نہیں دیا
جاسکتا۔ ذرا آخر الذکر شعر کے معرہ ثانی پر غور کریں ”عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں“
حالب برصغیر کی شاعری کا الزام لگانے والے بڑے بڑے جیوشعراء کو بھی اس بلندی تک پہنچنے کی
توفیق نہیں ہوئی۔ دراصل ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر ذہنی ورزشیں کرنے والے دانشوروں کے
حالب تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ حالب خود بند کمروں میں منعقد ہونیوالی نشستوں کا شاعر

نہیں تھا۔ میرے نزدیک کسی بھی ادب کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو اپنے آپ کو اس عہد اور ان مخصوص حالات میں لے جانا از حد ضروری ہے جس میں وہ ادب تخلیق کیا گیا۔ بد قسمتی سے غالب کا مطالعہ کرتے وقت ان حالات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن میں اس کی شاعری کے نازک پودے نے تناور درخت کا روپ اختیار کیا غالب کے بارے میں اس رویہ کا شکار محض اس کے مخالفین ہی نہیں وہ لوگ بھی ہوئے ہیں جو اس کے نظر باقی دوست ہیں۔ مخالفین کی بات کا ذکر تو اس لئے ضروری نہیں کہ جو بات ذہن کو بند کر کے کہی جائے اس پر توجہ دینی ہی نہیں چاہیے۔ تاہم غالب کے دوستوں کے اس رویہ کی وجہ غالب کی سیاست بھی غالب نے سیاسی طور پر اپنے آپ کو نیپ کے جس دھڑے سے وابستہ رکھا۔ بائیں بازو کے فعال اور موثر کارکنوں کے کئی بڑے گروہوں نے اس سے اپنے آپ کو نیپ میں ہونے والے بھی الگ رکھا یوں سیاسی سطح پر غالب بائیں بازو کے الٹے بڑے اور موثر گروہوں کے ساتھ کام نہ کر سکے ان کے برعکس ان کی شاعری اول تا آخر ان نظریات کی حمایت کرتی رہی۔ اور ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے وقت ان کی سیاسی اور ادبی زندگی کے اس فرق کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غالب بائیں بازو کے کسی موثر گروہ کے ساتھ کام نہ کر سکے اور ایک مرتبہ پر بال برابر بھی اپنا وزن مخالفین کے ہڈیوں میں نہیں ڈالا۔

غالب کی شاعری احتجاجی رجحانیت کی شاعری ہے یہ ہرگز وہ رجحانیت نہیں جس کا تذکرہ فیض احمد فیض حسین نے اردو کے ایک جدید شاعر کی رجحانیت کے بارے میں کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ان شاعر کے کلام میں رجحانیت میرے نزدیک ایسی ہی ہے جیسے پنج دریا میں ڈوبتے ہوئے شخص کو کوئی کنارے پر کھڑا ہو کر ڈوبنے سے بچنے کی ترکیب بتائے۔ احتجاجی رجحانیت معاشرے کے لئے کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ معاشرے میں موجود احتجاج کی مختلف اشکال سے کیا جاسکتا ہے احتجاجی ایک تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان ہندو کی اٹھالٹا ہے تو پھر پولیس مقابلے کا شکار ہونے والے ڈاکو کی لاش کی شکل میں سامنے آتا ہے اگر ہم احتجاج سے رجحانیت کو نکال دیں تو محض انارکلی ہی رہ جاتی ہے اب اس روشنی میں ہم غالب کی شاعری کو دیکھیں تو وہ ہمیں ایک بلند مرتبہ پر نظر آتا ہے ایک ایسا شاعر جو سکے بند شاعروں کے ہجوم سے الگ تھلگ معاشرے کی خدمت کا فریضہ اپنے ناناؤں کا دھوون پر اٹھائے ہوئے ہے غالب احتجاجی رجحانیت کا شاعر ہے درج ذیل اشعار دیکھیے:

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا تم جبر بزر نقاب دیکھو کب تک رہے

حسرت آزاد پر چور غلامانِ وقت از رہ بغض و عتاب دیکھے کب تک ہے

حسرت موہانی

کچھ قفس کی تیلیوں سے چین رہا ہے تو رسا کچھ فغاں کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

فراق

در قفس پر اندھیرے کی مہر لگتی ہے تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد فیض گلشن میں وہی طرزِ بہاں ظہر میں ہے

فیض

یہ لوہے کی سلاخیں کب تک روکیں گی مٹنے سے یہ دیواریں رہیں گی تیرے میرے درمیان کب تک

تجربہ تک نہ آنے دے گا کچھ ایک عید خانے کا مجھے تجربہ تک نہ جانے دیں گے آخر ہاساں کب تک

علی سردار جعفری

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک کب تک آئین کی عمت اور مذمت ہوگی

ایک اک نام پر کہہ رہے ہیں گے کب تک کب تک اس طرح بالاتفاق بغاوت ہوگی

کیفی اعظمی

ان اشعار کے بعد غالب کی نظم ”میری بھی میں آؤں نہ آؤں۔ آنے والا زمانہ ہے تیرا“ کا ایک

بند ملاحظہ فرمائیے۔

درد کی رات ہے کوئی دم کی

ٹوٹ جانے کی زنجیرِ غم کی

مسکرائے گی ہر آس تیری

لے کے آئے گا خوشیاں سہرا

آنے والا زمانہ ہے تیرا

یہ نظم غالب نے درِ زنداں کو لیکھ کہتے ہوئے لکھی اور ایک ہی نہیں غالب کی پوری کی پوری شاعری دراصل بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے جو انسان کو ایک بہتر دنیا کے تشکیل پر آمادہ اور عبور کرتا ہے اس مختصر مضمون میں غالب کے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ممکن نہیں لہذا اس بات کو نہیں چھوڑ کر میں بعض ایسی باتوں کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہوں گا جو غالب کی رحلت کے بعد سامنے آئی ہیں غالب کی یاد میں منعقدہ تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ہمارے ایک دوست نے غالب کو ایک انتہائی غیر جانبدار شاعر قرار دیا غالب کی شخصیت کے

ساتھ یہ بڑا ظلم ہے حالہ ایک ایسا شخص ہے جس نے انتہائی جانبداری کے ساتھ مہر ظلم و زیادتی کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ ظالم کا ساتھ دینے والے اور ظلم پر خاموشی اختیار کرنے والوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا غالباً ہمارے دوست کہتا یہ چاہتے تھے کہ حالہ نے ظلم کے خلاف لڑنے والوں میں کبھی امتیاز نہیں برتا۔ یہ بات صحیح ہے لیکن حالہ نے ظلم کے خلاف لڑنے والوں کا ساتھ بھی ایک نظر یہ کے تحت دیا لہذا وہ کسی بھی حمایت سے قبل یہ ضرور دیکھتے تھے کہ کہیں وہ رجعت پرستی کا آکر کار تو نہیں بن رہے تھے جنرل منیا کے گیارہ سالہ آمرانہ دور کے بعد کراچی کے ہاشواڈی ٹویں میں حالہ کے اعزاز میں منعقدہ ایک شام یاد آرہی ہے اس وقت ملک میں محنت سر پرے نہیں گھڑنے کی حکومت تھی حالہ نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے پیپلز پارٹی سے متعلق ایک مزدور رہنما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم کہتے ہی اسٹیج کیوں نہ بنو الوالو جاگیرداروں کی قیادت سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا انہوں نے کہا کہ آج مجھ کو صاحب کی بیٹی کی حکومت ہے تو بہت سے اس کے اور مجھ کو صاحب کی حمایتی ہوں گے ہیں مجھ کو صاحب میرے دوست تھے اور میں نے ایک چیز ان کے ساتھ جتنی دنی ہے لوگوں نے اتنا پانی ان کے ساتھ نہیں پیا ہوگا تاہم جب انہوں نے مجھے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے انکار کر دیا حالانکہ محمود علی قصوری جیسے لوگ ان کے ساتھ چلے گئے۔ لہذا کسی بھی طرح یہ کہنا کہ حالہ غیر جانب دار تھے مناسب نہیں اور اس سے کنفیوژن ہی پھیلے گا۔ حالہ کی جانب داری کا عالم تو یہ تھا کہ محنت سر پرے نظر مجھ کو کے دور میں نیشنل بک کونسل کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک لاکھ روپے کا انعام دیا گیا اور انہوں نے اس کے بعد وہ ظلم لکھی جس کے استبدادیوں لے۔

وہی حالات ہیں فقیریوں کے دن بھرے ہیں فقط ویردوں کے ہر بلاؤں ہے دیس کا مقروضے پاؤں ننگے ہیں بے نظمیروں کے انہوں نے نہ صرف یہ ظلم لکھی بلکہ بہت لہک لہک کر وہ اسے پڑھتے بھی رہے حالہ کے بارے میں ان کی رحلت کے بعد ملک کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ایک سبکدکار کا نام نویس نے بظاہر خود کو حالہ کا سدا رخ ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۸۹ء کی دہائی کی عالمی اردو کانفرنس کے مشاعرے میں جب حبیب حالہ نے فرمائش پر یہ شعر پڑھا

وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمت نہیں وطن سے مجھے سکھ رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے تو بقول مذکورہ کا نام نویس کے کہ وہ مجھ کو اکٹھے اور انہوں نے حالہ سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور حالہ نے ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اسے دیارِ عزیز میں نہیں پڑھیں گے خبر یہ حالہ کا بڑا پس تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ اس واقعہ سے اپنے بارے میں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں ظاہر

ہے جب آپ اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر لوگوں کو اعلیٰ ہر کی آزادی نہیں دیں گے، بیچ کھنڈ والی
نزدان کے حوالے کر دیں گے، تو بات یقینی طور پر سرحدوں سے باہر جانے کی گھر ملکی سرحدوں سے
باہر اس سے قبل کیا کیا کچھ نہیں کہا گیا ہیرت ہے کہ ان کی رگب حب الوطنی جالب کے مذکورہ شہر
برہمی پھر کی حالانکہ جس وقت جالب موچی دروازے میں یہ پڑھ رہا تھا۔

دب جس کے محلات ہی میں چلے

چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے

وہ جو سائے میں ہر معلومت کے پلے

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

اس وقت مذکورہ کالم نویس قمر صدارت میں آمرانہ آئین بنانے والوں کے شریک کار
تھے اور ادیبوں اور مشاعروں کو راز نگار کے شکنجے میں کس کر اقتدار پر قابض قوتوں کے سامنے پیش
کرنے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے اور جب حبیب جالب پس زندان یہ کہہ رہا تھا،
گھر کے زندان سے اسے فرصت ملے تو آئے بھی جانفزا باتوں سے آئے دل مرا بہلے بھی
لگ کے زندان کی سلاخوں سے غیہ وہ دیکھ لے کوئی یہ پیغام میرا اس تلک پہنچائے بھی
تو وہ آمریت کے زیر سایہ ادیبوں کو گرفتار گھڑ بنانے کی خدمات کے عوض بیرون ملک دوسرے
کا پروگرام بنا رہے ہوں گے یا صدر کینیڈا سے مصافحہ کی تصویر کی ڈرائنگ روم میں آنے والے
افراد کے سامنے نمائش کر رہے ہوں گے اب جالب کا انتقال ہو گیا تو اس کے ہمدرد بن کر جلیسا اسے
جالب کو یہ بتا رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے حزب حب الوطنی سے مجبور ہو کر جالب کو اس کی ایک غلطی پر
ٹوکا پتہ نہیں یہ کس قماش کے لوگ ہیں کہ جو جالب کو بڑا آدمی بھی کہتے ہیں لیکن اس کی گرفتاریوں اور اس
کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے وقت ان کے لب سے ہوتے ہیں اور پھر ایک دم سے
کھڑے ہو جاتے ہیں جالب کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے لئے اپنے کالم میں انہوں نے ایک غلط بیانی
اور کی کہ جالب کم سواد اہل قلم کی معلومت آمیزی کی جانب توجہ دلا کر انہیں خفیف نہیں کرتے تھے حالانکہ
جالب نے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری میں انہیں لٹاڑا بلکہ ایسے اشعار پڑھتے وقت وہ ان کے خلاف تبصرے
بھی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں سادات امویہ کا ایک مشاعرہ ہے جو اس وقت کے وزیر دفاع میر علی احمد تاجپور
کی صدارت میں ہو رہا تھا اور جس میں انہوں نے علی احمد تاجپور جوم کے اتنے کچھ کے لگے لوگوں کو کہا ہے کہ بعد میں انہیں
جودل کا دورہ پڑا اس میں جالب کے ان کچھ کوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا خبر بات ہو رہی تھی ان کالم نویس کی

جن کی رگ و جب الوطنی حبیب حالہ کے شعور پر پھر کڑی اٹھتی۔ حالانکہ ہر رگ کبھی ان کے اپنے اعمال پر نہیں پھڑکی کچھ میں نہیں آتا کہ جب لوگ یہ جانتے ہیں کہ جس شخص پر وہ لکھ رہے ہیں وہ ان کے پونے بن کے آگے قطب سینا کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر معنوی طریقہ پر خود کو اس سے بلند تر ثابت کرنے کے کوششیں کیوں کرتے ہیں اخبار کا پیٹ تو ان باتوں سے بھی بھر جاتا ہے جو اس کے علاوہ سرفہ شائع ہوتی ہیں ضروری ہے کہ آدمی حالہ کو بھی نشانہ بنائے اور وہ بھی حالہ کی طبعی موت کے بعد! و ما علینا الا لہ و لہ

(ماہنامہ منشور کراچی مارچ ۱۹۹۳ء)



بڑے بے تحاشہ مذاہب بڑے مذاہب سے
کبھی گزریاں چاک ہو لا اور کبھی ہوا دل خوں
جسم پہ چوڑیوں کے نشان ہیں اپنے نقشے ہیں
گوئی کب کی لاٹھی تک اپنی تحریک سے
ہمیں تو یونین ملے مٹنے کے لئے نہ لگتے
میں ہے ایسی داد و دفائی کے لئے نہ لگتے
انہوں نے جس اور شہر میں

مجاہد بریلوی

عوامی شاعر حبیب جالب

میں ڈاکٹر اقبال سے جالب صاحب کے لندن میں علاج کے بارے میں پوچھتا ہوں ڈاکٹر اقبال جن کے چہرے پر مسلسل مسکراہٹ رہتی ہے بڑے دھیمے لہجے میں کہتے ہیں ”جالب صاحب اس ملک کا بیش بہا سرمایہ ہیں کا میانی کی گو ایک فیصد امید ہے مگر جس بے بسی کی حالت میں وہ بچھلے چار ماہ سے ہیں اسی حالت میں انہیں مزید رکھنا ہے رچی ہے ہوٹل کے کمرے میں میرے سامنے ایک ریل چل رہی تھی۔

لاہور ہسپتال میں یا تو جسٹس ایم آر کیا فی کی آواز گونج رہی ہے یا پھر موچی گیٹ میں حبیب جالب آمریت کو لٹکا رہے ہیں۔

دب جس کا محلات ہی میں چلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر معلومت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے قرار کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

”دستور“ نظم کیا تھی کہ اس نے اقتدار کے ایوانوں کو لرزہ بر اندام کر دیا۔

”ملک صاحب آپ لفین جابیں اب ہمارا آئین نہیں چلے گا“ نہیں چلے گا۔“

اس نظم کے بعد ہی جالب صاحب کی قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا ایوب خان کے بند جزل بچی خان آئے تو جالب صاحب نے انہیں بھی آتے ہی لٹکا را۔

تم سے پہلے وہ جو ایک شخص یہاں تخت نشین تھا اس کو بھی اپنے خدا ہونے پر اتنا ہی یقین تھا
یعنی خان کے بعد پیلز پارٹی کی حکومت آئی آمریت کے دور میں حالب صاحب کا بھٹو صاحب سے بڑا
ساتھ رہا تھا مگر کیونکہ حالب نیپ میں تھے اس لئے حیدر آباد سازش کیس میں دھرنے گئے اور تقریباً
سال بھر جیل گائی

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

پیلز پارٹی کے دور حکومت میں حالب صاحب کی ایک ایسی نظم تھی کہ جس نے بڑی شہرت
پائی۔۔۔۔۔ پیلز پارٹی کے بعد جنرل ضیاء الحق آئے۔۔۔۔۔ حالب صاحب کو اس دوران ملتان جیل
یا ترائے کے سبب خالص بیمار ہو چکے تھے مگر حق گوئی کی روایت کا تسلسل انہوں نے برقرار رکھا۔

ظلمت کو ضیاء پر حر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھتا

جنرل ضیاء الحق کے دور میں اس نظم نے بھی بڑی شہرت پائی اس نظم کے سبب انہیں
پنجاب کی بدترین جیل میانوالی میں چھ ماہ رہنا پڑا۔ مرحوم جنرل ضیاء الحق کے بعد لگتا تھا کہ حالب صاحب
خالصے ٹھک چکے ہیں عمر اور بیماری دونوں ان پر حاوی ہو رہی تھیں مگر پیلز پارٹی کے جیلے دزیروں نے
جب مسلم لیگی دزیروں کے اطوار اپنلے شروع کئے تو حالب صاحب چپ نہ رہ سکے۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے دن بھرے ہیں فقط دزیروں کے
ہر بلا دل ہے دیس کا مقروض پاؤں ٹنگے ہیں بے نظمیوں کے

میری آخری ملاقات سر فروری کو شیخ زید بن سلطان انہیان اسپتال کے کمرہ نمبر ۱۰ میں ہوئی
بڑی افسردگی سے انہوں نے جملے توڑتے ہوئے کہا

”یار مارے گئے نا!“

حالب صاحب کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا کہتا بھی کیا یہ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ
اگر ذاتی حالات تبدیل کرنے کے فارمولے پر حالب صاحب عمل کرتے تو ان کے حالات کب کے درست
ہو چکے ہوتے۔

حالب صاحب آپ کو تو مارا حبس نا ہی تھا

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

ایسے دستور کو صبح بے نور کو

ظلمت کو صبا ہر حر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھتا

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

پاؤں نیگے ہیں بے نظائروں کے
 نہ جاں دے دو، نہ دل دے دو، بس اپنی ایک مل دے دو
 حالب صاحب لکھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے آپ کو تو مارا جانا ہی تھا۔
 (ماہنامہ منشور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

دیویندر اس کے نئے افسانوں پر مشتمل نیا مجموعہ

پہرندے اب کیوں نہیں آتے

یہ افسانے زندگی سے فرار نہیں بلکہ زندگی
 کی جانب واپس قدم ہیں۔ یہ کسی نئے لیبل کے
 نہیں بلکہ نئے فلسفہ حیات کی تلاش کے تخلیقی
 عمل کے آئینہ دار ہیں۔

صفحات

قیمت

۱۴۰

۵ روپے

تقسیم کار

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ہارن سننگر

دہلی ۱۱۰۰۵۱

مجموعہ طوالت

۳۰ روپے	ہندراج رہبر	پُرکاشی تستی (ناول)
۵۰ روپے	نند کشور وکرم	یادوں کے گنڈر (ناول)
۸۰ روپے	نند کشور وکرم	انیسواں اوصیائے (تجزیاتی ناول)
۱۲ روپے	سریندر سنگھ جوبرا مترجم نند کشور وکرم	گیانی ذیل سنگھ
۵۰ روپے	دیپندر اتر	پرندے اب کیوں نہیں اڑتے
۵۰ روپے	دیپندر اتر	خوشبوین کے ٹوئیں گے (ناولٹ)
۳ روپے	دیپندر اتر	مستقبل کے روبرو (تنقید)
۳ روپے	دیپندر اتر	کینوس کا مہرا (افسانے)
۳ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۸۲
۴ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۸۳-۸۵
۴ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۸۴-۸۷
۴ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۸۸
۴ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۸۹
۵ روپے	نند کشور وکرم	منتخب افسانے ۶۱۹۹۰
۵ روپے	نند کشور وکرم	ہنس راج رہبر کے منتخب افسانے - ایک تحارف
۸ روپے	نند کشور وکرم	آرڈو ۶۱۹۸۳
۸ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۸۴
۸ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۸۷-۸۸
۸ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۸۹
۱۰ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۹۰
۱۰ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۹۱
۱۵ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۹۲
۱۵ روپے	نند کشور وکرم	عالمی آرڈو ادب ۶۱۹۹۳

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے۔ بکیشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

اک بنجارہ عوامی شاعر

اس میں دورائے نہیں کہ پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے میں شاعری کا معیار بلند رہا ہے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے کہ پاکستانی شاعروں کا اپنا ڈھکا چھپا انداز رہا ہے۔ اسے میں کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک خاص طرح کی سنسرشپ میں خود کو مجبور پاتے ہوئے علامتوں، استعاروں اور کنایوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان کا فوجی نظام کچھ ایسا رہا کہ ادب بھی اس کا شکار ہوا لیکن جذبات اور احساس کبھی کسی کے بلند نہیں رہی، درد و غم، ظلم، جبر و وحشت انکا اثر ہمیشہ سے شاعری قبول کرتی رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے فوجی نظام حکومت کے خلاف شاعری نہیں کی گئی۔ شاعری درد و غم کی کیفیت اور ظلم و بربریت کے احتجاج کے بطور احساس کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ تو یہ شاعری ہر دور میں ہر نظام حکومت میں جنم لیتی رہی مگر زبان ہر لگی ہندوئوں کی وجہ سے بولنے والی زبان چپ تھی اور غم و غصہ کی جگہ استعارے اور کنائے نے لے لی۔ فہمیدہ ریاض یا پروین شاکر کو جب حکومت کے خلاف بولنا ہوتا تھا یا خود ہر لگی یا ہندوئوں کے خلاف بولنے کی باری آتی تو جذبات و احساس ہندوئوں کے گھیرے میں اسے یوں کہتے، کہ میرے ملک میں ہندوؤں کو ہمارا کرتے دکھانے کی اجازت نہیں ہے۔ احمد فراز اس سے دو قدم آگے تاریخی حوالے سے قابیل کی سند لے کر آتے تو پاکستان نکالا ہر مجبور ہوئے۔ ظاہر ہے اسیے ماحول میں شاعری کیا پروان چڑھتی اور احتجاج اندر دنی چنگاریوں کو نکال کر تیز و تند موج کا روپ کیونکر لیتا۔

حبیب حالب مجھے شروع سے ہی اس لئے زیادہ پسند رہے ہیں کہ دوسروں کی طرح انہوں نے اندر سنگ رہی چنگاریوں کو احساس کے قید خانے میں گھٹنے پر مجبور نہیں کیا۔ انہوں نے گھٹن اور جبر محسوس کیا تو ویسی ہی چیخ ان کے ہونٹوں سے بھی بھوئی۔ ویسے ہی شیخ کے تیز و تھار جیسے لہو لہان کر جانے والے لفظوں نے جنم

لیا اور ان کی شاعری کی وسیع دادیں ملیں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اسلامی طرز حکومت کا سہارا لے کر ظلم و بربریت کی انتہا کر دینے والے فوجی نظام کو ان کے ذہن کے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ کبھی فوجی ظلم سے گھبرائے نہیں، جیل جانے سے نہیں ڈرے اور ان سب کے باوجود ان کے منہ پر کبھی بندشوں کا قفل نہیں لگا۔ وہ یقینی بار آور جس موقع پر جیل گئے اور عیسیٰ جیسی زایدتیاں برداشت کیں، ان کے قلم نے حکومت وقت کے ہر دار کا منہ توڑ جواب دیا۔ وہ دوسروں کی طرح مصلحت پسندی اور جاہلوسی کے قائل نہیں رہے، انہیں کبھی زنداں کی اندھیری قطاروں سے ڈر نہیں لگا، جبر و تشدد کے ایسے موقعوں پر انہوں نے اپنی زبان پر خاموشی کا قفل نہیں لگا یا، وہ کبھی تختہ دار سے خائف نہیں رہے، انہوں نے تو ہمیشہ منعموری شان کو پسند کیا اور حق کے نام پر کچھ کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اپنی نظم دستور میں وہ مکمل کر اپنے زاویہ فکر کا اشارہ دیتے ہیں۔

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے

ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

آرڈو شعراء کی تواریخ پر نظر ڈالیے تو عوامی شاعری کا پورا صفحہ خالی دکھائی دیتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو چھوڑ دیجئے۔ تو وہ لہجہ، وہ شعور، وہ بانگین، وہ اداسی شاعر کا مزاج نہ بن سکی جو شاعری کے لئے ضروری مانا جاتا ہے۔

ہاتھ پوچھتے تو آردو کے افق پر عوامی شاعری کی سطح پر جگہ گانے والا اکیلا ستارہ نظمیر تھے۔ اور نظیر کے بعد لہسا سکوت طاری رہا اور یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہو گا کہ اس سکوت کو ایک لمبے عرصے تک توڑنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر و نظر کے معیار و مزاج سے آردو شاعری کا قد ہمیشہ بلند رہا ہے۔ غالب و میر سے ہوتی آردو شاعری اقبال و فیض تک آئے آتے ایک مخصوص نظریہ حیات اور ایک مخصوص نظام فلسفہ کے تحت شعری سانچے میں ڈھلنے لگی اور حیات و زمان پر اپنے نئے فلسفے کی مہر ثبت کرنے لگی۔ خیال و افکار کے نئے نئے درتپے داہونے لگے، عالمی مسائل پر نظر جانے لگی، دنیا کی زبوں حالی، تنگ دستی، اور جنگ عظیم سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں قوت گویائی کی محرک ثابت ہونے لگیں۔

ساحرین عوامی شاعر کہلانے والی پوری بات موجود تھی مگر افسوس، ساحر کو فلمی بازاروں نے

برباد کر دیا، اس کے باوجود ساحر کی کچھ فکر انگیز نظموں میں عوامی سطح پر کچھ ایسی شعوری کار فرمائیوں کو دخل رہا ہے، جس نے انہیں عوام کے درمیان بے حد مقبول بنا دیا۔

فیض کا شمار اردو کے بہترین نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ فیض کا شاعرانہ نظام، فکری سطح اور نظم کے لئے استعمال کی گئی مخصوص COMPACTNESS جہاں انہیں اپنے عہد میں دوسروں سے ممتاز بناتی ہیں وہیں ان کی شاعری اپنے سبک نرم لہجے اور انفرادی فکر و تیور کی وجہ سے صرف خواص میں مقبولیت کی سند حاصل کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا محرک جو عوام رہی، وہی عوام فیض کے شعری سفر کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ فیض کی شاعرانہ برد و اتر اتنی بلند ہے کہ عوام تک اپنی بات پہنچانے کا استعارہ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔ گو فیض نے معمولی، عام سے مسئلے کیلئے، درد کی ٹھوکریں کھاتے، رنج و الم میں گرفتار، معیبتوں کے شکار، رنجور و پریشان حال، مزدور طبقے اور عام انسانی پریشانیوں اور مسائل میں ہی جھانکنے کی کوشش کی، اس کے باوجود ان کے تخلیقی سرچشموں تک عوام کی رسائی نہ ہو سکی۔

عوامی شاعر وہی ہے جو عوام کے احساس و جذبات کو بخوبی سمجھتا ہو اور اسے شعری سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتا ہو۔ وہ انقلاب کی باتیں کرتا ہو تو وہاں صرف لفظی بازیگری اور گمن گرج کو دخل نہ ہو، بلکہ سماجی برائیوں اور دے پکے لوگوں کی تڑپ کسک کو سمجھنے کی شعوری کوشش بھی شامل ہو۔ حبیب حالہ کو بڑھتے ہوئے ہمیشہ سے رشک اکہنزا استعجاب سے واسطہ پڑا ہے۔ موضوع کا انتخاب اور Contacts کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اشاروں کنایوں اور ضرورت پڑنے پر دو ٹوک اپنی بات کہنے میں حبیب حالہ کا جواب نہیں۔ مثال کے طور پر ے

ایسے الفاظ نہ اور ارق لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے

میں ضرور آؤں گا ایک عہد حبس کی صورت
(اپنے بچوں کے نام)

کہاں ٹوٹی ہیں زنجیریں ہماری	کہاں بدلی ہیں تقدیریں ہماری
وطن نھاؤں میں زنداں نہیں تھا	جہن خواہوں کا یوں ویراں نہیں تھا
مسلط ہے سروں پر رات اب تک	وی ہے صورتِ حالات اب تک

(۱۴ اگست)

میں اسلام کے نام پر ہونے والی برائیوں، مظالم اور بربریت کا ننگا پٹ دیکھ کر ان کا دل رواٹھتا تھا۔ عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک، آزادی پر پھرہ اور اس طرح کے سیکڑوں ایسے واقعات تھے، حبیب جیسے بدلنے کے حق میں تھے۔ حقیقت یہ بھی کہ وہ ایک سچے اور آزاد پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے اور ذہنی اور جسمانی غلامی کی فضا میں یہ ممکن نہ تھا۔ اسلام کے نام پر جبر و تشدد کے واقعات جب بکھرنا زیادہ ہی بڑھنے لگے تو حبیب جالب کا قلم خاموش نہ رہ سکا۔ وہ اس کی پر زور مخالفت پر آمتر آئے۔

اسلام خطرے میں ہے، کی آواز لگانے والے ملاؤں کے تو وہ سخت ترین مخالف تھے۔ اسلام کے ٹھیکیداروں کے لئے ان کی مشہور نظم خطرے میں اسلام نہیں، خاص منہ کی چیز ہے اور بڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

خطرہ ہے خوں خواروں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امسریکے کے پیاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

حبیب جالب دراصل عمل کرنے میں یقین کرتے تھے، اس لئے وہ اس اسلام کے قاتل نہیں جو حقوق کی آزادی پر پھرہ سکھاتا ہے۔ اسلام کا نام لے کر اپنی دکان چلانے والوں کو وہ لبنان، فلسطین اور بیروت کے کریناک مناظر دکھاتے ہیں، جہاں دھواں ہے خوف ہے، ججین ہیں اور لاشیں ہی لاشیں ہیں۔ وہ بیکار تقریروں اور فتوؤں کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نقد پر سے زیادہ تدبیر اور دماغ سے زیادہ عمل پر محروم رکھتے تھے۔ اس لئے کہتے ہیں۔

کردوڑوں کیوں نہیں مل کر فلسطین کے لئے لڑتے

دعا ہی سے فقط کتنی نہیں رنجیہ مولانا

ظاہر ہے، حبیب جالب کی ان باعیانہ انقلابی فتنوں کا شائع ہونا تھا کہ اللہ کے خاص الامور درباروں، کو انہیں کافر کہتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ حکومت کے لئے تو ان کی ہستی شروع سے ہی ناپسندیدہ رہی تھی۔ لیکن حبیب جالب خود ہر ہونے والے مظالم سے کہیں گجرائے نہیں۔ ہاں اللہ کے درباروں سے انہوں نے جبر و تشدد کیا اور اس کا بدلہ اس طرح لیا۔

خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے

اسے زمین پر یہ ظلم کب گوارا ہے

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھواؤ
 بلا صاؤ اپنی دکاں سیم وزر کے دیواؤ
 نشاں کہیں نہ رہے گا تمہارا شیطاؤ
 ہمیں یقیں ہے کہ انسان اس کو پیارا ہے
 خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے

درحقیقت حبیبِ حالِب کی شاعری انسانیت کی ترجمان ہے۔ خدا کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت
 انہیں خدمتِ خلق لگتی ہے۔ زمین پر پہنچتے ہوئے انسانی خوفِ حبیبِ حالِب کی شاعری میں
 اتر کر ایسے لہو لہانِ عمامہ کو جنم دیتے ہیں کہ روئنے لگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فلسطین ہو یا لبنان، یا بیروت کے
 شہیدِ معصوم انسان اور بچے، یہ بچے اور انسان جس کسی ملک اور جس کسی مذہب سے جڑے ہیں، یہ سب حبیب
 کے برابر اندر رشتہ سے بندھے تھے، ان کی وہ حبیب کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور قلب سے جو دکھ کی صدا بھونکتی
 تھی وہ شعری تخلیق کا سرچشمہ ثابت ہوتی تھی۔

حقیقتاً حبیبِ حالِب عوامی طرز کے شاعر تھے۔ ان کا اپنا انفرادی رنگ اور تیور تھا، وطن کے دے
 کچے مظلوم اور پابندہ لوں کے اسیر عوام اور ان کی غلامانہ ذہنیت کو حبیبِ زیادہ دن تک نہیں جھیل پائے۔
 محض شکوے گلے پر لعین نہ کرنے والے حبیبِ قلندِ صفت انسان تھے۔ وہ میدانِ کارزار میں ڈٹے رہے،
 انہیں عوام کی مجبوریوں کا خیال رہا، اور جو مسائل انہیں درپیش رہے انہیں پورٹریٹ کرنے میں انہیں کوئی
 دقت نہیں ہوئی۔ حبیبِ حالِب نے اپنی شاعری سے عوام کے دل کو جیتا تھا اس لئے حبیبِ حالِب
 کی مکمل شاعری کو انسانی بھائی چارگی اور مالگیر برادری کے نام منسوب کیا جاسکتا ہے۔



زند کشور و کرم

عوام کا محبوب شاعر حبیب جالب

موجودہ صدی میں اقبال، جوش، فراق، فیض، حفیظ، احسان و انش ایسے کئی عظیم المرتبت شاعر نصیب ہوئے جن پر ہم جتنا بھی فکر کریں کم ہے۔ لیکن اسی صدی کے وسط میں دسٹائے شاعری میں ایک ایسا مستاز و مخضر شاعر نمودار ہوا جس نے اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور جو مرتے مرتے مر گیا لیکن نہ تو قید و بند سے اس کے ارادے متزلزل ہوئے اور نہ ہی آمرانہ جبر و استبداد ہی اسے اپنی راہ سے ہٹا سکے۔

اس ہر دل عزیز اور عوام کے محبوب شاعر کا نام تھا حبیب جالب۔ جو برسوں اپنے ملک کے عوام کی بہتری و خوشحالی اور درخشندہ مستقبل کی خاطر صوبہ متیں برداشت کرنے کے بعد آخر ۱۹۹۳ء کی ۱۲ اور ۱۳ مارچ کی درمیان شب کو لاہور کے ایک ہسپتال میں دم توڑ گیا اور آندو ادب ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گیا جس کی شخصیت اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں ملتا تھا اور جو گفتار کا ہی نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔

حالت ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء مسان افغانستان ضلع ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے اور برصغیر کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے لیکن وہاں جا کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ ملک بے رہنے سیاسی بحرانوں کا شکار ہو رہا تھا اور اتار کی جنگ میں رہنا عوام کو بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ ایسے حالات میں ان کی شاعری میں شدت پیدا ہو گئی جس میں ہندو رنج اعداد ہوتا گیا۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے ”حرف بردار“ کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

”برگ آوارہ دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوڑے ہوئے دیاروں“

بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بھری پڑی ہیں۔ جبکہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے بعد میں آئے والی کتابوں میں دھماکہ بلند آہنگ ہو گیا ہے۔ کیوں نہ ہو تاکہ ایک منظم منصوبے کے تحت وطن عزیز کو خوفناک آسربیت کے شکیں میں جکڑا دیا جاتا تھا۔ جتنا جس بڑھتا گیا لہجہ اتنا ہی تیز و تند ہوتا گیا۔ اس لہجے کی وجہ سے کئی بار پس دلوار زنداں بھی گیا اور زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔“

ملک کی ڈاٹواں ڈھول اور غیر یقینی سیاسی صورت حال میں جب جنرل ایوب خان نے عوام پر فوجی حکومت مسلط کر دی تو انہوں نے اس کی کھل کر مخالفت کی حتا کہ ان کی انقلابی شاعری جنرل ایوب خان کے خلاف مس قلم جنانج کی ہم میں ایک طرح سے مبینی فیسٹو کی حیثیت اختیار کر گئی اور پھر جب فوجی دور حکومت میں ملک پر عوام دشمن دستور نافذ کیا گیا تو انہوں نے اپنی معرکہ الہ انظم لکھی جس نے تہلکہ مچا دیا اور ساتھ ہی ان پر صورتوں اور اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ نظم ہمہ کرد و مہ کی زبان پر تھی اور ہر طرف یہ آواز گونجنے لگی تھی۔

دیپ جس کا عملات ہی میں چلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر صفت کے پلے

ایسے دستور کو میج بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

حالت کو جنرل ایوب، یحییٰ خان اور ضیا الحق کے دور حکومت میں ہی نہیں بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں بھی قید و بند کی صورتیں برداشت کرتی پڑیں اور نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کے ساتھ ان پر بھی جدید آباد سازشیں کیس کے تحت مقدمہ چلا گیا مگر اس کے باوجود ان کے بڑے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ ہمیشہ جا برد آکر سے ٹھکر اتے رہے اور سیاسی بازی گردن اور صاحبان اقتدار کے جھوٹ کی قلعی کھولنے سے انہیں داور رس بھی باز نہ رکھ سکے بقول ان کے ہ

رستہ کہاں سو راج کا کوئی روک سکا ہے
ہوئی ہے کہاں رات کے زنداں میں بھر بند

جیسا کہ ہم جانتے ہیں حبیب غالب کی شاعری اسی دور کی پیداوار ہے جب کہ حصول آزادی کے بعد برصغیر سیاسی پھران کا شکار تھا اور سیاسی رہنما تمام اخلاقی اقدار کو بلائے طاق رکھ کر ہر قیمت پر اقتدار

حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ اور ہر شے بکاؤ بن چکی تھی۔ قلم، ضمیر، ظرف، ہر ایک کی قیمت تھی مگر ایسے دور میں ہر شاعر حساس دلیری و جرأت سہاٹی دے باقی استقلال و ثابت قدمی کی علامت بن کر عوام کے سامنے نمودار ہوا اور اُس نے سب سے اوپر خود فرہ عوام میں اپنی شاعری سے نئی روح بھونکنے کی کوشش کی حتیٰ کہ جمہ فوج مشرقی پاکستان میں نہتے اور بے قصور انسانوں پر مظالم ڈھائی تھی اور اکثر نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی اُس وقت بھی اس عوامی شاعر کو فوجی جبر و استبداد خاموش نہ کر سکا اور انہوں نے بے باک دہلیا کہا ہے

محبت گولیوں سے بھر رہے ہو وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کمرستہ کٹ رہا ہے یقیں فکڑ فکڑ نزل کھو رہے ہو

اس میں شک نہیں کہ محال کی شاعری پاکستانی پس منظر میں پروان چڑھی اور انہوں نے اپنے ملک کے غریب لاجوار اور مظلوم عوام کے رنج و الم اور شکایت کی آئینہ داری کی مگر حقیقی شاعر کی طرح ان کی شاعری کسی ملک، خطے، ذات، قوم یا نسل تک محدود نہیں۔ ان کی شاعری آفاقی ہے۔ اور وہ دنیا کے تمام مظلوم افراد کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور وہ پاکستان کے ہی نہیں تمام دنیا کے مظلوم اور ستائے ہوئے عوام کو ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے بہت بندھاتے ہیں اور کہتے ہیں

کوئی تو ہر جہے لے کر نکلے اپنے چاک گر یہاں کا
چاروں جانب خاموشی ہے دیوانے یاد آتے ہیں

مصول آزادی کے بعد جب اکثر ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے ایمان داری اور غیر جانبداری کو تسلیم کر دیا تو انہوں نے اپنے معمولی سے آرام و آسائش کی خاطر اپنے ظرف، ضمیر اور قلم تک کو گدھی رکھ دیا تھا۔ اور عوام کا ساتھ چھوڑ کر بے پروا قرار طبقہ کے ساتھ ہو گئے تھے، غالب اپنے منتہائے مقصود کی جانب ثابت قدمی سے رواں دواں رہے اور کچھ انعامات و اعزازات اور آرام و آسائش کے حصول کے لئے اپنے اصولوں کو خیر یا دکھ کر بیک جانے والے بے ضمیر ادیبوں اور صحافیوں کو مخاطب کر کے بڑے دکھ سے کہتے رہے۔

قوم کی بہتری کا خنبہ ال چھوڑ فکیر تعمیر ملک دل سے نکال
ترا ہر جہے ہے تیرا دستِ ہوال بے ضمیر میری کا اور کیا ہو مال

اب قلم سے ازار بند ہی ڈالتے

اسی طرح سرمایہ داروں، مل مالکوں، افسروں اور جاگیرداروں کی دھاندلیوں اور جبر و ستم پر بھی وہ خاموش نہیں رہے اور انہیں لاکار لاکار کر تہیہ کرتے ہیں۔

ملوں کے مالکو اے افسردہ زمیندارو
ہمساری راہ ترقی میں کالی دیوارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے ہمسارو
نشانی یزید کا باقی ہے اور نہ زار کا ہے
یہ دور اصل میں انسان کے دفا کا ہے

درحقیقت غالب کی شاعری ان کے عشقی بشر اور ایماندارانہ احتجاجی رویے پر مبنی ہے۔ گو احتجاجی ادب لگ بھگ ہرز باں میں پایا جاتا ہے اور اردو ادب میں بھی اس کی کمی نہیں لیکن جتنا احتجاج غالب کی شاعری میں پایا جاتا ہے اتنا اردو کے کسی اور شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ ان کی ابتدائی شاعری کا لہجہ دھیمہ مزور تھا لیکن جوں جوں اُمر بیت کا قہر و جبر بڑھتا گیا اور بے اصول کھوتوں کا دور دورہ شروع ہو گیا ان کا احتجاج شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اسی طرح انسان سے ان کا عشق اس معراج تک پہنچ گیا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ساری خدائی کا درد ان کے دل میں سما گیا تھا اور وہ ساری عمر انسانی کرب میں تڑپتے رہے۔ مجبور محکوم لاچار اور درماندہ افراد کے حق میں آواز بلند کرنا ان کا شیوہ زندگی بن گیا اور اس سے انہیں کوئی قہر و جبر بھی نہ روک سکا اور نہ قید و بند کی مصیبتیں اور اذیتیں۔ انہیں اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ عشق ہر فرد کے بس کی بات نہیں اسے اختیار کرنا آگ کے دریاب کیوں کر دیتا ہے اسی لئے وہ اپنے ساتھیوں اور عوام کو خبردار کرتے ہیں کہ

ختم کے ڈھانچے میں ڈھل سکو تو چلو تم میرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیسرگی میں چلنا ہے صورت شمع جہل سکو تو چلو

غالب کی غزلوں کو ان کی نغموں کے مقابلے میں کم اہمیت دی گئی ہے حالانکہ ان کی غزلوں کو غنائیت اور سلاست میں احتجاج اور تلخ کلامی کی کمیز سنسنے پر کشش اور پر تاثر بنا دینا ہے جس کا کہ احمد ندیم قاسمی نے ان کے پہلے شعر میں مجموعے ”برگ آوارہ“ کے دیباچے میں لکھا ہے۔

”حبیب غالب کی نغموں اور بعض غزلوں کے اکاؤکا اشعار میں تلخی اور طیش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن یہ ان کے فن کا نقص نہیں اُس کے فنی خلوص کا احتجاج ہے اور جس فنکار کو احتجاج کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ خود فنی بے حرمی پر صرف انکھیں جبکہ کمرہ جاتا ہے۔“

غالب کی غزلوں میں کلاسیکیت بھی ہے اور جدیدیت بھی اور وہ اس امتزاج سے ایسے ایسے اشعار کے تخلیق کرتے ہیں جو ہم پر بے پناہ اور امٹ تاثر چھوڑتے ہیں اور جنہیں ہم بار بار دہراتے ہیں جیسے

کے خبر تھی ہمیں راہبر ہی کو نہیں گئے بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

نگاہ دہر میں ڈرے سہی ہم لوگ دنیا کی بھیک نہیں مانگتے سیاروں سے

تغویب ہے ستم کی آندھروں میں چراغ دل ابھی تک جل رہا ہے
ان بستیوں میں رکھو خاتم ہونے کی اے چشمِ کم کسی سے ذکرِ غم یہاں
ہم سے پوچھو جن پہ کیا گزری ہم گزر کر خستہاں سے آئے ہیں
کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غم جاناں
کہہ تک کوئی ابھی ہوئی زلفوں کو سواہے

حیرت سی برستی ہے دردِ اہم ہر سر سٹھو روتی ہوئی گھسیں میں سسکتے ہوئے گھر میں
بک جاتیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سر بازار ہم یوسف کھانا میں دم لعل دگو ہر میں
اس میں شک نہیں کہ اردو ادب نے ماضی میں ہمیں کئی عظیم المرتبت شاعر عطا کئے ہیں اور آئندہ بھی
کئی بڑے شاعر ہمیں نصیب ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ حبیب جاوید جیسے بے باک و دلیر شاعر صدیوں
بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس میں تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حصولِ آزادی کے بعد برصغیر کی کسی زبان
میں کچھ اتنے جیسے انڈیا اور باغیر شاعر پیدا نہیں ہو ا جس نے منظوم اور مہجور عوام کے لئے اربابِ اقتدار سے ٹکرتی
ہو اور اپنی زندگی کا طویل عرصہ قید و بند کی اذیتیں برداشت کرنے میں گزارا ہو۔ بلاشبہ وہ برصغیر کے واحد
شاعر تھے جنہوں نے اپنا قلم ہی نہیں اپنی زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر دی تھی اور جو گفتار کے ہی نہیں کردار
کے بھی غازی تھے اور جنہیں 'امروں' اور جاہلوں کا قہر و ستم بھی اپنی منزل مقصود سے نہ ہٹا سکا۔ جو اپنی مہجوروں
اور لاچاروں کے باوجود سماں کے ہر دم کو بلند کئے رہے، جنہوں نے کسی قیمت پر قلم اور ضمیر کا سودا نہیں کیا۔
اور ہمیشہ بھی لغو و حق بلند کیا کہ

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں جاہل
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی غلاموں کا پالا
مجھے شکستہ امی عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

(ماہنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی جنوری ۱۹۹۹ء)



وحید انور

سنگینوں کے راج میں سچ کہنے والے

حبیب حالب

فیض احمد فیض کے بعد پاکستان میں ”احتجاجی شاعری“ کی سب سے اہم آواز کا نام حبیب حالب تھا۔ اب وہ آواز ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی ہے۔

ابتداء ہی سے حبیب حالب نے اپنا رشتہ عوام سے جوڑا۔ اُن کے دکھ درد کو اپنایا۔ اُن کی زندگی کے اہم مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اسی لئے فیض احمد فیض نے انہیں ”پاکستان کا عوامی شاعر“ قرار دیا۔

دراصل حالب نے فیض اور غدوم کی پیروی کی۔ اُن دونوں کو اپنا آئیڈیل سمجھا۔ اور اپنی شاعری کو عوام تک پہنچانے کے لئے اس کا رخ احتجاج اور انقلاب کی طرف موڑ دیا۔ اُن کی آواز عوام کی آواز تھی۔ وہ پاکستانی عوام کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ اُن کی شاعری چالیس سال پر محیط ہے۔ اُن کی ساری زندگی جزیروں کی حکومتوں سے لڑتے ہوئے گزری۔ ہر قدر میں وہ ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ اُن کی شاعری ایک مخصوص نقطہ نظر اور انداز فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔

وہ ہندوستان میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے پاکستان میں۔ میں حبیب حالب کو پاکستان کا غدوم فی الدین کہتا ہوں۔ جس طرح غدوم نے اپنی ساری زندگی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ حبیب حالب نے بھی اپنی ساری زندگی پاکستانی عوام کے لئے وقف کر دی تھی۔ دونوں نڈر اور بے باک تھے۔ ان کی زندگی کا ایک خاص مقصد تھا۔ انہوں نے کبھی بھی Establishment سے سمجھوتہ

نہیں کیا اور حکومت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ان پر عتاب نازل ہوئے۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا جہاں ان کو مصوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن انہوں نے سہانی کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے مقصد پر اٹل رہے۔

دونوں کو لافعلی شاعر تھے۔ عوام سے بے ہنگام پیار اور عوام کی طاقت پر بھروسے نے ان کے شاعری کو لادہ تھی۔ عوام کا سارا دکھ درد ان کی ساری خوشحالی ان کی شاعری میں کھینچ کے آگئی تھیں۔ وہ عوام سے کبھی مبالغہ نہیں ہوئے۔ ایوب خان، بھٹو اور منیا والقی کے دور حکومت میں حالت پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان کو جیل میں اذیتیں دی گئیں۔ لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے جیسے خود دل میں اپنی انگلیاں ڈبو لی تھیں۔ وہ برابر حکایات خوبچکاں لکھتے رہے۔ کئی بار انہیں جہدوں کا لالچ دیا گیا اور ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ بچے نہیں۔ اور انتظامیہ کا شکار نہیں ہوئے۔

انہیں اس سماج سے نفرت تھی جس میں کمزور بے بس انسانوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ان کے حقوق کو غصب کیا جاتا ہے۔ ان پر ہر طرح کا ظلم کیا جاتا ہے۔

ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سرخ کرتے جاتیں گے
عملوں میں اب اپنے لوگوں کے دیئے نہ جلتے پائیں گے

حبیبیہ حالت ایک خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ زندگی کو سنوارنے کے لئے مسلسل جہد کرتے رہے تھے۔ اس کی انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ وہ مستقبل سے کبھی ملنا نہیں ہوئے۔

تیرے لئے میں کیا کیا صدے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی پہنچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصطیوں کے بھول بھی ہیں
تیری خاطر سر کاٹے چند تار ہوتا ہوں

و آئے گا اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل!

اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لئے حالت کے پاس شاعری ایک موثر ذریعہ تھا جسے وہ ظلم، جبر، جہالت، تنگ نظری اور استحصال کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ مشاعروں اور جلسوں میں حالت کی بہت شہرت تھی۔ ان کی شہرت سے اکثر ادیب اور شاعر خائف

تھے اور ان پر الزامات لگاتے تھے کہ ”جالب موقع پرست ہے۔ وہ چنگ ہندی کرتا ہے۔ سیاسی شاعری کرتا ہے۔“ انہوں نے جالب کو شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا۔
 جیسے جیسے سیاسی پابندیوں میں اماندہ ہوتا گیا سفتیاں بڑھتی گئیں۔ جالب کی شاعری میں اتنا ہی زور، اتنا ہی جوش اور دلول پیدا ہوتا گیا۔ برسرِ اقتدار قوتوں کو انہوں نے منہ توڑ جواب دیا۔

رہ گئے نقش ہمارے باقی
 مٹ گئے ہم کو مٹانے والے
 وہ مایوس اور اُداس عوام کو یوں دلاسا دیتے ہیں۔
 دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
 مسکرا اشک بہانے والے

اُن کا پہلا مجموعہ ”کلام“ ”برگ آوارہ“ ہے اس میں جالب کا لہجہ نرم اور دھیمہ ہے۔ لیکن جب ملک امریت کی نذر ہو گیا اور پاکستان میں اظہارِ بیاں کی آزادی پر پابندی لگا دی گئی اور ادیبوں شاعروں کی تحریروں کو سنسر کیا جانے لگا تو جالب کا لہجہ سخت اور بے باک ہو گیا۔ انہوں نے سنسرشپ اور پابندی کی کوئی پروا نہیں کی اور برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف لکھتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوں خان، بھٹو اور ضیاء الحق نے بالترتیب ان کے تین مجموعوں ”سرمقتل“ ”ذکرِ بہتے خون کا“ اور گنبدِ بے درہ کو منہ بول کر لیا۔

کوئی بھی حکومت جالب کے عزم و استقلال کو توڑ کھڑا نہ سکی۔ وہ برابر محنت کشوں، مزدوروں کسانوں اور طالب علموں کے مسائل اور اُن کے استعمال کے بارے میں لکھتے رہے اور جمہوریت کی لڑائی لڑتے رہے۔

حیدر جاوید کی وہی قاتل مقابل
 یہ صورت کب نہ تھی اسے دل مقابل

جب کبھی جالب کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے فلموں کی طرف رخ کیا اور گیت لکھنے لگے۔ ریاض شاہد کی فلم ”بھروسہ“ سے ان کو شہرت ملی۔
 فلمی گانوں کو انہوں نے ایک نیا موڑ دیا اور فلمی گیت نگار کی حیثیت سے بھی یہ کافی مشہور ہوئے۔
 کچھ سال پہلے انہوں نے ایک فلم پروڈیوسر بھی کی۔
 حبیب جالب کو کبھی بھی انعام یا صلے کی خواہش نہیں رہی۔ ہمیشہ وہ اس سے انکار کرتے رہے۔

ملک کی تقسیم سے پہلے وہ دہلی میں رہتے تھے۔ دہلی شروع سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ہر سال دہلی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ غالب ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن دنوں اُن کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ تب ہی سے ان کی طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہو گئی۔

ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ پاکستان کے بارے میں انہوں نے بڑے سببانے خواب دیکھے تھے۔ مگر انہوں نے وہاں دیکھا کہ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے۔ اور ملک استقلال کا شکار ہے۔ سبھی سب دیکھ کے غالب کے خواب ٹوٹ گئے۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ حکومت نے انہیں "کافر" کا فتوہ دے دیا۔ انہیں سخت مار مارا گیا۔ وہ فیض کے قریبی ساتھیوں میں تھے اور قن کے بڑے مداح تھے۔ لیکن بعض باتوں میں وہ فیض سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

ان کے سارے کلام کا مجموعہ کلیات کی شکل میں پہلی بار "سحرِ سردار" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں لندن سے شائع ہوا۔ بعد میں یہ مجموعہ لاہور سے بھی چھپا۔

"سحرِ سردار" کا انتخاب غالب نے اس طرح کیا ہے :

دار پہ لکھی ریح کہنے والے انسانوں کے نام

طالب علموں محنت کاروں دہقانوں کے نام

دنیا بھر کے اپنے جیسے دیوانوں کے نام

اپنے دیباچے "سحر آغاز" میں لکھتے ہیں۔ "ایک مدت سے جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان شعرا کے بارے میں لکھا جائے جو ازل سے رحمتِ ہندو حوام دشمن برسرِ اقتدار طبقے سے نبردِ آزما رہے ہیں۔ مثلاً قرۃ العین طاہرہ، منصور حلاج، ابو القاسم لاہوتی۔ ایران میں قاجاری اور پہلوی دور کے شعراء جن کے جسم میں موم تھیں گاڑی گئیں، زندانوں میں ڈالے گئے اور وہ شعرا پڑھتے رہے۔"

"پنج تو یہ ہے کہ میں ان کے سلسلے کا شاعر ہوں۔ مولانا حسرت موہانی اور غلام محی الدین کا بھی پیروکار ہوں۔"

ایک حساس اور سمجھا شاعر غلام کا نام سنا ہوتا ہے جب وہ انسانوں کو اُداس اور مایوس دیکھتا ہے تو خود مایوس نہیں ہوتا بلکہ انہیں مایوسی اور ناامیدی کے اس حصار کو توڑنے اور جہد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اشکوں کے جگمگوں سے اندھیرا نہ جائے گا
 شب کا صہار تو ذکر کوئی آفتاب لا
 ہر ہڈی میں رہا ہوں میں لوگوں کے درمیاں
 میری مثال دے کوئی مسیحا جواب لا
 کسی ملک کے مالک اس کے عوام ہوتے ہیں، محنت کش، مزدور اور دہقان ہوتے ہیں نہ کہ چند
 ایک سرمایہ دار اور ان کے گھرانے

یہ دھرتی ہے اصل میں پیارے مزدوروں دہقانوں کی
 اس دھرتی پر چل نہ سکے گی مرنی چند گھراؤں کی
 ظلم کی رات رہے گی کب تک اب نزدیک سویرا ہے
 ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
 حبیب جالب کہتے کو تو ایک خاص خطے اور ملک کے شاعر تھے۔ لیکن شاعر کی حیثیت آفاقی
 ہوتی ہے۔ وہ رنگ و فصل، زبان اور ملک اور سارے جمہور بھاؤ سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ ملک کی سرحدوں
 کو توڑ کر ساری دنیا کی دھرتی کی مٹی میں مل جاتا ہے۔ اور پھر اس کے ذہن سے اٹھتا ہے وہ ہر اُس جگہ
 موجود ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں جہاں انسان ظلم و استبداد، نا انصافیوں اور استعمار کا شکار ہو رہا
 ہوں اور وہ کچلے جا رہے ہوں۔

حبیب جالب ان معنوں میں ایک آفاقی شاعر تھے۔
 اُن کی شاعری اس دھرتی پر لیجنے والے سارے جمہور نے بس اور مظلوم انسانوں کی آواز ہے۔
 (مختار وارثی بی بی ایڈیٹ ۱۹۹۳ء)



نظیر

کلامیات

آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

اب بھی پیٹ کی خاطر بیک رہی ہے مجھری
اب بھی ہے غریبوں کی اشک و آہ مزدوری
اب بھی جھونپڑوں سے ہے نورِ علم کی دوری
آج بھی لبوں پر ہے داستانِ مہجوری
آج بھی مسلط ہیں سامراج کے سائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

آرمینیا کے لوگوں کا نوحہ

ہنٹے گاتے آنگٹنوں کو زلزلے نے آیا
چاند سے مہربوں کو مرگِ ناگہان نے کیا

جن پہ گذرا ہے یہ عالم ان کا غم بوجھاندم
اپنے دل کو کر کے ہم نے شاعری بھھایا

پھول بے پھول کا میس کر رہی تھیں تنہا
گھر نہ لوٹے ہائے گورستان کا رستہ لیا

ہو گیا اک آن میں دیران پر یوں کا دیار
آسمان تو نے زمیں سے کون سا بدل لیا
جان لیوا آفتوں پر عیال ہے بھی
کون کہتا ہے کہ ہم نے منزلوں کو کیا

توڑتے ہیں دمِ مغربس ہسپتال کے در پر
چارہ گر بھی ان کے ہیں جن کی جیب میں بٹیر
پڑکوں میں سوتے ہیں کتنے دجواں بے گھر
بھی چسپاتے ہوں گے ہم چلیں امٹا کے سر
کتنے پھول مر جھلے کتنے چاند گھٹناے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے
ہم بھی نہ چھوڑیں گے بات بر ملا کہن
ہاں نہیں شعار اپنا درد کو دوا کہہنا
مگر عوام خوش ہوں گے ہم کہیں گے کیا کہنا
جھوٹ ہے خوشامد ہے فخر الیشا کہن
رہنما وہی ہے جو فخر ملک کہلاتے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے



اپنی جنگ رہے گی

جب تک چند نیرے اس مرنے کو گھیسے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
اہل ہوس نے جب تک اپنے اک کبرے میں
اپنی جنگ رہے گی

مغرب کے چہرے پر بار اپنے خون کی اہلی ہے
لیکن اہل اس کے سوج کی ناز و فتنے الی ہے
مشرق کی تقدیر میں جب تک غم کے اندھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

غلم کہیں بھی ہو ہم اس کا خستہ کرتے جا بیٹے
معلوں میں اب اپنے لہو کے دے نہ جتنے پائے گیے
کنیاؤں سے جب تک مسجون نے مزہ پھرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

جان لیا لے اہل اکرم تم نولی ہو عیناروں کی
دست بگر کیوں بیٹھے ہے۔ رستی ہے خود اڑوں کی
دوبے ہوئے دکھ درد میں جب تک ہاتھ کیے ہیں
اپنی جنگ رہے گی



اپنی بات کرو

چھوڑو قفسہ زرداروں کا اپنی بات کرو
ناکانہ لو ان پر کاروں کا اپنی بات کرو
کل جو ہم پر چلی تھی گولی آج بھی وہی چلی
نوابوں کے وعدوں سے کرشمے کی شام چلی

کوئی نہیں ہم دکھیاڑوں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قفسہ زرداروں کا اپنی بات کرو
حال ہمارا کیا جانے گا کوئی دھن والا
آپ ہی آئیں گے تو ہر گاجیون اجالا
گیا زمانہ سرداروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قفسہ زرداروں کا اپنی بات کرو
رنگ برنگی کاروں والے آخر اپنے کون
یہ تو صورت ہی سے چھوڑ گئے ہیں غمخوار

ساتھ نہ دو ان خوشخواروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قفسہ زرداروں کا اپنی بات کرو



اپنے بچوں کے نام

یاس انگیز اندھیرا نہ کسی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمکنے لگی
صبح فرخندہ جبین کی صوٹ
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صوٹ



میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صوٹ
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحیر کی نظروں سے دیکھے گا ہمیں
پیاد کے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
پیاد اُگائے گی نگہ ہوں کو سکوں بجھنے گی

یہ زمیں حائلہ بریں کی صوٹ
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صوٹ

اپنے بیٹے طاہر عباس کی یاد میں

آج وہ زندہ جو ہوتا وہ بھی خط لکھتا مجھے
پڑھ کے نور افشاں کا خط وہ اور یاد آیا مجھے
یوں تو کیا پایا ہے اس جینے میں کہوں کے سوا
زندگی بھر اس کا کھوجانا نہ بھولے گا مجھے
پھول کو جب دیکھا ہوں میری بھرا آتی ہے آنکھ
لگ رہا ہے یہ جہاں صدیوں کا دیوانہ مجھے
جی بھی کیا سکتا تھا وہ اس سنگدل ماحول میں
اب سمجھ آیا جہاں سے اس کا اٹھ جانا مجھے



ایسے الفاظ نہ اور اقی لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے
خوں نہ بولے گا کبھی درد کی تنہائی میں
دل کسی خاک نشین کی صوٹ
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صوٹ

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل کے ناز اٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو

اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

بھوک ننگ سب دین اپنی ک ہے لوگو
بھول کے بھی مت ان سے عرضِ حال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو
ذلت کے جینے سے مرنا بہتر ہے
بٹ جاؤ یا نقصِ ستم پا مال کرو

صبح و شام نسلِیں میں خوں بہتا ہے
سایہِ مرگ میں کب سے انساں رہتا ہے
بند کرو یہ باوردی غنڈہ گردی
بات یہ اب تو ایک زمانہ کہتا ہے
ظلم کے ہوتے امن کہاں ممکن یا رو
اسے مٹا کر جگ میں امن بحال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

سامراج کے دوست ہمارے دشمن ہیں
اپنی سے اُنسو، اُنہیں اُنکُن اُنکُن ہیں
اپنی سے قتلِ عام ہوا آشاؤں کا
اپنی سے دیراں اُمیدوں کا گلشن ہے



ادیبوں کے نام

کی فہم دل کج کلاہ ادیبوں کو دیکھیے
بستی اجر چکے گی تو نکلیں گے مرثیے

تم نے تو کہا تھا اجالا کریں گے ہم
تم نے تو سب چراغ دلوں کے بجائیے
کرتے ہیں یونہی دو جہالت کی تیرگی
رکھنا تھا جن پہ ہاتھ وہی سترلم کیے
اپنوں سے اختلاف ہے غیروں سے جنگ ہے
ہو صورت عذاب ہر اک جان کی لیے
زندہ ہیں گام گام کنہجے رتہ قدم
تم ہی بتاؤ کوئی یہاں کس طرح جیے
بیٹے کی آند وہی تو مرنا پڑے گلاب
اشکوں سے اپنے زخم کوئی کب تملک جیے

جس ہاتھ نے اجاڑ دیا میرا گلستاں
اُس ہاتھ کو خدا کے لیے اٹھ کے روکیے

تم شکر کے پاسبان ہو میں خیر کا نشان
جو چیز تم چنے ہو وہی میں بھی چنے

مرگ کا طلوع کوہ کے چھپے آفتاب
شب مشتعل رہے گی کہیں یہ نہ چوچے



اجرائے مساوات

دل تھا مرا پہلے ہی سے تیرے مساوات
پھر کیے پسند آئے نہ اجرائے مساوات
خونخوار لیروں سے ہو آزاد یہ دھرتی
اس دیس میں اللہ کرے آئے مساوات
ہر آرم و فرعون کو آئینہ دکھائے
لوگوں کا جو لوگوں سے نہ شرائے مساوات
اسماں نہ اُٹھائے کسی سلطان کا جالب
منت کش امریکہ نہ کھلائے مساوات



اربابِ ذوق

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے 'کار سے نکلے دفتر پہنچے
دن بھر دفتر کو ترخایا
شام کو جب اندھیا چھایا
محفل میں ساغر چھلکایا

بگیا لہو لہبان

پھول پھول بھونرا لہو لہبان رات کے ایک بجے گھر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے 'کار سے نکلے دفتر پہنچے
غالب سے ہے ان کو غربت
میت سے بھی کرتے ہیں اُلفت
اور تخلص بھی ہے عظمت
گھر اقبال کے کھانے دعوت چھوٹی عمر میں کٹر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے 'کار سے نکلے دفتر پہنچے



بگیا لہو لہبان
چھلنی میں کلیوں کے سینے خون میں تپت پات
اور نہ جانے کب تک ہوگی انکوں کی برسات
دُنیا والو کب مبنیں گے دکھ کے دُنات
خون سے ہوئی کھیل ہے میں نہرتی کے لُٹان
بگیا لہو لہبان



امریکہ نہ جا

کر کے نذرِ گردشِ حالات امریکہ نہ جا
کیسے پورے ہوں گے اخراجات امریکہ نہ جا

تیرے ہی لطفِ کرم سے ہے ہماری زندگی
کر کے کم جینے کے امکانات امریکہ نہ جا
بس لڑائے رکھ یونہی جانِ جہاں ہمارے
بس بنائے رکھ ہماری بات امریکہ نہ جا

ایک پنڈی ٹھہر کیا تجھ پر نچھاور پورا ملک
بیجماہ آتشیں آفات امریکہ نہ جا
تیرے جانے سے تو جاں ہو جائیں گے برباد ہم
دے کے آشکوں کی ہمیں برسات امریکہ نہ جا

کلیخِ ذریں تجھ سے ہے تیری بدولتِ محنتِ تاج
تجھ سے قائم ہے ہماری ذات امریکہ نہ جا
خاک میں مل جائیں گے سارے ہمارے کروڑ فر
لوگ بیٹھے ہیں لگائے گھات امریکہ نہ جا

تو ہی بتلا کس طرح پائیں گے اتنی فوج کو
جوڑتے ہیں تیرے آگے ہاتھ امریکہ نہ جا



امریکیہ یا تیرا کے خلاف

طوافِ کوئےِ ملاحت کو پھر نہ جا لے دل
 نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک لڑا لے دل
 نہیں ہے کوئی وہاں درد آشنائے دل
 اُس آنجن میں نہ کر عرضِ دعا لے دل
 خیالِ تجھ سے زیادہ اُسے عدا کا ہے
 وہ بے دغا ہے اے اب نہ منہ لگا لے دل
 پیسے ہیں داغ بہت اس کی دستِ نے تجھے
 اب اور دشمن جاں کو نہ آزمائے دل
 جو اس سے دور ہیں وہ بھی پیرِ آج تک نہ
 سمجھ نہ اُس بتِ کافر کو تو خدا لے دل
 اُسے رہی ہے سدا اپنی مصلحت درپیش
 اُسے کسی کے زبیاں کا ملال کیا لے دل



ہمارے ساتھ ہے ہیں جربازوں کی طرح
 نہ ہو سکیں گے کبھی ان سے ہم جدا لے دل
 ہر ایک دور میں ہم ظلم کے خلاف ہے
 یہی ہے جُرمِ ہمارا یہی خطا لے دل
 زمانہ آج نہیں معصیت تو کل ہوگا
 ہر امتِ ملا میں تو ثابت قدم رہا لے دل
 وطن کے چاہنے والے سمجھ رہے ہوں گے
 کہ جس خلوص سے جالبِ غزل لے دل

ایک شام

یہ شام نغمہ بہ لب شام خوبصورت شام
یہ شام ایک زمانے کے بعد آئی ہے
یہ شام جامِ بکفت شامِ رنگ و نور کی شام
خبر دے کے نامِ جمنوں کا پیام لاتی ہے

سکون لوٹنے والے تو چاہتے ہیں یہی
کہیں سکون نہ ملے ہم سے غم کے اردن کو
چمن ادا اس ہے یونہی اپنے خوابوں کا
یونہی ترستے رہیں ہم حسیں بہار دن کو

تمام عمر بڑی ہے غم جہاں کے لیے
غم جہاں سے نگاہیں ذرا پچالیں آج
بجاکر محبتوں کی نظر ہمیں پر ہے
ہر ایک خوف پہ جی بھر کے مکرالیں آج

کریں بہار کی باتیں صبا کے لیے میں
کسی حسیں سے کہیں فیض کی غزل گائے
دیار دل کو اجالیں عدم کے شعروں سے
نرخِ حیات پہ رنگ آئے روشنی آئے

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار
ہم سے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی
ہم سے ہاتھ میں ہے آتیبِ عالم تاب
فیبر اکے دکھائے شبِ الم کوئی

عہدِ شیرازی حرم



اے اہل عرب اے اہل جہاں

اے اہل عرب اے اہل جہاں
 رگین کا مسطادو نام و نشان
 انصاف ہے جس سے اشک نشان
 پیچ جس کی طبیعت پر ہے گراں
 جو بولتا ہے نفرت کی زباں
 جو بانٹتا ہے آہوں کا دھواں
 خطرے میں ہیں جس سے یڈہ درال
 اس دہریس امن کا ہر اسکاں
 اے اہل عرب اے اہل جہاں
 انسان کی شانِ قدانی ہے
 عالم کی آنِ تقدانی ہے
 اپنا دل جانِ تقدانی ہے
 جیونِ مسکانِ تقدانی ہے
 پیچ کی پیرچہ تقدانی ہے
 پیچ کی برہانِ تقدانی ہے
 اس جیسا بنو مردِ میداں
 اے اہل عرب اے اہل جہاں
 رگین کا مسطادو نام و نشان

اے اہل عرب اے اہل جہاں
 درز وہ مسطادے گا تم کو
 مٹی میں ملا دے گا تم کو
 کچھ ایسی فسادے گا تم کو
 ظلمت میں چیلے گا تم کو
 جینا ہی بھلا دے گا تم کو
 رفعت سے گرا دے گا تم کو
 پاؤں گے سورج چاند کہاں
 اے اہل عرب اے اہل جہاں



اے جہاں دیکھ لے!

اے جہاں دیکھ لے کبے بے گھر میں ہم
اب بیکل آئے ہیں لے کے اپنا علم
یہ محلات یہ اونچے اونچے مکان
ان کی بنیادیں ہے ہمارا لبو
کل جو مہمان تھے گھر کے مالک بنے
شاہ بھی ہے عدو شیخ بھی ہے صو
کب تک ہم سبہیں غاصبوں کے تم
اے جہاں دیکھ لے کبے بے گھر میں ہم
اب بیکل آئے ہیں لے کے اپنا علم

اتنا سادہ رہن بجھ کو معلوم ہے
کون گھسیکے ہوئے ہے فلسطین کو
آج کھل کے یہ نعرہ لگا اے جہاں
فتاکو رہنوز یہ زمیں چھوڑ دو
ہم کو لڑنا ہے جب تک کہ دم میں دم
اے جہاں دیکھ لے کبے بے گھر میں ہم
اب بیکل آئے ہیں لے کے اپنا علم



اکتوبر انقلاب

اس انقلاب سے انسان کا بول بالا ہوا
اس انقلاب سے کٹیاؤں میں اُجالا ہوا
اس انقلاب کا دن اس لئے مناتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اس انقلاب سے محنت کشوں کا راج آیا
اس انقلاب سے انصاف کا سماج آیا
جب اس کے رنگ نگاہوں میں مکراتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اس انقلاب نے تقدیر کو بچھاڑ دیا
ہر ایک جبر کی بنیاد کو اکھاڑ دیا
ہم اس کے دیپ خیالوں میں جب جلاتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں
اس انقلاب کی پینا سبر ہوائیں مہیں
اس انقلاب کی باہوں میں یہ نضائیں ہیں
اس انقلاب کے جب خواب ہم سماتے ہیں
تمام رنج و الم شب کے بھول جاتے ہیں



اے تختِ لخت دیدہ ورو

بٹے رہو گے تو اپنا یونہی بچے گا لہو
 ہوئے نہ ایک تو منزل نہ بن سکے گا لہو
 ہو کس گھمنڈ میں اے تختِ لخت دیدہ ورو
 تمہیں بھی قاتلِ محنت کشاں کہے گا لہو
 اسی طرح سے اگر تم انا پرست ہے
 خود اپنا راہنما آپ ہی بنے گا لہو
 سونو تھا اے گریبان بھی نہیں محفوظ
 ڈرو تمھارا بھی اک دن حساب لے گا لہو
 اگر نہ عہد کیا ہم نے ایک ہونے کا
 غنیمت سب کا یونہی بیچتا رہنے گا لہو
 کبھی کبھی برے بچے بھی مجھ سے پوچھتے ہیں
 کہاں تک درِ ثو خشک اپنا ہی کرے گا لہو
 سدا کہا یہی میں نے قریب تر ہے وہ دُور
 کہ جس میں کوئی ہمارا نہ پی سکے گا لہو



ایک یاد

کچے آنکھن کا وہ گھسروہ بام و در
 گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
 وہ ندی کا سرسری پانی شجر
 جا نہیں سکتا بجا ان تک مگر
 سامنے رہتے ہیں وہ شام و سحر

آئے سرِ عالم کئی غاصب کئی قاتل
 ظلمت کہاں ٹھہری ہے آج لوں کے مقابل
 حق ہی نے کیے پارا منڈتے ہوئے دیا
 باطل کو ملا سے نہ ملے گا کبھی سچ



اے مدیرِ امن

اے مدیرِ امن تیرے شہر کو کیسا ہو گیا
بجھ گئے بازار گلیوں میں اندھیرا ہو گیا

اس دبستانِ ادب کو کھا گئی کس کی نظر
دیکھتے ہی دیکھتے اک حشر برپا ہو گیا

ہو گئی دنیا ہماری اور بھی بے آسرا
اور بھی ہم بے کسوں کا خون سستا ہو گیا

زندگی کے لب پہ آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سکیاں لینے لگے سُرقتلِ نغمہ ہو گیا



۲۴ جولائی ۱۹۸۷ء

بد بخت سیاستدانو

بد بخت سیاستدانو
شاہوں کے قیدیہ خوانو
ایران میں حشر پایا ہے
کچھ تم کو خوفِ خدا ہے
کب ظلم کو ظلم کہو گے
شیطان نما انسانو

بد بخت سیاستدانو
شاہوں کے قیدیہ خوانو

نہیں کوں کی حمایت کب تک
لوگوں سے یغوت کب تک
سورج کو نہ روک سکو گے
کب تک دیوار بنو گے
بس دور میں تم رہتے ہو
صرصر کو صبا کہتے ہو
کیوں دشمن جہاں کو چل پل
دیتے ہر صدا انا دانا!

بد بخت سیاستدانو!
شاہوں کے قیدیہ خوانو!

بے گھر ہیں فلسطین والے
صحرا میں ہیں خیمے والے
خطرے میں ہے امنِ عالم
حالات کا رخ پہنچاؤ

بد بخت سیاستدانو
شاہوں کے قیدیہ خوانو



امریکہ کے ایجنٹوں سے ملک بچانا ہے تم کو
گلی گلی میں آزادی کا دیپ جلانا ہے تم کو
جن کے کارن اپنے وطن میں گھر گھر آج اندھا ہے
اُن کالی دیواروں کو رستے سے ہٹانا ہے تم کو
فوکِ شاہی اس میں پیارے انگریزوں کی لعنت ہے
اس انگریزی لعنت کا ہر نقش مٹانا ہے تم کو
بیڑا غرق جو کرے ساتھی اس امریکی بیڑے کا
بھر ہند میں اک ایسا طوفان اٹھانا ہے تم کو



۱۹۷۱ء کے خون آشام بنگال کے نام

محبت گولیوں سے بور ہے ہو
وطن کا چہرہ خون سے دھڑ ہے ہو
گمماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منزل کھوئے ہو

(مقامی پاکستان ہمارا مکتی ہے، نئی دہلی)



لوگو

جھکے گا ظلم کا پرچم یقین آج بھی ہے
مرے خیال کی دنیا حسین آج بھی ہے
بہت ہوائیں چلیں میرا رخ بد نے کو
مگر نگاہ میں دوسرا زمین آج بھی ہے

آخری راستے پر سفر بھگانا لوگو
حسن اور اک کی شمعیں نہ بجھانا لوگو
انتہا ظلم کی موج سے دنا دنا لوگو
غیر ممکن ہے محبت کو مٹانا لوگو



صوبہ ہندوؤں کے سفر میں ہے کاروان حسین
یزید چین سے مسند نشین آج بھی ہے

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھائے ہیں محبت مٹیں گے مجھے
میں بے شعور ہوں کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب بلا ان کی آنجن سے مجھے
پیر جو شہ کی بنے غاصبوں کے کام آئے
خدا پچانے رکھے ایسے علم و فن سے مجھے



بھیک نہ مانگو

پاکستان کی غیبت کے رکھوالو
بھیک نہ مانگو
توڑ کے اس کشکول کو آدمی کھا لو
بھیک نہ مانگو

اپنے بل پر چلنا کب سیکھو گے
طوفانوں میں پلنا کب سیکھو گے
یہ کہنہ تقدیر کا شکوہ کب تک
اس کو آپ بدلنا کب سیکھو گے
خود اپنی گزری تفتیر بن لو
بھیک نہ مانگو

یہ جوراہ میں کالے لبغ کھڑے ہیں
کب یہ آزادی کی جنگ لڑے ہیں
جن کا آزادی میں خون ہے شامل
جب تک حبیلوں میں وہ لوگ پڑے ہیں
دقت کھن ہے دیس کی آن بچا لو
بھیک نہ مانگو

انگریزوں کے پیچھو کہہ سلاؤ نا
امریکی کے تلوے سہ سلاؤ نا
آج تک ان کے دھوکے کھائے ہیں
اور مگر ان کے دھوکے کھائے نا
آزادی کے سر پہ خاک نہ ڈالو
بھیک نہ مانگو



بیٹھا ہے

اثر اُس پر نہیں کچھ بھی یوں ہی وہ تن کے بیٹھا ہے
خدا کی ساری کافر ہے وہ مومن بن کے بیٹھا ہے
دلن آدھا گیا آدھا پریشاں کی زد میں ہے
نہیں پروا اسے اس کی بیڑا لہن کے بیٹھا ہے

بیاد شاہ عبداللطیف بھٹائی

پچھلے دنوں جو بلوانوں نے یہاں قیامت ڈھائی
اُس پر کیا کیا دل دیا ہے پوچھ نہ شاہ بھٹائی
اپنی اپنی سوچ ہے پیارے اپنا اپنا دل ہے
تو نے لیں قاتل کی بلاتیں آنکھ مری بھڑائی

میں نے اتنی دوسے خوں بہنے کا شور سنا ہے
پاس ہی رہنے والوں تک کوئی آواز نہ آئی
یوسف کے قصے سے ہم کو یہ اور اک ہوا ہے
مال منال کے سب میں بندے کون کسی کا بھائی

تخت و تاج کی انہوں کی ادھاکر دیتی ہے
ہر صبح کی پہچان سے عساری ہوتی ہے الائی



بھٹے کبیر اُداس

اک پڑی پر سسڑی میں اپنی تقدیر کو ملے
دو جاز لغوں کی چھاؤں میں سکھ کی تیج پہ سٹے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھٹے کبیر اُداس

اوپنے اوپنے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگر میں پنڈت دھکے کھلیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں من ہے جن کے پس
بھٹے کبیر اُداس

گیت نکھائی پینے نادیں نم نگر کے لوگ
اُن کے گھر باجے شہنشاہ کی بھگت گھر لوگ
گالک سسر میں کیر نکو گئے کیوں ناکالے ٹھاس
بھٹے کبیر اُداس

کل تک تھا جرمال ہمارا حال وہی ہے آج
جالت اپنے دہیں میں سکھ کا کال ہی ہے آج
پھر بھی موچی گیت پہ نیند زکریں بکواس
بھٹے کبیر اُداس



بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد

اور کروڑوں ہیں ناشاد

صدر ایوب زندہ باد

آج بھی مسم پر جاری ہے

کالی صدیوں کی بیداد

صدر ایوب زندہ باد

بیس روپیہ من آنا

اس پر بھی ہے ستنا

گھر، سرنگھل، آدم جی

بنے ہیں برلا اور ٹانا

ملک کے دشمن کھلاتے ہیں

جب ہم کرتے ہیں سرمایہ

صدر ایوب زندہ باد

لاسنوں کا موسم۔ ہے

کنونشن کو کیا غم ہے

آج حکومت کے در پر

ہر شاہیں کا سرخسہ ہے

درس خودی دینے والوں کو

بھول گئی اقبال کی یاد

صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی

چپ ہیں سپاہی بارڈی

شعب نولے اہل سخن

کالے باغ نے کھن کر دی

اہل نفس کی قید بڑھ کر

حکم کر لی اپنی میعاد

صدر ایوب زندہ باد

یہ میثاق استنبول

کیا کھولوں میں اس کا پول

بیتا ہے گاموں میں

کب تک بے جنگم دھول

سائے عرب ناراض ہوئے ہیں

سیٹو اور سنو میں شاد

صدر ایوب زندہ باد

گلی گلی میں جنگ ہوئی

خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی

اہل نظر کی سر بستی

جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی

وہ دستور ہمیں بخشا ہے

نفرت ہے جس کی بنیاد

صدر ایوب زندہ باد



پاکستان کا مطلب کیا؟

روٹی، کپڑا اور دوا

گھر بننے کو چھوڑنا

مفت مجھے تعلیم دلا

میں بھی مسلمان ہوں لاشہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

امریکے مانگ بیچیک

مت کر لوگوں کی تضحیک

روک نہ جمہوری تخریک

چھوڑ نہ آزادی کی راہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

کھیت و زیدوں سے لے لو

میں نسیروں سے لے لو

نمک اندھیروں سے لے لو

ہے نہ کوئی عالی جاہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

حسبہ سندھ، بلوچستان

تینوں میں پنجاب کی جان

اور بنگال ہے سب کی آن

آئے زن کے لب پہ گاہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

بات یہی ہے بنیادی

گوں کو ہو آزادی

غاصب کی ہو بربادی

حق کہتے ہیں حق نگاہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ



ترانہ

اب دہریس بے یار و مددگار نہیں ہم
پہلے کی طرح بے کس ولاچار نہیں ہم
آتا ہے ہیں اپنے معتد کو بنانا
تقدیر پر شکر پس دیوار نہیں ہم

تم ظلم کیے جاؤ خدا ہی ہو اپنے
ساتھی حسین برابر کے پستار نہیں ہم
سب جو دستم لطف و کرم پیش نظر ہیں
یہ وہم تمھارا ہے کہ بیدار نہیں ہم
کیوں دست بگر ہو کے خین بر عالم
ذی عقل میں ذی علم میں بیار نہیں ہم
ایمان خدا پر ہے محمدؐ پر یقین ہے
لیکن یہ حجاب واقف اسرار نہیں ہم

پس دیوارِ زنداں

اپنی آہوں کا ستم گر پہ اثر ہونے تک
ہم کو جلتا ہے یونہی رات بسر ہونے تک
صرف سودا ہی ضروری بنیں دیوانوں میں
سر بھی درکار ہے دیوار کو در ہونے تک



ترانہ دوستی

پاک رُوس دوستی زندگی
 پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
 پاک رُوس دوستی زندہ باد
 مجھے گل جان جنگ سے پیس لے ہوک جنگ سے
 کیلے گا چہرہ دِلن بھتوں کے رنگ سے
 ہوا کے اُلک اُلک میں بیس لے جلتہ رنگ سے
 منتظر ہے دیر سے یہ زمین امن کی
 پاک رُوس دوستی زندگی
 پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
 پاک رُوس دوستی زندہ باد
 نہ لٹ سکیں گلِ محنتیں نہ چک سکیں گلِ حسرتیں
 ایسا راس دیار کے نہ دے سکیں گلے و لبتیں
 نصیب میں یہ سنگدل نہ لکھ سکیں گلے ٹللتیں
 دیکھتے ستم زدو غم کی رات اب وصل
 پاک رُوس دوستی زندگی
 پاک رُوس دوستی روشنی روشنی
 پاک رُوس دوستی زندہ باد



تیرے ہونے سے

دل کی کوئیل ہری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

یکشت زاروں میں تو، کارخانوں میں تو
ان زمینوں میں تو، آسمانوں میں تو

شعریں، نثر میں، داستانوں میں تو
شہر، صحرا میں تو اور چٹانوں میں تو

حسنِ موت گری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

تجھ سے ہے آفرینش، نمو، ارتقاء
تجھ سے ہیں تاملے، راستے، رجحان

زیر دستوں کی بہشت، بندھانے بھل
ہم خیال اور اپنے بنانے بھل

لب کشا بے کسی تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے



تیز چلو

یہ کہہ رہا ہے دل بیستار تیز چلو
 بہت ادا اس ہیں زنجیر و دار تیز چلو
 جو تھک گئے ہیں انہیں گردِ راہ پہنے دو
 کسی کا اب نہ کرو انتشار تیز چلو
 خزاں کی شام کہاں تک ہے گی سایہ نلگن
 بہت قریب ہے صبحِ بشار تیز چلو
 ہمتی سے خوفزدہ ہیں زمین و زوالے
 ہمتی ہو چشمِ ستم گر پہ تیز چلو

کردِ خلوص و محبت کو رہنما اپنا
 نہیں درست دلوں میں غبار تیز چلو
 بہت ہیں ہم میں یہاں لوگ گفتگو پیش
 ہے اُن کا صرف یہی کار و بار تیز چلو
 خرد کی سُرست روی سے کہے لی منزل
 جنوں ہی اب تو کرو اختیار تیز چلو



جاگ مرے پنجاب

جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
 نوٹ چلے سب خواب کہ پاکستان چلا
 سندھ بلوچستان تو کب سے روتے ہیں
 اور اہل پنجاب ابھی تک سوتے ہیں
 آنکھیں ہیں پُر آب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
 جن کو ذات کا غم ہے کب مٹانے میں
 بے بس لوگوں پر بندوقیں تلنے میں
 قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
 آگ کی بارش سے بے گلشن بھلوں بھلوں
 روش روش اب کلیوں کی مہکار کہاں
 سپنا ہوئے گلاب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

زُعم ہے یہ بلوانوں کو ہم جیتیں گے
 اور کہوں میں دکھ کے یہ دن بیتیں گے
 جاگ ہوئے زہراب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
 افسردہ غزلیں گریاں افسانے میں
 حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ویرانے میں
 دریا ہوئے سراب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
 ! نہیں چلن سے ہم سے جدا بنگال ہوا
 پوچھ نہ اس دکھ سے جو دل کا حال ہوا
 رو کو یہ سیلاب کہ پاکستان چلا
 جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا



جمہوریت

دس کروڑ انسان!

زندگی سے بیگانہ

صرف چند لوگوں نے حق تمہارا چھینا ہے
 خاک ایسے جینے پر یہ بھی کوئی جینا ہے
 بے شعور بھی تم کو بے شعور کہتے ہیں
 سوچتا ہوں یہ ناداں کس جہاں میں رہتے ہیں
 اور یہ قصیدہ گو فکرم ہے یہی جن کو
 ہاتھ میں علم لے کر تم نہ اُنھ کو دوگو
 کب تک یہ خاموش چلتے پھرتے زندان

دس کروڑ انسان!

یہ ملیں یہ جائیں یہ کس کا خون پیتی ہیں
 ہر کون میں یہ فوجیں کس کے بل پہ پیتی ہیں
 کس کی محنتوں کا پھل داشتائیں کھاتی ہیں
 جھوٹوں سے رونے کی کیوں صدائیں آتی ہیں
 جب شباب پر آکر کھیت لہلہاتا ہے
 کس کے زین روتے ہیں کون مُکراتا ہے
 کاش تم کبھی سمجھو کاش تم کبھی جانو

دس کروڑ انسان!

علم دفن کے رہتے ہیں لاشوں کی یہ بازیں
 کالجوں کے لڑکوں پر گولیوں کی بوجھازیں

یہ کر لئے کے غنڈے یادگار شب دیکھو
 جس تندہییا تک ہے ظلم کا یہ ذمہ دیکھو
 رقصِ آتش و آہن دیکھتے ہی جاؤ گے
 دیکھتے ہی جاؤ گے ہر شس میں جاؤ گے
 اے غموش طوفان!

دس کروڑ انا!

سینکڑوں حسن ناصر ہیں شکارِ نفرت کے
 صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
 تب سے کالے بانوں نے آدمی کو گھیرا ہے
 شعلیں کر درویشن دور تک اندھیرا ہے
 میرے دس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
 پتھروں کی بارش ہی اس پکیوں برقی ہے
 ملک کو بچاؤ بھی ملک کے تنگبانا

دس کروڑ انا!

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
 پاؤں میں عنلائی کی آج بھی ہیں زنجیریں
 آج حرفِ آخر ہے بت چند لوگوں کی
 دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
 اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
 جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
 دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو

دس کروڑ انا! ❀

جواں آگ

گوئیں سے یہ جواں آگ نہ بجھ پائے گی
گیس پھینکو گے تو کچھ اور بھی لہرائے گی

یہ جواں آگ جو ہر شہر میں جاگ اٹھی ہے
تیرگی دیکھ کے اس آگ کو بھاگ اٹھی ہے

کب تک اس سے بچاؤ گے تم اپنے ٹماں
یہ جواں آگ جلائے گی تمہارے ایوان

یہ جواں خون بہایا ہے جو تم نے اکشر
یہ جواں خون بھل آیا ہے بن کے لشکر

یہ جواں خون سیہ ات نہ رہنے دے گا
دکھ میں ڈوبے ہوئے حالات نہ رہنے دے گا

یہ جواں خون ہے محلوں پہ پکٹا طوفاں
اس کی مینا سے ہر اہل بستم ہے لرزاں

یہ جواں منکر تمہیں خون نہ پینے دے گی
غاصبو! اب نہ تمہیں چین سے جینے دے گی

قاتلو! راہ سے ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں
اپنے ہاتھوں میں یہ سرخ علم آتے ہیں

توڑ دے گی یہ جواں منکر حصارِ زنداں
جاگ اٹھے ہیں میرے دیس کے بکیراں



۱۴ اگست

کہاں نونی ہیں زنجیریں ہمدای
کہاں بلی ہیں تقدیریں ہمدای
وطن تھا ذہن میں زنداں نہیں تھا
چس خرابوں کا یوں دیریں نہیں تھا
نئی ہر گام پر اُمید اپنی
محترم بن گئی ہر عید اپنی
سلط ہے سسوں پر ات اب تک
وہی ہے صورت حالات اب تک

بہادروں نے دیے وہ داغ ہم کو
نظر آتا ہے مقتل باغ ہم کو
گھسوں کو چھوڑ کر جب ہم چلتے
ہمارے دل میں کیا کیا زلزلے تھے
یہ سوچا تھا ہمدایاں آج ہو گا
سب محنت کشاں پر تاج ہو گا
نہ لٹے گا کوئی محنت کسی کی
لے گی سب کو دولت زندگی کی
نہ چائیں گی ہمدایاں مشینیں
نہیں گی رشک جنت یہ زمینیں
کوئی گوہر کوئی آدم نہ ہو گا
کسی کو ہرنوں کا عشم نہ ہو گا
خوشی ہے چن لوگوں کی دراشت
کہا جاتا ہے عشم ہیں اپنی قسمت
ہوئے ہیں جھونپڑے ہی نذر طوفان
مگر فتنم ہیں اب تک قصر الیواں
خدایا کوئی آندھی اس طرف بھی
الٹ دے ان نگہداروں کی صفت بھی
زمانے کو جلال اپنا دکھائے
جلا دے تخت و تاج انکے جلائے
ہے اب تک پا بجولاں خطہ پاک
پڑی آزادیوں کے سر پہ ہے خاک
ستارہ اوج پر ہے ہرنوں کا
نہیں پرسان کوئی حسد تنوں کا

نہیں وقت کسی اہل نظر کی
 عبادت ہو رہی ہے سیم و زر کی
 میں باہر باتیاں سازندے اندر
 یہ سب غنڈوں کے ہیں کانٹے اندر
 خوشامد کا صلہ تمغائے خدمت
 خوشامد سے ملے ہنگاموں کو عزت
 ابھی غنڈے تو ہیں محلوں میں آباد
 کریں گے ہم وطن کو ان سے آزاد
 خوشامد جو کرے فن کار ہے وہ
 جو بیچ بولے یہاں غدار ہے وہ
 کریں گے ضبط ہم جاگیران کی
 نہ چسپنے دیں گے ہم تیران کی
 یہ دولت کی ہو س جاگیر داری
 ہیں دونوں لعنتیں دشمن ہماری
 یہ دونوں لعنتیں جب تک ہیں گڑ
 جہاں میں ندیاں خوں کی بہیں گڑ



لب اہل مسلم پر ہیں قصیدے
 دکان نکیلیاں کی ہیں یا جریدے
 شہابندوں کی ہم سنتے ہیں اکثر
 خدا سے بھی زیادہ ریڈیو پر

ادیب دشاعر و ملا و درہبہر
 سبھی کچھ ہو گیا ڈپٹی کمشنر

ادیبوں کو ہے آدم جی نے گھیرا
 چٹانوں پر کہماں ان کا بیہرا

ادب میں اب کہاں دل کا اجالا
 ادیبوں نے مسلم کو بیچ ڈالا

جتے لہو میں سب ترا مفہوم بہہ گیا
 ۱۴ اگست صرف ترا نام رہ گیا
 جلنا ہے غم کی آگ میں، ہم کو تمام شب
 بجھتا ہوا چراغِ سرِ شام کہہ گیا
 مہتا اگر پہاڑ تو لاتا نہ تابِ غم
 جو رنج اس نگر میں یہ دل ہنس کے سہ گیا
 گزے ہیں اس دیار میں یوں اپنے روز و شب
 خورشید کچھ گیا کبھی مہتاب کہہ گیا
 مجھ سے خفیف ہیں مرے ہم عصر اس لیے
 میں داستانِ عہدِ ستم کھل کے کہہ گیا
 شاعرِ حضورِ شاہ بھی سرِ بل گئے
 جالب ہی اس گناہ سے بس دور رو گیا



حسب فرمانِ بَیْن

میں تجھے پھول کہوں اور کہوں بھونڑوں سے
آؤ اس پھول کا رس چرس کے ناچر جھومو
میں تجھے شمع کہوں اور کہوں "پر دانوا"
آؤ اس شمع کے ہونٹوں کو خوشی سے چومو

میں تری آنکھ کو تشبیہ دوں میخانے
اور خود زہرِ جدائی کا طلب گار ہوں
غیر سوتے تری زلفوں کی گھنٹی چھاؤں میں
اور میں چسانہ زانوں میں فقط شعر کہوں

مجھ سے یہ تیرے قسیدے نہ لکھ جائیں گے
مجھ سے تیرے لیے غزلیں کہیں جائیں گی
یاد میں تیری میں سلگتا نہ سکوں گا آنکھیں
سمتیاں در کی مجھ سے نہ سہی جائیں گی

شہر میں ایسے مصور ہیں جو سکوں کے عوض
حسن میں لیلیٰ و عذرا سے بڑھا دیں گے تجھے
طول نے کر تری زلفوں کو شبِ غم کی طرح
فن کے اعجاز سے ناگن سی بنا دیں گے تجھے

تجھ کو شہرِ بستر کی ضرورت ہے محبت کی بجھے
اے حسین تری منزل مری منزل میں نہیں
ناچ گھر تیری نگاہوں میں ہیں قصاں مسکین
اس تعیش کی تمنائیں مرے دل میں نہیں

دیکھ کے غیر کے پہلو میں تجھے رقص کناں
بھیگ جاتی ہے مری آنکھ سرِ شکرِ غم سے
مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے
جس نے اندازِ وفا چھین لیا ہے ہم سے

مجھ کو بھونڑا نہ سمجھ مجھ کو پتنگ نہ سمجھ
مجھ کو انسان سمجھ میری صداقت نہ کھین
تیرے تفریح کا سامان نہ بنوں گا حصارِ گز
میری دنیا ہے یہی میری محبت نہ کھیل



خدا ہمارا ہے

جلسم سائے خوت دہراس توڑینگے
تدم بڑھائیں گے زنجیر یاس توڑینگے
کبھی کسی کے ذہم دل کی آس توڑینگے
ہے گایاد جو عہدِ بستم گزارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے



خدا یا یہ ظالم بے گھروں پر

خدا یا یہ ظالم بے گھروں پر
کوئی بھی گرفتِ زگروں پر
یہ اے اہل جور یہ ظالم نہیں
مسلط جانے کب ہیں سروں پر

یہ خوں بچوں کا اور ماؤں کا خون ہے
پڑا ہے جو سروں کی چادر ہے
خوش و غم شہ و شہنشاہوں ہیں
مہر آفتِ نوحی ہے بے زروں پر
شنا خواں اب بھی ہیں جو قاتلوں کے
خدا یا جسم ان دانشوروں پر



خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھڑو
بڑھا داپنی دکانِ سیم و زر کے دیو
نشان کہیں نہ ہے گاتھارا شیخانو
ہیں یعتیں ہے کہ انسان کو چلیے
خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

نئے شعور کی ہے روشنی لگا ہوں میں
اک آگ سی بھی ہے اب اپنی مڑا ہوں میں
بکھلیں گے پھولِ نظر کے سحر کی بانہوں میں
دکھے دلوں کو اسی آس کا سہارا ہے
خدا تمھارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

خطرے میں اسلام نہیں

خطرہ ہے زرداروں کو
گھرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے پیاروں کو
خطرہ میں اسلام نہیں

ساری زمیں کو گھیرے ہوئے ہیں آفرینہ گھرانے کیوں
نام نہی کالینے والے الفتنے بیگانے کیوں

خطرہ ہے خون خراشوں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امریکے کے پیادوں کو
خطرے میں اسلام نہیں

آج ہمارے غروں سے لڑہ ہے پالو انڈوں میں
یک نہ سکیں گے حسرت و ارمان پونجی سبھی کانوں میں

خطرہ ہے بیت بائیں کو
مغرب کے بناروں کو
چروں کو مچھروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

امن کا پرچم لے کر، محو ہر انسان سے سپرد کرد
اپنا تو منشور ہے جالب سارے جہاں سے سپرد کرد

خطرہ ہے دریائوں کو
شاہروں کے غنواروں کو
توابوں، عتباروں کو
خطرے میں اسلام نہیں



دادا امیر حیدر

نہیں ہے کوئی بھی داغِ سجدہ تری جہیں پر
دُٹارِ اعراض و فانیں تو زندگی بھر
کھڑے ہیں ساحلِ یہ ہم سمندر کا تو شناور
میں اپنی عزت بڑھا رہا ہوں ترلے چند شمر کر
عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

زبان و دل مختلف نہیں ہیں
کہا جو تو نے وہی کیا ہے
کہاں کوئی اس طرح جیا ہے
کہاں کوئی باضمیرِ تجھ سا
تو وہ نوا ہے دبا نہ پایا
جسے جہاں میں کوئی مستگر

عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر



غذاب ہے اپنی سادہ لوحی
لبوں پر رہتی ہے باتِ دل کی
نسانہ کہتا ہے اُس کو مانوں
نہیں جھلک جس میں کوئی تیری
منافقوں میں گمراہ ہوں
یکدم سے نکلوں میں ان سے بچ کر

عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

داستانِ دلِ دو نیم

دیکھنے کیا لگے سہانے خواب
ہو گئے اپنے آشیانے خواب
یہ بجز زلیبتِ پاپیادہ تھی
دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی
شاخ سے نوٹ کر بواکے ہوئے
ذرِ بدر اُس گلی سے آکے ہوئے
اجنبی لوگ اجنبی راہیں
لب پہ آباد ہو گئیں آہیں
ہوئے آفتِ فرنگیوں کے عِلام
شبِ آلام ہو سکی نہ تمام
ہو گئے حکمِ راں کیمنے لوگ
خاک میں مل گئے نیگنے لوگ
ہر محبِ وطنِ ذلیل ہوا
رات کا فاصلہ طویل ہوا
بے حیائی کو جس نے اپنایا
دہی عزتِ مآب کھلایا

اک حسین گاؤں تھا کہ آب
کنٹاشاداب تھا دیارِ آب
کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مغلی میں بھی ایک مستی تھی
کتنے دلدار تھے ہم اے دوست
وہ بچائے وہ بے سہائے دوست
اپنا اک دائرہ تھا، دھرتی تھی
زندگی چین سے گزرتی تھی
قتل جب یوسف و زلیخا کا
مینے مینے سردوں میں چھڑاتا
تصویر شاہوں کے بنے لگتے تھے
چاک سیزوں کے بسنے لگتے تھے
گیت سنتے تھے گیت گاتے تھے
دوب کر سُر میں دن بتاتے تھے
یوں بھڑک اٹھی نعرہ توں کی آگ
زندگی میں رہے دو رنگ نہ راگ

اک غمِ سراپا زہنگی پر ڈال
 اک غمِ سراپا اپنے اردلی پر ڈال
 فاصلہ خود ہی کر ذرا محسوس
 یوں نہ اسلام کا نکال جاکس
 یہ زمیں تو حسین ہے بے حد
 حکمرانوں کی منتیں میں بے
 حکمراں جب تک ہیں یہ بے درد
 اس زمیں کا رہے گا چہرہ درد
 یہ زمیں جب تک نہ لیں گے ہم
 اس سے اگتے رہیں گے یونہی علم
 بے گھڑی کو کریں گے ہم ہی درد
 ہم ہی دیں گے دوں کو پیار کا درد
 حلق صدیوں کے ظلم کی ماری
 یوں نہ حیراں پھرے گی بے چاری
 روٹی کپڑا مکان ہم دیں گے
 اہلِ محنت کو شان ہم دیں گے
 اس خزاں کو مستائیں گے ہم ہی
 فصلِ گل لے کے آئیں گے ہم ہی



آسمانوں کے جو گیت گاتے رہے
 وہی انعام و داد پاتے رہے
 مسزوں نے جو رزنی کی بجتی
 رہبروں نے بھی کیا کمی کی تھی
 ایک بار اور ہم ہوئے تقسیم
 ایک بار اور دل ہوا روئیم
 ہو گئے دور راہبر کیا کیا
 چھین گئے ہم سفر کیا کیا
 یہ فنا نہ ہے پاسبانوں کا
 چنانچہ جو بند نوجوانوں کا
 سرحدوں کی نہ پاسبانی کی
 ہم سے ہی داد لی جوانی کی
 اس زمانے کی کیا کھوڑا درد
 خوفِ مہنگائی جبر و استبداد
 اب کمشنرِ زکوٰۃ دیتے ہیں
 اور بی. وی پ. داد دیتے ہیں
 بمبیک سے ملک بھی چلے ہیں کبھی
 زندہ قوموں کا یہ شر نہیں

دستور

دیپ جس کا مہلات ہی میں چلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو بیکر چلے
وہ جو سائے میں ہر مسکوتے کے چلے

پھول شاخوں پہ کھنے لگے تم کہو
جام زندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے ملنے لگے تم کہو
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں مانتا

میں بھی خالق نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دیا جائے
کیوں ڈراتے ہر زنداں کی یو لائے
ابں گھلے صحبت کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں مانتا

تم نے تو اسے صدیوں ہمارا نکون
اب نہ تم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح کے کہوں
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں مانتا

تم نہیں چارہ گر کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں مانتا



رخصتی کا گیت

جب تو جائے گی گھر اپنے
یاد آئیں گے سندھ اپنے
دھڑکن لگ جائے گی جینے
بیتی برساتوں کی مالا
جس دوگر راتوں کی مالا

سونے کی دنیا میں رہ کر
پیلی پیلی ہو جائے گی
بھیک بھیک سی آنکھوں میں
پل چھن سوسوں لہراتے گی
بیٹھے بیٹھے کھو جائے گی
خاموشی کے صحراؤں میں
اک بلچل سی جمع جائے گی
سہی سہی آشاؤں میں

پڑوں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں
سندر سکھیاں پنگٹ گاؤں
چمن چمن پائل ننگے پاؤں



رخشدہ زویا سے

(۱۰۰ پہلی سطر میں کی کہہ دقات پر)

کہ نہیں سکتی پر کہتی ہے
مجھ سے میری غمی بچی

ابو گھر چل

ابو گھر چل

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا

کیوں زنداں میں رہ جاتا ہوں

کیوں نہیں ساتھ میں اُس کے چلتا

کیسے غمی کو سمجھاؤں

گھر بھی تو زنداں کی طرح ہے

(کثرت کہت ہیں،)



رخصتی

تو کلی نر ہتوں نکبتوں میں پٹی
چھوڑ کر شہر گل سونے صحرا چلی

وہ سلگتا دیا تو سحر کی کرن

سوچتا ہوں یہی کیسے پہلے کامن

دعز کمزوں کو سکوں کیسے بچے گاؤں

لوگ بچے کو کہیں گے نصیبوں جلی

تو کلی نر ہتوں نکبتوں میں پٹی

چھوڑ کر شہر گل سونے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شامِ دگر

اب کہاں کہاں شامِ دگر

شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر

کتنی دیراں ہے آج تیر سی گلی

تو کلی نر ہتوں نکبتوں میں پٹی

چھوڑ کر شہر گل سونے صحرا چلی



روئے بھگت کبیر

لوچہ نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے میاں فقیر
پہنیں سوٹ انگریزی دیں اور کھلائیں میسر
غوصیوں کی مٹھی میں ہے شاعر کی لقتیر
روئے بھگت کبیر

اک دوپے کو جا بل سمجھیں نہ کھٹ جی دان
میرٹو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سامان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مدد
روئے بھگت کبیر

مڑکوں پر بھیسے کچھرتے میں شاعر موسیقار
ایکڑوں کے باپ لیے پھرتے ہیں موٹر کار
بنم بنگرنک آپہنچے ہیں سینڈ پر فقیر
روئے بھگت کبیر

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کر خوب ڈائے دہقانوں کا مال
اور کہے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

جس کو دیکھو لیڈر ہے اور جس سے بلو دکیل
کسی طرح بھرتا ہی نہیں ہے پیٹ ان کا جمیل
مجبورانستا بڑتی ہے ان سب کی تقریر
روئے بھگت کبیر

حلقے میں اتوار منایا
ان کا ہے انداز پرانا

نئی ادائیں نیا زمانا
منٹو کا سننے افسانہ اکثر پہنے نیلے پہنے
گھسے نکلے کار میں بیٹے کار سے نکلے دفتر پہنچے

ناک پر چشمہ سا نکلائے
گردن میں مائی لٹکائے
انگلش لٹریچر کو کھائے
اردو لٹریچر پر ہائے کالج دینے یکچھر پہنچے
گھسے نکلے کار میں بیٹے کار سے نکلے دفتر پہنچے

محفل سے جوا خد کر جتے کھلائے دوپہر
اپنی مسجد کی تفریضیں ہالتی جوتے چوہر
اپنا جھنگ بھلا ہے پیار ہے جہاں ہماری نیر
روئے بھگت کبیر



ریفرینڈم

شہر میں ہو کاعالم تھا

جوں تھا یا ریفرینڈم تھا

قید تھے دیواروں میں لوگ

باہر شور بہت کم تھا

کچھ باریش سے چہرے تھے

اور ایمان کا ماتم تھا

مرخومین شہید ہوئے

چنائی کا چہلم تھا

دن انیس دسمبر کا

بے معنی بے ہنگم تھا

یا وعدہ تھا حاکم کا

یا اخباری کا لم تھا



رنگین

ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے رنگین کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رھزن کا
اسرائیل کی فٹت پہ بھی ہے ہاتھ ہی
بانتا پھرتا ہے جنگی آلات یہی
کھ لٹا ہے اس نے انگوٹھ انگوٹھ کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے رنگین کا

روشنیوں سے لڑنا اس کی عادت ہے
ظلم سے اس کو پیار ہے پیارے نفرت ہے
اس کو کھیل پسند ہے آتش و آہن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے رنگین کا

ہوش کا دامن کب تک چھوٹے رکھو گے
موت کب تک ناطہ جوڑے رکھو گے
آؤ دکھاؤں تم کو رستہ جیون کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رھزن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے رنگین کا



سفید بنیا

قرض لے کر غریب ملکوں کو
چھین لیتا ہے روج آزادی
آج زیرِ عتاب ہے اس کے
ہر بڑا شہر ہر حسیں وادی
مذتوں سر اٹھا کے چل نہ سکا
اس کے کھاتے میں جبرِ کلام آیا
صاف دامن بچا گیا ہم سے
جب بھی مشکل کوئی مفتاح آیا
بحرِ ہند آج تیسری موجیں بھی
اس کی توپوں کے سائے میں ہیں غوش
کوئی طوفان کیوں نہیں اٹھا
کیا ہوا آج تیرا بوجش و فرش

”سرمقتل“ کی ضبطی پر

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اُجالا
بچے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا

مجھے فکرا منِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا



سلام لوگو!

سلام اے دل نگار لوگو
سلام اے اشکبار لوگو

تہی نے اپنا وطن بچایا تہی نے باطل کا سر جھٹکایا
بجھا کے شمعِ حیات اپنی وفا کی راہوں کو جگایا
گر یہ دل روکے کہہ رہے ہو تمہارا نہ رنج لویا
وہی ہے شب کا حصار لوگو

سلام اے اشکبار لوگو

لگوں ک دادی لہو لہو ہے فضا کی آواز چار سُو ہے
میں اس قدر شہ کا میکش ہر ایک لب پر سُو سُو ہے
نشانِ منزل ہے کھویا کھویا لٹا شہر آرزو ہے
بچے بچے ہیں دیار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو!

تمہارے دم سے ہری مینیں خوشی سے دامن ہری مینیں
میں اس کے بادِ مفتیح کی بھگی تمہاری اشکوں سے آئینیں
میں سوچتا ہوں میں کی لڑکے ستم کے آگے جھکی جبینیں
اُٹھا ڈسر سو گوار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو!



سو جا

سو گیا شہر تو بھی اب سو جا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سو جا
سو گئے حنِ مثنوی بتاتی ہے
بانگے والے سب کے سب سو جا



شبِ الم کا سفر

کیا ہے صبر بھر گامِ خونِ قلب و جگر
بھلا سکے گی نہ ہم کو طلب کی راہ گزر
کہاں تمام ہوا ہے شبِ الم کا سفر
ابھی تو دور بہت دوسرے طلوعِ صبح
نہ اپنے لب پہ فغاں ہے نہ اپنی آنکھ ہی تہ
ہم سے درد کی پھر بھی ہے اک جہاں کو غیر
اے بھجانہ سکے گی ہوا ز مرنے کی
جلا چنے ہیں لہو سے جو ہم چیرا غمِ صبح
جگر کا خون ہوا دل بھی ہو گیا چھلنی
مگر ملال نہیں ہے ذرا بھی چپکے پر
ضرور ان کے قدم لیں گی منزلیں اک دن
کہ ایک عسکر اہل جنوں میں محو سفر

دہی ہوتے ہیں سرفراز دہر میں اے دوست
کنا گئے ہیں وہ عشق میں جو اپنے سر
سلام دیں کے جمہودیت پسندوں کو
جو سب کے حق کے لیے لڑے ہیں شامِ آخر

ق

ہیں انقلاب کے ذاکر بہت زمانے میں
حکایتیں نہ سنا عیشِ بغفت گم سے گزر
تقریر اٹھلے جہاں کو بھی دیکھ اے جالب
عمل کی سمت بھی آ شعر و شاعری ہی نہ کر

شکوہ نہ کر

یہاں ہے عشق تو شکوہ نہ کر زمانے کا
بیٹیاں ہوا تو گیا حسن اس فسانے کا
سزا کے طور پر ہم کو بلا نفسِ جالب
بہت تھا شوق ہمیں آتیاں بنانے کا



صبح ہی لکھتے جانا

دینا پڑے کچھ ہی ہر جانا صبح ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا مت ڈر جانا، صبح ہی لکھتے جانا
باہل کی منزل دور نہولے جو نہ کہیں بجے پائیں
دو شمعیں روشن کر جانا صبح ہی لکھتے جانا
پل دوپل کے عیش کی خاطر کیا دنیا کیا محکم
آخر سب کو ہے مرجانا صبح ہی لکھتے جانا

اے شب تار کے جگر گوشہ
اے حسرت دشمنو بستم کو شہ

صبح کا آفتاب چمکے گا
نوٹ جائے گا جہیل کا جادو
پھیل جائے گی ان دلیوں میں
علم و دانش کی روشنی ہر سو

لوح جہاں پر نام تمھارا لکھا ہے گا یونہی
جالت صبح کا دم بھر جانا صبح ہی لکھتے جانا

شہر ظلمات کو ثبات نہیں

اے نظام کہن کے سرزندہ
اے شب تار کے جگر بندہ

اے شب تار کے نگہبانو
شمع عہد زیاں کے پر دانو
شہر ظلمات کے شناخوانو
شہر ظلمات کو ثبات نہیں
اور کچھ دیر صبح پر نہیں لو
اور کچھ دیر کوئی بات نہیں

یہ شب تار جاوداں تو نہیں
یہ شب تار جانے والی ہے
تا بجے تیرگی کے افسانے
صبح نو مسکرانے والی ہے



صحافی سے

نام سے پیشتر لگا کے امیر
ہر سدا کو بنائے کے نقیر
قبر: ایوان میں ہو قیام پذیر
اور خطبوں میں دے عمر کی مثال

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال،
امریت کی ہم نوائی میں
تیرا ہر نبی خدا کی میں
بادشاہوں کی رہنمائی میں،
روز اسلام کا جلوس نکال،

لاکھ ہونٹوں پہ دم صسارا ہو
اور دل صبح کا ستارا ہو
سامنے موت کا نظارہ ہو
لکھ یہی ٹھیکے سرین کا حال

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال



قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال
فکر تیرے دل سے نکال،
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
بے ضمیعی کا اور کیا ہو سکا،

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال
تنگ کر دے غریب پر یہ زمیں
خم ہی رکھ آستانِ زریہ حبیب
عیب کا دور ہے ہنر کا نہیں
آج حُسنِ کمال کو ہے زوال،

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال
کیوں یہاں صبح نو کی بات چلے
کیوں ستم کی سیاہ رات ڈھلے
سب بنا بر ہیں آسمان کے تلے
سب کو رجعت پسند کہہ کر ڈال،

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

طالبہ کے نام

افسوس تمہیں کار کے شیشے کا ہوا ہے
 پڑا نہیں اک ماں کا جودل ٹوٹ گیا ہے
 ہوتا ہے اثرِ تم پہ کہاں تالا غم کا
 درہم جو ہوئی بزمِ طرب اس کا گلا ہے
 فرعون بھی نمود بھی نازے میں جہاں میں
 رہتا ہے یہاں کون یہاں کون رہا ہے
 تم ظلم کہاں تک تو افلاک کرو گے
 یہ بات نہ بھولو کہ ہمارا بھی خدا ہے
 آزادی انسان کے وہیں پھول کھلیں گے
 جس جا پہ طیشِ سر آج ترا خون گرا ہے
 تاجِ ہڈی کی یہ شبِ غم کی سیاہی
 رستہ کوئی سورج کا کہیں روک سکا ہے
 تو آج کا شاعر ہے تو کر میری طرح بات
 جیسے میرے ہونٹوں پہ میرے دل کی صدا ہے

گھیراؤ

صدیوں سے گھیراؤ میں ہم تھے ہمیں بچنے کوئی نہ آیا
 کچھ دن ہم نے گھیراؤ والا ہر ظالم نے شتر چھایا
 پھر ہم نے زنجیریں پہنیں ہر سو پھیلا چپ کا سایا

پھر توڑیں گے ہم زنجیریں ہر لب کو آزاد کرینگے
 جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہر و نا آباد کرینگے
 آخر کب تک چند گھنٹے لوگوں پر سیداد کرینگے



ش. در. نقوی میں مستند ہونے والا ایک صاحبِ جم



صدائق دے

زمیں پہ ہیں کس سہر آسماں ہیں اے دنیا
ہمارا ذکر بھی کر ہم کہاں ہیں اے دنیا

صد امریکہ نہ جا

ایک ہی نوسرہ سب کا ایک ہی سب کی سدا
صد امریکہ نہ جا اے صد امریکہ نہ جا

سورابازوں، سودخواروں سے ہماری دوستی
بکس قدر تو ہیں ہے یہ لفظ پاکستان کی
موت سے بدتر ہے ہم کو بھیک کی یہ زندگی
پاؤں پر اپنے کھڑا ہو وقت ہے پیارے یہی

جائسن کی لب نہ سن اے جان اپنا کر بھلا
صد امریکہ نہ جا اے صد امریکہ نہ جا

تو مسکرائے سدا چین سے رہے آباد
تھے سکوں کے لیے ہی وہاں ہیں اے دنیا

تھے چین کی بہساروں کے ہم محافظ ہیں
ہیں نہ بھول تھے پاساں ہیں اے دنیا

ہے تجھ پہ چھائی ہوئی موت کی خوشگویی
صدائق دے تیرا نام و نشان ہیں اے دنیا



ضابطہ

ہر ایک دشمن جاں کو کہوں میں ہمد و یار
جو کاشتی ہے سحر حق وہ چوم لوں تلوار

خطا و جرم کہوں اپنی بے گناہی کو
سحر کا نور لکھوں رات کی سیاہی کو

جو مٹنے والے ہیں ان کے لیے دوام لکھوں
شبہا پرزید کی اور شہر پر سلام لکھوں

جو دس رہا ہے وطن کو نہ اس کا نام لکھوں
سمجھ سکیں نہ جسے لوگ وہ کلام لکھوں

دروغ گوئی کو سچائی کا پیغام کہوں
جو راہزن ہے اسے رہبرِ عوام کہوں

مرے جنوں کو نہ پہننا سکون گے تم زنجیر
نہ ہو سکے گا کبھی تم سے میرا ذہن اسیر

جو دیکھتا ہوں جوتج ہے کروں گا وہ تحری
مستاع ہر دو جہاں بھی نہیں بہائے ضمیر

نہ دے سکے گی سہارا تمہیں کوئی تدبیر
فنا تمہارا مقتدر بقا مری تقدیر



یہ ضابطہ ہے کہ باطل کو مت کہوں باطل

یہ ضابطہ ہے کہ گجر داب کو کہوں ساہل

یہ ضابطہ ہے بنوں دست و بازوئے قاتل

یہ ضابطہ ہے دھڑکنا بھی چھوڑے یہ دل

یہ ضابطہ ہے کہ غم کو نہ غم کہا جائے

یہ ضابطہ ہے کہ ستم کو کرم کہا جائے

بیاں کروں نہ کبھی اپنے دل کی حالت کو

نہ لاؤں لب پہ کبھی شکوہ و شکایت کو

کمال حسن کہوں عیب کو جہالت کو

کبھی جنگاؤں نہ سوتی ہوئی عدالت کو

یہ ضابطہ ہے حقیقت کو اک فسانہ کہوں

یہ ضابطہ ہے قفس کو بھی آشیانہ کہوں

یہ ضابطہ ہے کہوں دشت کو گلستان زار

خزاں کے روپ کو لکھوں فردغِ حسن بہار

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا

حق جس نے نہیں چھینا حق اُس نے کہاں پلایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا

کُنیا میں تیرا پیچھا غربت نے نہیں چھوڑا
اور محل سرا میں بھی زردار نے دل توڑا
اُف تجھ چڑانے نے کیا کیا نہ ستم ڈھایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا

دیوار کو آتوڑیں، بازار کو آ ڈھائیں
انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پہ نکل آئیں
مجبور کے سر پر ہے شاہی کا بی سایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا

نقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے بیٹے ہنا
تائیدِ ستم گر ہے چپٹ کے ستم ہنا

تو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برس
سانچے میں ہر اک عزم کے چپ چاپ ڈھلی برس
تجھ کو کبھی جھلویا تجھ کو کبھی گزویا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بخویا



علمائے سُوکے نام

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے
نہیں بے یں فرو شو! ہم پہ یہ کوئی نیا فتوے

مگر انسانیت کے سامنے کس کا چلا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

سفینہ اہل زر کا دہ بنے والا ہے شب زار
کوئی فتویٰ بچھا سکتا نہیں جاگیرداروں کو
بہت خوں پی چسکے ہوا پنا بھی انجام اب دیکھو

کہا تم نے کہ جاز ہے منہنگی کی وفاداری
بنایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سگری
لے پر مٹ دیے فتوے رکھی ان کے یاری

تمہاری حیثیت کیا کون ہو تم اور کیا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

دکان کھولو نہی، جادو پرانا ہو چکا فتوے
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے



رہلے ایزدی تم نے کہا دین الہی کو
نہیں مٹنے دیا تم نے نظام کج نکلا ہی کو
دیا تم نے سہارا ہر قدم پر زار شاہی کو

عورتوں کا ترانہ

عبد سزا

جہاں ہیں مجسوس اب بھی ہم چرم سرائیں نہیں رہیں گی
لرتے ہونٹوں پہ اب ہمارے فقط دعائیں نہیں رہیں گی

غضب شدہ حق پہ چیپٹ رہنا ہمارا منشور ہو گیا ہے
اٹھے گا اب شور ہر قسم پر دبی صدائیں نہیں رہیں گی
ہمارے عزیز جواں کے آگے ہمارے نیل رواں کے ہر
پرانے ظالم نہیں ٹکیں گے نئی بلائیں نہیں رہیں گی
ہیں قتل گاہیں یہ عدل گاہیں نہیں بھلا کس طرح لڑتیا
غلام عادل نہیں رہیں گے غلط سزائیں نہیں رہیں گی
بنے ہیں جو خدا مان ملت وہ کرتا کیسیں ہماری عزت
وگر نہ ان کے تنوں پہ بھی یہ بھی قبائیں نہیں رہیں گی



ابھی تو پانی ہے میں نے ربانی رہزن سے
بھٹک نہ جاؤں میں پھر رہنما کی بات نہ کر
بکھا دیا ہے ہوانے ہر اک ذیاد کا دیا
نہ ڈھونڈا اصل کرم کو ذیاد کی بات نہ کر

نزول حبس ہوا ہے فلک سے اے جاہل
گھٹ گھٹا ہی سہی دم گھٹا کی بات نہ کر



فلسطین

غاصبوں کے ساتھیو!

یہ جرمہ جاد بلبے
چھوڑا جاتا ہے تم کو کتنا پیچھے بے حس
اور بزرگم خود بہت ایسا نڈر و بزدل
امن و ایمان سے ہیں بڑھ کر تم کو اپنے تخت آج
غاصبوں کے ساتھیو! او قاتلوں کے دوستو!
یہ سمجھ میں آچکا ہے

امن اور انسانیت کے تم بھی ہوشیار تمام
فتح یا ستر امل میں ہے مرگ کا تم کو پریا
اپنے آقاؤں کے آگے طرح اٹھیں اٹھا
زندگی سے ہے انہی کی بادشاہت کا نظام

تم بھی ہو گھیراؤ میں اب

تم کو بھی ہونا ہے غارت غاصبوں کے ساتھ ساتھ
چاہتے ہو زندگی تو مان لوگوں کی بات
منح ہے جس کا مقدر آؤ اس لشکر میں آؤ
آؤ انسانوں کی جانب مت بڑھیا صفات



روشنیوں کی ماد میں جو دیوار بنے ہو
نہیں رہے گچ
غاصب کو غاصب جو کھل کر نہیں کہہ سکا
نہیں رہے گچ
شاہی ہے صدیوں کی سیاہی چھٹ جائیگی
کت چلے گی درد کی منزل کٹ جائے گی
جو خوشخوار منیروں کے ہمراہ چلے گیا
نہیں رہے گچ

گرتی ہوئی دیوار سے ناطہ توڑو بھی
خوش فہم! اب سامراج کو چھوڑو بھی
وقت کی جو آواز کو لب بھی نہیں سنے سکا
نہیں رہے گچ



کافی ہاؤس

دن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے کچھ دُبلے پتلے نقاد
بحث یہی کرتے رہتے ہیں سست ادب کی بے نیاز
صرف ادب کے غم میں غلطاں چلنے پھرنے سے لاپرواہ
چہروں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے برسوں کے ہمدرد

اردو ادب میں دُحائی ہیں شاعرِ مرید و غالب آدھا جوش
یا ایک آدھ کسی کا مصرعہ یا اقبال کے چند اشعار
یا پھر نظم ہے اک تجھے پر حامد مدنی کا شہکار
کوئی نہیں ہے اچھا شاعر کوئی نہیں افسانہ نگار

مفتو کرشن ندیم اور بی بی ان میں جان تو ہے لیکن
عیب یہ ہے ان کے ہاتھوں میں کندہاں کی تہ تلوار
عالی افسر انشا بابو، ناصر میر کے برخوردار
فیض نے جواب تک لکھا ہے کیا لکھا ہے سب کیا

ان کو ادب کی صحت کا غم مجھ کو ان کی صحت کا
یہ بے چارے دکھ کے مارے جیسے ہیں کہوں بیزار
حسن سے محنتِ عشق سے نفرت اپنی ہی صورتِ پیار
خندہ گل پر ایک تبسم گر یہ سب شبنم سے انکار



قصہ خوانی کے شہیدوں کی نذر

گولیاں تم پہ چلانے والے اب بکثرت ہیں
قصہ خوانی کے شہید و قہر سے ہم شہید نہیں
ہے خزاں کی دسترس میں صحنِ بخش آج بھی
اور کائناتوں سے بھرا ہے اپنا دامن آج بھی
کل بھی تھے جو صاحبِ اقبال چشمِ غیب سے
اُن کی قبرت کے ستارے آج بھی تابندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہید و قہر سے ہم شہید نہیں

سر نہیں تم نے جھکایا اپنا سر کٹوا لیا
بان دے دی اور حیاتِ جاوداں کو پالیا
ہم غلاموں کی بھی کوئی زندگی ہے و ہر میں
نعتش جو چھوٹے ہیں تم نے بس می پائندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہید و قہر سے ہم شہید نہیں



کراچی میں جب جلاہ نے جھپٹے جلّے

نیشنوں کو جلا کر کیا چرساغاں خوب
سنوا رہے ہیں یونہی چہرہ نگاہں خوب
بھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھولِ زخموں کے
مسترقوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب
لہو اچھال کے اھلِ ونا کا راہوں میں
قدمِ قدم پہ کیا پاسِ دلنگاراں خوب
جی ہے چاروں طرف آپ کے کرم کی موسم
نبھے آپ نے الفت کے عہدِ پیاں خوب
ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا یہی
تمام رات رہا جشنِ زہبہ راں خوب



کہنے کی بات

شاعر بھی زنجیر ہے گاٹک بھی آزاد نہیں
ہر دل پر میں خوف کے سائے کون ہے ہانڈا نہیں
اُدھ پنج کی گرد نہ بننے دو سوچوں کے دامن پر
یہی کہہ سکتا ہم نے یارو اور ہمیں کچھ نہیں
جو کہنے کی بات تھی کہہ کر دارو رسن تک آئے ہیں
ہر نون پر ہے گیتِ وفا کا آہ نہیں فریاد نہیں

لاکھ دھڑکتا ہو پہلو میں تیسری کہلائے گا
انسانوں کے درد سے جو دل لے جالت آباد نہیں



کوٹ لکھت جیل

ملک ہیرا رُوف آسان مہدی چودھری اصر
یہ ساتھی ہوں تو رہ سکتا ہے انسان عمر بھر قیدی

قصوری قید آسم قید خورشید و عمر قیدی
مری جاں اس خراب آباد میں ہے ہر بشر قیدی

یہ ابھریں گے یہ چکیں گے یہ کلمت کو مٹا دیں گے
زیادہ دیر رہ سکتے نہیں شخص و قمر قیدی

سلاخوں میں اُدھر ہے طاہرہ اور اس طرف منظر
بنارکھا ہے اک بیدا گرنے گھر کا گھر قیدی

ہمارے ساتھ بڑا اللہ بھی ہیں اور اک بچہ بھی
رہے ہیں چکے کیا کیا اہل دل اہل نظر قیدی

حیدر اختر بھی ہے رحمن بھی ہے اور مفل بھی ہے
مقدّر سے ملے ہیں واہ کیا کیا دیدہ و رقیدی

دلِ یقوت استعلا تاجِ ادین اور عابد
یہ کر لیتے ہیں دل بس میں بڑے ہیں جاو و گزیدی

جہالت پھر رہی ہے شہر میں آزاد و آوارہ
رضا کاظم، بیشر راؤ منت اور ظفر قیدی

بہت کیسا ب ہیں فیاض سے انسان دنیا میں
شاخو اں ان کا زنداں میں ہے میری جان ہر قیدی

علی سا خوب رو نکار بھی قید نفس میں ہے
بہت مسرور ہوتے ہیں اسے سب دیکھ کر قیدی

کہاں ملتے ہیں صبح و شام زندانوں میں لے ہدم
رشید و صدق و مشتاق ایسے باختر قیدی

شیبہ ہاشمی زندان میں پہلی بار آیا ہے
وطن میں رہ چکا ہے مڈنوں اس کا شریقی

یہ سب ردِ حق ہے پاہٹ ہی کے دمے کوٹ لکھت میں
نہ ہو یہ تو نکل جائیں سلاخیں تو ڈکر قیدی

میں آیا ہوں تو اپنے ساتھ نور گر بھی لایا ہوں
مری صورت ہے اس زنداں میں میرا پلٹ قیدی

میدان ملک اور ملک سید جن سے مار دغا دینے

لگا ہے کوٹ کھپت جلی میں یہ سدا چراغاں کا
کہاں ہے قید نہاں! ادھر قیدی ادھر قیدی

نیکہ ارشاد فرمایا نہ کوئی راہ دہسلائی
ادھر ٹوٹی جی سر پر ہونے ہیں ہم ادھر قیدی

وہ آیا ہے کے ہڈوں پہ ہنسی خان لے حیدہ آیا
وہ آیا میرے پچھڑے دیں کا نورِ نعلہ قیدی

میں امواج و امصرِ خاں کا بس اتنا ساز ہے
پڑا ہے کوئی زنداں میں تو کوئی اپنے گھر قیدی

حضرت ڈاکٹر بنگش کی تھی لودہ بھی آپہنچا
کرے گا دیکھ بجاں اب قیدیوں کی ڈاکٹر قیدی

اٹھا لاکھ دیواریں مقابل مہرتاں - کے
ستر گر ہو بھی سکتی ہے کبھی شب کی سحر قیدی

بڑا انسان ہے اپنے وقت کا یہ بھی قلندر ہے
قفس میں میرا رہا ہے جو منہ اٹائے اپنا سر قیدی

یہ قیصرِ مٹلے اسرار یہ انور رشید اپنے
سلاخوں میں پڑے ہیں دیکھ کر کیا کی شہرِ قیدی

میں دیکھوں تو کسے دیکھوں میں رُودن تو کسے رُودن
میرے قلب و نظر قیدی سرے جان و جگر قیدی

میں قیصرِ غلامت، محمود، منسو، امتیاز احسن
یہ قیدی ہیں کسے اک علم و دانش کا جگر قیدی

بیٹر و جائد و محمود میں یکسرے ہوئے موتی
کوئی قیدی کہہ رہے ادبے کوئی کہہ رہے قیدی

کسی کی کچھ خبر ملتی نہیں ہے اس زمانے میں
نجانے اور کتنے ہیں جہانے ہم سفر قیدی

یہ قائم اور قاضی حئی تو قیدی پرانے تھے
بنے ہیں خواجہ خیر الدین دھاکہ چھوڑ کر قیدی

ہیں نرساں کوئی ان کا پڑے ہیں جلی غلاؤں ہیں
ہوا کرتے تھے ہم سے لوگ جن کے علم پر قیدی

ملک قاسم بھی امصرِ خان ہیں ہیں ملک کے دشمن
میں ہیں ہم یک ہیں خیر الدین بھی ہیں اہلِ شہرِ قیدی

نہ یہ زنداں رہیں باقی نہ یہ ظلم و ستم جالب
اکٹھے ہو کے دھاوا بول دیں سائے اگر قیدی



ایشیہ نظر میں امجد و احمد، حامد محمود و رحیم
تھے اشارہ قلابزادہ نعرائے خاں کی طرف ہے

دل کی کچھ پروا نہیں زخمِ بکھر کا غم نہیں
 غم اگر ہے تو وطن کا، ہم کو گھر کا غم نہیں
 اس جہادِ زندگی میں ہم تو سمجھے ہی یہی
 وہ بشر ہی کیا جسے نوحِ بشر کا غم نہیں



گستاخِ عشق پہ کیونکر نہ ہو یہ دلِ نازاں
 لگا رہا ہے کنارے ہمیں یہی طوفاں
 اب اور جس کے کہیں اپنا سر کھپا ناصح
 یہی نا کو چہ محبوب میں ہے جاں کا زیاں



گوشے میں قفس کے...

بہت سے دکھ سہے ہیں اور سہہ جا
 یہ فستِ پھر کہاں، کچھ شکر کہہ جا
 وفا کی راہ میں خود کو مٹا کے
 زمانے کو ہمیشہ یاد رہ جا
 بہت مشکل مری پہچان ہو گی
 بدل ڈالوں اگر میں اپنا ہوجا

قاتل سے کہاں جاں چھوٹی ہے
بر دل پہ تھمتا ٹوٹی ہے
خونخوار عدو نے ٹوٹی ہے

بچوں کی جہاں مسکان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یاسر کے بہادر جیساں پر
علمت کے مٹانے والوں پر
خورشید سحر کے اُجاں پر

ہونے کے لیے قربان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

دم اہل جنوں کا بسم نے کو
جہاں حق پہ پنچھاہ کرنے کو
رستے میں وفا کے مرنے کو

انساں کی بڑھانے شان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یہ جنگ ہے امن عالم کی
یہ جنگ ہے ہر اہل عزم کی
یہ جنگ ہے نسل آدم کی

سرے کے سر میدان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو



لبنان چلو لبنان چلو

شیطان جہاں ہے برق نشان
انسان جہاں ہے نوح کُناں
خطرے میں جہاں ہے امن جہاں

کہتا ہے، میں ایمان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو
کشتی کو بچانے طوقاں سے
انساں کو چھڑانے شیطان سے
یگن کو بھگانے میداں سے

کہتا ہے یہ دل ہر آن چلو
لبنان چلو، لبنان چلو
اے اہل عرب اے اہل عجم
کرنا ہے تمہارے کاسرجم
غاصب کو مٹا کر لینا ہے دم

پیادو جو کریک جان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

ماہنامہ شہر کراچی

ہم دم مرے پیارے انفل

صورتِ حال سے دل ہے بے کل

تیری ٹکیوں پہ لگی ہیں نظریں

اور ترے شہر کا غم ہے ہر پل

درد دیوار ہیں سہمے سہمے

چہرہ زیست ہے ادھیل ادھیل

بادِ دباراں بھی ہے زخمی زخمی

اشک آلود ہے آغیل آغیل

کوئی منظر نہیں اچھا لگتا

دل جلاتے ہیں گذرتے بادل

ہم نے شاداب فضا لگی تھی !

اور ملی رنج و الم کی دلدل

قاتل امن دسکوں چین سے ہے

اپنے سینے میں مچی ہے ہلچل

آج اندازہ نہیں ہے ہم کو

آفتیں ڈھائے گی ہم پر کیسا

ہم پہ چڑھ دوڑیں گے حیلے بلوان

مانڈ پڑ جائیں گے اپنے کسبِ

بیٹھ جائیں گے دُک کر سائے

یوں نکل جائے گا اپنا ہر بل

ٹپک اذنان پہ چھا جائیں گے

اور کہیں گے ہمیں پاگل پاگل

✽ اکتوبر ۱۹۸۷ء ✽

لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر

ہم اور اپنوں کے کیا پاس چھوڑ آئے ہیں
یہی کہ دہشت و افلاس چھوڑ آئے ہیں
ہماری قید سے لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر
یہی حسین ساحس چھوڑ آئے ہیں

کسی بھی شام نہ آئے گی مے کی یاد ہمیں
دیرِ قفس سے اُدھر پکایس چھوڑ آئے ہیں

ہمارے ذکر سے حسالی نہ ہوگی بزم کوئی
ہم اپنے ذہن کی وہ باس چھوڑ آئے ہیں

چلے تھے جب تو نہ تھارنگ مایس چپڑوں پر
دلوں میں ایک عجب آس چھوڑ آئے ہیں



اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

دیکھئے کو تو ہزاروں ہیں مگر کتنے صبیح
ظلم کے آگے کبھی سر نہ جھکانے والے

مر کے بھی مرنے ہیں کب مادرِ ملت کی طرح
شعشع تاریک فضاؤں میں جھلانے والے



مادرِ مِلّت

راہ میں لاکھ صداقت کے مخالف آئے
قوم نے سُن ہی لیا مادرِ مِلّت کا پیام

ماں کے قدموں ہی میں جیت اُدھر آجاؤ
ایکے لوثِ محبت ہے ادھر آجاؤ
وہ پھر آئی ہیں ہمیں ملک دلانے کے لئے
ان کی یہ ہم پر عنایت ہے ادھر آجاؤ

اُس طرف ظلم ہے بیدار ہے حق تنہی ہے
اس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر آجاؤ



جس نے آواز سے ایوان لرزائے
لوگ جاگے ہیں تو سلطان لرزائے

اُجڑا صبح بہاراں کی خستہ ہے
ظلمت شب کے نگہبان لرزائے

دیکھ کے لہر مرے دیں میں نراوی کی
قصرِ افرتنگ کے دربان لرزائے

مشعلیں لے کے نکل آئے ہیں مظلوم
غم و اندہ میں ڈوبی ہے محلات کی شام

یاس کا دور گیا خوف کی زنجیر کٹی
آج سہمے جوے لوگوں کو ملاؤں کلام

مادریلت کی پہلی برسی پر

بھاکہ وارو رسن میں صلہ صداقت کا
نڑوک کے گم گماتا فلہ صداقت کا
ذختم ہوگا کسی سلسلہ صداقت کا
کہ آگ میں بھی گشتاں کھلا صداقت کا
ہوئی شکست نہ ہوگی کسی اصولوں کو
بعت بائی ہے صدا امن کے رسولوں کو

وطن کے حساب کا اعلیٰ ہیں دس کروڑ انسان
یہ کہہ کے بخش دئی اس نے تحویشوں کو زبان
دل و نگاہ میں عزم و عمل کا تھا غولان
علم ایشیا نے نکل آئے روزانہ

ادھر
کئی ہنسے ۔۔۔ یسوں ضرور زنجیریں

ہلوں کے مالکو اے افسر و زمیندارو
ہمساری راہ ترقی میں کالی دیوارو
کوٹے ہم پر ستم کب تک ستم غارو
ہو چند روز ہی تم یہ ستم و زور کے پیارو
نشان بزدلی کا باقی ہے اور نہ زور کا ہے
یہ دور ا مسل میں انسان کے ذنار کا ہے

غلام ہم کو بنائے رہو گے تم کب تک
ہمارے سر کو جھکائے رہو گے تم کب تک
ہمارے حق کو دباؤں رہو گے تم کب تک
وطن کو شولی چھلکائے رہو گے تم کب تک
انہ جیسرا ظلم و ستم کا مثالی جھڑپیں گے
چراغ مادریلت جلا کے چھوڑیں گے



ہے آج سارے وطن کی زبان یہ نام اُس کا
وہ مرگیا ہے مگر زندہ ہے پیام اُس کا
یو بھی رہے گا ہر اک دل میں احترام اُس کا
بلند رکھیں گے پرچم سدا عوام اُس کا
نشان تہساراد ہوگا ذرا سرد تو کسبھی
غلام جہاں سے نیچے قدم دھرو تو بھی

وہ نقشب قشاہ اعظم اُٹھارنے آئی
وہ رنگ روئے گلستاں کھانے آئی
مقدور اہل وطن کا سفارنے آئی
وہ اپنی جہان غریبوں پہ وارنے آئی
نہے دجاہ و زرد مال کی ضرورت تھی
فقط عوام کے اقتبال کی ضرورت تھی

اُٹھی عوام کو حصہ کام پر چڑھاتی ہوئی
ہر اک نگاہ میں شیعیتیں جلاتی ہوئی
غزور کج کلساں خاک میں ملاتی ہوئی
پیام سب کو مسادات کا سناتی ہوئی
تھا اُس کا اندو کہ ہے ذات سے وطن سے
صدا یہ گونج اُٹھی آسروں کے دل دہلے

ماں

بچوں پہ چسلی گولی یہ دل کے مرے ٹکڑے
 ماں دیکھ کے یہ بولی یوں روئیں مرے ہوتے
 یہ دل کے مرے ٹکڑے میں دُور کھڑی دیکھوں
 یوں روئیں مرے ہوتے یہ مجھ سے نہیں ہوگا
 میں دُور کھڑی دیکھوں میدان میں نیکل آئی
 یہ مجھ سے نہیں ہوگا اک برق سی لہرائی
 میں دُور کھڑی دیکھوں ہر دستِ بستم کانپا
 اور اپنا بستم کھیلیں صندوق بھی تھرائی
 خوں سے مرے بچوں کے ہر سمت صدا گونجی
 دن رات یہاں ہولی میں آتی ہوں میں آئی
 بچوں پہ چسلی گولی میں آتی ہوں میں آئی
 ماں دیکھ کے یہ بولی ہر ظلم ہوا باطل
 اور سہم گئے قاتل
 بچوں پہ چسلی گولی



متاعِ غیر

آخر کار یہ ساعت بھی قریب آ پہنچی
 تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
 کل تلک میرا مقدر ستمی تری لف کی شام
 کیا تغیش ہے کہ تو غیبر کی کہلائے گی
 میرے غم خستے میں تو اب کبھی آئیگی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی باں
 میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
 کچھ جو سمجھا بھی تو اس مین خوشی کے ہنگام
 تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
 تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا
 میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہیں
 رہنِ عنم وقف الم سادہ دلوں کی آنکھیں
 یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
 ہم نے دیکھیں یونہی غم سادہ دلوں کی آنکھیں
 اور دلیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں *

مرثیہ خاک نشیناں

جو اد جسڑی میں مارا گیا بس وہ مر گیا
خاک تھا اور خاک کی صورت بکھر گیا

منشائے یزدی کے مطابق گزر گیا
ہر بے گنہ کا خون مقدس کے سر گیا
کاذب کے واسطے ہے ہر اک روز روبرو
کیا کیا نہ اہل صدق کی مٹی ہوئی پلید
نیچے سُشنید ان کو نہ اوپر ہی کچھ سُشنید

جو مر رہے ہیں سندھ میں ہرگز نہیں شہید
چنگیز خاں شہید ہلاکو شہید ہے
ایا جو اس زمین پہ ڈاکو شہید ہے
جو اس بنگر میں کر کے مراکو شہید ہے

کیئے یہی یعتین سے شیطان عظیم ہے
جو بھی ہے اس کے تابعِ فرماں عظیم ہے
یہ ایک دایمہ ہے کہ انساں عظیم ہے



مستقبل

تیسرے یے میں کیا کیا صدمہ سہتا ہوں
 سنگینوں کے راج میں بھی پیچ کہتا ہوں
 میری راہ میں مصلحتوں کے پھیل بھی ہیں
 تیری خاطر کانٹے چنستا رہتا ہوں
 تو آئے گا۔ اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
 دیکھ اے مستقبل

اک اک کر کے سارے ساکتی چھوڑ گئے
 مجھ سے میسر رہبر بھی منہ موڑ گئے
 سوچتا ہوں بے کار گلہ ہے غیروں کا
 اپنے ہی جب پیار کا نانا توڑ گئے
 تیسرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے
 دیکھ اے مستقبل

جہل کے آگے سر جھکایا میں نے کبھی
 سفلوں کو اپنا نہ بنایا میں نے کبھی
 دولت اور عہدوں کے بل پر جوائے نہیں
 ان لوگوں کو منہ نہ لگایا میں نے کبھی
 میں نے چور کہا چوروں کو کھل کے نہ محض
 دیکھ اے مستقبل



مشاعر

اپنے حق میں برائی نہ مانگو
موت مانگو رھائی نہ مانگو

ہم ہیں جن کے سبب کا نشانہ
موت کہو ان سے غم کا نشانہ

پھر کہاں جھگھٹا یہ میسر
بن گیا ہے نفس آشیانہ

اب نفس سے جدائی نہ مانگو
موت مانگو رھائی نہ مانگو

رات سے روشنی مانگنا کیا
موت سے زندگی مانگنا کیا

ظلم کی ظلمتوں سے مری جاں
جوت انصاف کی مانگنا کیا

عصابوں سے بھلائی نہ مانگو
موت مانگو رھائی نہ مانگو



ایک جو پکس سے گزری ہے خاک رانی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے
حضور آپ ہی جالت ہیں آپ کی خاطر
تہاں شہر ہیں دیوانہ وار گھومے ہیں
کسی طرح سے کہیں آپ کا سراغ ملے
حضور ہم نے بچوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک رانی ہوئی
مشاعر ہیں اسی کا یہ گویا تھا میں



مشرط رھائی

دوستو جاگ ہنسانی نہ مانگو
موت مانگو رھائی نہ مانگو

عمر بھر سر جھکائے پھر وگے
سب سے نظریں بچائے پھر وگے

بل رھا ہے جو بارندامت
دل پہ کیے اسٹائے پھر وگے

مشیر

میں نے اُس سے یہ کہا

یہ جو دس کروڑ ہیں

جہل کا پنجر ہیں

ان کی فکر سو گئی

ہر امید کی کرن

ظلمتوں میں کھو گئی

یہ خبر درست ہے

ان کی موت ہو گئی

بے شعور لوگ ہیں

زندگی کا روگ ہیں

اور تیرے پاس ہے

ان کے درد کی دوا

میں نے اُس سے یہ کہا

تو خدا کا نور ہے

عقل ہے شعور ہے

تو تیرے ساتھ ہے

تیرے ہی وجود سے

ملک کی نجات ہے

تو ہے مہر صبح نو

تیرے بعد رات ہے

بولتے جو چند میں

سب یہ شہر پسند میں

ان کی کہیں لے زباں

ان کا گھونٹ دے گلا

میں نے اس سے یہ کہا

جن کو تنہا زباں پہ ناز

چپ ہیں وہ زباں دراز

چین ہے سماج میں

بے مثال فسق ہے

کل میں اور آج میں

اپنے حسن و جہ پر ہیں قید

لوگ تیرے راج میں	پڑھ کے ان کو ہر کوئی
آدمی ہے وہ بڑا	کہہ رہا ہے مرجب
دور پہ جو رہے پڑا	میں نے اس سے یہ کہا
جو چہناہ مانگ لے	چین اپنا یا ہے
اُس کی بخشش بے خطا	اس پہ جساں شاہ ہے
میں نے اس سے یہ کہا	پر وہاں ہے جو نظام
ہر دوزیر ہر سفیر	اس طرف نہ جاتا تو
بے نظیر ہے میٹر	اس کو دور سے سلام
واہ کیا جواب ہے	دس کروڑ یہ گدبے
تیرے ذہن کی قسم	جن کا نام ہے عوام
خوب انتخاب ہے	کیا نہیں گئے حکمراں
جانتی ہے انگری	تو یقیناً ہے یہ عجمان
قوم محراب ہے	اپنی تو دعائے یہ
یہ ترا دوزیر حناں	صد تو رہے سدا
وہ رہا ہے جریباں	میں نے اُس سے یہ کہا



ملاقات

جو ہونہ سکی بات وہ چہروں سے عیاں تھی
حالات کا ماتم تھا ملاقات کبہاں تھی

اس نے نہ ٹھہرنے دیا پہروں مے دل کو
جو تیری نگاہوں میں شکایت مری جاں تھی

گھر میں بھی کبہاں چین سے سئے تھے کبھی ہم
جرات ہے زنداں میں وہی رات وہاں تھی

یکساں ہیں مری جان نفس اور نشیمن
انسان کی توقیر یہاں ہے وہاں تھی

سشاہوں سے جو کچھ رلے نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا کچھ اپنی ہاں تھی

صیبا دے یونہی تو نفس میں نہیں والا
مشہور نگلستاں میں بہت میری فغاں تھی

تو ایک حقیقت ہے مری جاں مری ہمد
جو تھی مری غزلوں میں وہ اک ہم گماں تھی

محسوس کیا میں نے تیرے غم سے غم دہر

ورنہ مرے اشعار میں یہ بات کبہاں تھی

ممتاز

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا، لاڑکانے چلو
ورنہ تمہانے چلو

اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو، گیت گانے چلو
ورنہ تمہانے چلو

منتظر ہیں تمہارے شکاری وہاں، کیف کا ہے سماں
اپنے جلووں سے محل سجانے چلو، مسکرانے چلو
ورنہ تمہانے چلو

حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو، ذہن پر چھائی ہو
جسم کی نوے شمعیں بجلائے چلو، غم بجلائے چلو
ورنہ تمہانے چلو



منشور

دے دیا سامراج نے منشور

رہیو بس اقتدا دیات سے دور

بات پیمپلی بڑھائیو آگے

دائرے سے نہ جائیو آگے



مولانا

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تعریف مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا
خدا را شکر کی تلقین اپنے پاس ہی تھیں
یہ لگتی ہے مرے سینے پہ بن کر تیر مولانا
نہیں میں بول سکتا جھوٹ اس درجہ ذہنائی سے
یہی ہے جرم میسر اور یہی حقصیر مولانا
حقیقت کیا ہے یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سنا ہے جہنم کا رزق آپ کا ہے پسیر مولانا
زمینیں ہوں و ذریعوں کی مشینیں ہوں شیریں کی
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تھیں تحسیر مولانا
کر دوں کیوں نہیں بل کر فلسطین کے لیے لڑتے
دعا ہی سے فقط کشتی نہیں زنجبیر مولانا

✽

میری بچی

میری بچی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا
تیرے نچے سے دل کو دکھوں نے
میں نے مانا کہ ہے آج گھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا



ناداں نہیں ہیں یار

جن کو جہاں کا غم ہے وہ مٹے چڑیں
ورنہ تمام اپنی ترقی پسند ہیں
دشتِ وفا میں ساتھ ہمارے وہ کیوں طیر
ناداں نہیں ہیں یار بڑے ہوشمند ہیں

نذر شہداء

بنائے ہیں سلطٰں فسرنگی کے دریاں
بہت خوب کی فتدیر خونِ شہیدان
روحِ حق میں جاں اپنی جس کے مری جاں
بہت کر گئے ہمنزلوں کو وہ آساں
مناتے ہیں چھپ چھپ کے ہم ان کی یادیں
جو باطل شکن تھے جو تھے مرد میدان
رُخِ زندگی پر جو کچھ زندگی ہے
انہی کا کرم ہے انہی کا ہے احساں
وہ آزاد یوں کے تھے خورشیدِ جاہل
انہی کے لبوں سے کھیلے ہیں گلستاں



نام کیا لوں

ایک عورت جو میرے بیٹے نہ توں
شمع کی طرح آنسو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے من موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو معتد بنائے ہوئے
مسکراتی رہی

اس کے غم کی کبھی میں نے پڑا نہ کی
اس نے ہر حال میں نامِ مہیا لیا
چھین کر اس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پر ابنا سر رکھ دیا
تو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مجھ پہ احساں کیا



نہنخی جاسوجا

جب دیکھو تو پاس کھڑی ہے نہنخی جاسوجا
تجھے بلاتی ہے سپنوں کی نگری جاسوجا
غصے سے کیوں گھوڑی ہے میں آجاؤں گا
کہہ جو دیا ہے تیرے لئے اک گزیا لاؤں گا
گنتی نہ ضد کرنے کی عادت تیری جاسوجا

نہنخی جاسوجا

ان کالے درازوں سے مت لگ کر دیکھ مجھے
اُڑ جاتی ہے نیند آنکھوں سے پا کر کپس تجھے
مجھ کو بھی سونے سے میری پیاری جاسوجا

نہنخی جاسوجا

کیوں اپنوں اور بیگانوں کے شکوے کرتی ہے
کیوں آنکھوں میں آنسو لاکر آئیں بھرتی ہے
رونے سے کب رات گنتی ہے دکھ کی جاسوجا

نہنخی جاسوجا



نہنخی لڑکی

ڈرتے ہیں بند قوں دل لے ایک نہنخی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اُجالے ایک نہنخی لڑکی سے

دُسمے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں
مُلا، تاجر، جنرل جیلے، ایک نہنخی لڑکی سے

اُڑا دی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ ملے یہ کہتے ہیں
لے حیرت، ظالم، دل کے کالے ایک نہنخی لڑکی سے

دیکھ کے اس صورت کو جالب ساری دنیا نہنخی ہے
بلوانوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہنخی لڑکی سے



نیلو

لو کہ نادان قف آداب شہنشاہی بتی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرات جو ہوئی تو کیونکر
سایہ شاہ میں اس طرح جیا جلتا ہے

وطن کو کچھ نہیں خطرہ

وطن کو کچھ نہیں خطرہ نظام زر ہے خطرے میں
حقیقت میں جو رہزن بنے وہی ہرے خطرے میں
جو بیٹھا ہے صف ماتم بچائے مرگِ فطمت پر
وہ نور گرے خطرے میں وہ دانستہ ہے خطرے میں
اگر تشریف لاف ہے تو سلطانوں کو لاف ہے
نہ تیرا گھسے خطرے میں نہ میرا گھسے خطرے میں
جہاں اقبال بھی نذر خط تیغ ہو جالت
وہاں تجھ کو شکایت ہے ترا جو ہرے خطرے میں



اہل ثروت کی یہ تجویز ہے سرکشِ رز کی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے پھنایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پائل خاموش
پھر نہ تازیت تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظر جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوت شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبت ہوگی
سراٹھلنے کا رعایا کو نہ آنے کا خیال

طبع شانمانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انھیں زہر سمجھا جاوے دیا جاتا ہے
لو کہ نادان قف آداب شہنشاہی بتی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے



نہیں بدلتے ہم

ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈرتے تھا منا نہیں بدلتے ہم
ہزار زیرِ قدم راستہ ہو خاروں کا
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم
اسی لئے تو ہمیں مستبر زمانے میں
کہ رنگِ صورت دنیا نہیں بدلتے ہم
خیال میں دبی ہوتے ہیں بامِ دوردہی لوگ
یہی تو حُسن ہے اپنا نہیں بدلتے ہم
ہوا کو دیکھ کے جالبِ مثالِ ہمعصران
بجایہ زعسم ہمارا نہیں بدلتے ہم



نئی پود

ریتوراں میں بخیو اور کانٹے سے کھانا کھاؤ
الجھے الجھے شعرِ کبو ذہنوں کو خوب الجھاؤ
میر کے مصحفے آگے رکھ کر غزلیں کہتے جاؤ
خود کو پورا میر کو آدھا ہی شاعر بتلاؤ
اور پھر نئی پود کھلاؤ

ٹیل پر جو بات کرو بس لکھتے جاؤ یار
اور پھر اس کو ماہِ نو کے ماتھے پر دے مار
سب تم کو فن کار کہیں تم رُپ کچھ ایسا دھاؤ
مکتب کے دکانوں کو اپنی نظائیں یاد کراؤ
اور پھر نئی پود کھلاؤ



ولی خاں

سرے کارواں میں شامل کوئی کم نظر نہیں ہے
جو نہ بٹ کے وطن پر سراہ سفر نہیں ہے
درغیر پر ہمیشہ تمہیں سر جھکاے دیکھا
کوئی ایسا داغِ سجدہ مرے نام پر نہیں ہے
کسی سنگدل کے در پر سرا سر نہ جھکے گا
سرا سر نہیں رہے گا مجھے اس کا ڈر نہیں ہے



وہ ہو گئے وزیر

وہ ہو گئے وزیر شبِ غم گزر گئی
غزبت زدہ عوام کی ہمت سنو رگئی
اب اُن کی گفتگو میں تحمل کی لہر ہے
جالبِ اب اُن کے جوش کی ندی تڑ گئی



ہتھکڑی

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی بکتی طاقت مجھے

کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا
*

ہم دیکھتے ہیں

جنہیں ہم شعر میں کہتے ہیں جہاد
اُن آنکھوں کو یہاں ہم دیکھتے ہیں
لبوں پر آہ اور زلفیں پریشان
عینوں کو وقفہ ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ستم دیکھتے ہیں



یو ری گم گرین

موت کے بیاباں سے زندگی گزر آئی
ظلمتوں کے صحرا میں روشنی نظر آئی

آدمی کی راہوں میں گرد دیں مہ وახشم
مادرائے امکاں سے ہم کو خیر آئی

صبح و شام لرزاں تھے سامنے نگاہوں کے
اہل دل کی منزل میں وہ بھی پہ گزر آئی

جب کے دکھ زلزلے کے ہمسفر بنائے ہیں
چھب مرے خیالوں کی اور بھی بکھر آئی



وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو۔
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلوں پر دیئے بھی
نہ چکا پھر بھی قسمت کا ستارا
وہی ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر منسلط ہے شب غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اک کرن بھی
مہ و خورشید گننائے ہوئے ہیں
یکس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمہیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رہتی
کلی کی آنکھ ہم، روتی ہے شبہم
سکھتے ہیں گلوں کے تن رنہیو
نظر آتے ہیں گلشن بن رنہیو

۱۶ جون ۱۹۸۵ کو لاہور میں

عینوں کی اعادی انجمن کے شاعر
میں پڑھی گئی۔

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی
اٹھائے ہاتھوں میں اپنے حُنیثِ عالم
ادیبِ شاعر و دانشور، سخن دانو
کر و حکایت بیروت خونِ دل سے رنم
شکستِ جہل کو جوگی شعور جیسے گا
کرے گا جہل کہاں تک سرِ شعورِ مسلم
چسلی ہے وہ ہوائے زہر آگس
کو بچھ کر رو گئی ہے شمعِ تمسکین
دُعا گو این عالم کو خبر کیا
کس عالم میں ہیں اہل فلسطین
ہوا بنان میں وہ حشر بر پا
ز میں خونِ شبہیدان سے بے گئی

ابھی کے دم سے ہیں ساری امارتیں ہمد
یہ مانگتے ہیں دعائیں برائے اسرائیل
کہ اسرائیل سے ہیں بادشاہیتِ قائم
عرض انھیں تو فقط اپنے تخت و تاج سے ہے
انھیں شبہید فلسطینیوں کا کیوں ہو عزم

گماشتے ہیں یہ سب سراج کے یارو
عدو کے ساتھ ہی کرنا ہے انکا بھی سرِ حرم

فلک پر بے سمبر کرگسوں کا
مگر منفعتِ رزیر پر ہیں شاہیں
با اندازِ دگر دشمن ہیں یہ بھی
امیدیں کب شیوخ و شاہ سے تھیں
بہادری جنگِ آخر کیوں لڑیں وہ
عسزیز از دیں جنھیں ہیں قہرِ نزیں



شیوخ و شاہ کو سمجھ نہ پاسبانِ حرم
یہ بندِ گمانِ زرد و سیم ہیں خدا کی قسم
شیوخ و شاہ تو ہیں تجر و شرکِ ظلم و رستم
شیوخ و شاہ سے رکھو نہ کچھ اُمیدِ کرم
امیر کیے نہ دانشگن کے ساتھ رہیں

یوم آزادی صحافت پر

داستانِ عجم کی ہم کو ازبے
خونِ مہمدا تمہارے ہی سے
پھرے کبرام آج گھس گھسے
پھر وطن کی فضا مکند ہے
ہر تباہی میں ہے تمہارا ہاتھ
تم نے پیدا کیے ہیں یہ حالات
خوب و بے نہلے ہیں تم نے
شہرِ مقتل بنائے ہیں تم نے
ہم کو یہ دن دکھائے ہیں تم نے
جھونچکڑی بلائے ہیں تم نے
کون سا قصہ تم نے ڈھایا ہے
بے کسوں ہی کا خون بہایا ہے
عزتِ نفس کے ہر دم و تاس
لگائیاں دیتے ہو سرِ محفل
ہے تمہارا مشیر ہر جاہل
تم سے امیدِ خیر لا جاہل
بے ضمیر ہی جسے گوارا ہو
بس وہی ہم سفر تمہارا ہو

ضبط کرتے ہو روز تم اخبار
یہ ہے آزادی لبِ اظہار
مجلسِ واپل دانش و زور
آج ہیں تم سے سب کے سب بڑا
وج نہ بولا نہ بول سکتے ہو
جانے کیا کیا جنوں میں کہتے ہو
تالیاں قہقہے کرو معتبر
کوئی کچھ بھی کہے کرو معتبر
ملک کشتار ہے کرو معتبر
خون بہتا ہے کرو معتبر
سب میں خوشحال ہاتھ اٹھواؤ
یوں تماشا جہاں کو دکھاؤ
دل تمہارے ہیں نفرتوں سے بچے
کون اب تم پر اعتبار کرے
جو بھی تم سے ملائے ہاتھ نہ لے
مر گئے اچھے لوگ تم نے مرے
قاتل اب خدا سے کچھ تو زور
باقی ماندہ وطن پر جسم کرو



یومِ مئی

صد آرزوی ہے مرے دل سے پیہم
 کہ ہوگا ہر اک خوشمن جاں کا سر خم
 نہیں ہے نظامِ ہلاکت میں کچھ دم
 ضرورت ہے انسان کی امنِ عالم
 فضاؤں میں لہرائے گا سُرخِ چہسم
 صد آرزوی ہے مرے دل سے پیہم
 نہ ذلت کے سائے میں بچے ملیں گے
 نہ ہاتھ اپنے قسمت کے ہاتھوں ملیں گے
 مساوات کے دیپ گھر گھر جلیں گے
 سب اہلِ وطن سر اٹھا کر چلیں گے
 نہ ہوگی کبھی زندگی وقفِ ماتم
 فضاؤں میں لہرائے گا سُرخِ چہسم



یومِ اقبال پر

لوگ اُٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو جگانے
 سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے
 کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خدا نے
 فرسودہ بہانے وہی افسانے پُرانے
 اے شاعرِ مشرق! یہی بھوٹے یہی بذات
 پیٹتے ہیں لہوِ بسندۂ مزدور کا دِنِ رات



یہ وزیرانِ کرام

کوئی ممنون منہ نہ لگے کوئی ڈالر کا غلام
جس کینس محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس حالت میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیرانِ کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مرجاتے بھی ہیں
وقت بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں، کیجیے ان کو سلام
یہ وزیرانِ کرام
ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھیے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام
یہ وزیرانِ کرام



ان کو فرصت ہے بہت اپنے امیروں کے لیے
ان کے ٹیلیفون قائم ہیں سفیروں کے لیے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لیے
پھر نہیں سکتے انھیں ہم ان کا اور بچا ہے نفاق
یہ وزیرانِ کرام

صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی کال
جب یہ چاہیں میڈیو پر جھار سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں پیدل، کار پر یہ کس طرح ہوں ہم کلام
یہ وزیرانِ کرام

کتابوں کی دنیا میں ایک اچھا رہا ہوا نام

پبلشرز
اینڈ
ایڈورٹائزرز

Pib Ad

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ۶ کوشن، نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱



الطاف گوہر

حرف سردار

چودہ پندرہ برس کی بات ہے کیلے فورنیا میں ایک پانچ 'کونکا اور تارتینا بچہ پیدا ہوا ایک خاتون نے اس لاوارث بچے کو گود لے لیا اور پھر وہ بچہ اس کی کائنات بن گیا دن رات وہ اسی میں مگن رہتی اسی سے باتیں کرتی "لیزی (LESLIE) آج تم بڑے چپ چاپ سے ہو" "آج تمہارے پاؤں میں کچھ جنبش سی ہے"۔ سال گذرتے گئے بچہ کم کم بڑا رہا۔ ایک صبح لیزی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ ہولے ہولے روئے لگا 'ماں کا یہ حال تھا کہ محلے والوں کو بلا کر دکھا رہی تھی کہ لیزی روئے لگا ہے 'دو چار سال اور گذر گئے۔ رات کے ستانے میں بیانو کی آواز آ رہی تھی کہ ماں کی آنکھ کھل گئی 'اس نے سوچا کہ شاید اس کا میاں سونے سے پہلے فی دی بند کرنا بھول گیا ہو۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی اور جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ لیزی اسٹول پر آکڑوں بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیاں بجلی کی طرح بیانو کے سروں پر لہرا رہی تھیں۔ لیزی جو نوالہ تک نہ اٹھا سکتا تھا یوں بیانو بجا رہا تھا جیسے اس کی ساری مدح اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہو۔ علماء اور نفسیات کے ماہرین نے بڑی کھوج کے بعد یہ راز نکالا کہ لیزی کے ذہن کا کوئی حصہ قلع کی زد سے بچ نکلا تھا بالکل ایسے ہی جیسے اٹھارہ صدیوں سے مٹی کا کوئی تودہ ابھر آئے اور رفتہ رفتہ ایک خوش نما جزیرہ بن جائے 'وہ جزیرہ اب لیزی کی تخلیقی قوتوں کی ناقابل تغیر آبادی کا بن گیا تھا۔

حبیب جالب یا وہ بچہ ہے جسے معاشرے نے پانچ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی 'اس کی نظر دھندلانے اور گویائی سلب کرنے کے سب حربے آزما ڈالے یا وہ ماں ہے جس نے تمام آزمائشوں اور مصائب کے باوجود تخلیق کے ایسے منور اور تابندہ جزیرے کی حفاظت کی جس پر ہرست سے عظمت کی یلغار تھی۔

حبیب جالب کی بچاسویں سالگرہ منائی گئی تو اہل نظر نے اپنی ادب نوازی کا حق ادا کیا۔ بہت حسن نے کہا جالب نے مظلوم کی حمایت کی سیاست کو اپنا دین بنایا اور خود ہی اپنے

اصولوں کی فصل کاٹی۔ احمد ندیم قاسمی نے جالب کو آزادی اظہار اور جرأت کی علامت قرار دیا۔ وزیر آغا نے کہا جالب ایک مجسمہ ہے جو اندر اور باہر ایک ہے۔ عبادت بریلوی کو جالب کے شعروں میں جہاد اور فارغ بخاری کو سوشلزم کے سراغ ملے۔ انتظار حسین نے دریافت کیا کہ جالب کی شاعری کو پہلے قبول عام حاصل ہوا، پھر خواص نے چار و ناچار انہیں قبول کیا۔ محمد خالد اختر نے لکھا "سبحان اللہ کیا شیخ تھے، بھولے بھالے معصوم، حقیقت میں مادر زاد ولی تھے۔ حرف صادق القولی کے لئے ہزارہا نعمت دنیائے دلوں پر لات ماری تھی اور گوش نشینی اختیار کی تھی، اگرچہ تعلقات ظاہری بہت سوں سے تھے لیکن ایسی ہی بے شعلی بھی حاصل تھی، باہر سے ہم سے کچھ آگے قدم رکھا تھا۔"

یہ سب باتیں مناسب مکر اسل بات افکار اور احتجاج کی ہے جس نے جالب کے شعر کو لازوال بنادیا ہے۔ انسان صدیوں سے ایک ایسے معاشرے کی جستجو میں ہے جو اس کی مادی ضروریات کا تکفیل اور اس کی فکری اور حقیقی قوتوں کی ترویج و تکمیل کا خاصن اور معاون ہو۔ اب تک جتنے بھی معاشرتی نظام وضع ہوئے ہیں ان میں جبر و استبداد، اور عدم مساوات کی قوتیں برسرِ اقتدار رہی ہیں گو ان کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ عام آدمی اپنی مصلحتوں کی وجہ سے ان قوتوں سے مخالفت کر لیتا ہے اور نظام استبداد کو تسلیم کر لینے ہی میں اپنی نجات سمجھتا ہے، اگر وہ کبھی سراٹھاتا ہے تو جبر کی ایزی اسے وہیں پھنسا دیتی ہے۔ زمیندارانہ اور بائیرانہ نظام جس کی بنیاد ہی انسان کی حقیر اور تحلیل پر ہے آج بھی کئی ملکوں میں بڑے طعناق سے چل رہا ہے اور نگلی جینٹوں پر نازیباں آج بھی اسی کروفر سے لگ رہے ہیں جیسے آج سے پانچ سو برس پہلے۔

جو اقتصادی نظام اور طریق زراستانی ان ملکوں پر مسلط ہے جنہیں "آزاد دنیا" کا لقب دیا جاتا ہے وہاں حالت یہ ہے کہ چار میں سے تین آدمی مجبور و محکوم، نادار و تلاش ہیں ایک طرف اناج کے ذخیرے اگر کھجا کر دیئے جائیں تو آسمان کو چھونے لگیں اور دودھ کی نمریں اگر ہمدی جائے تو سطح سمندر پر سفیدی کی چادر بچھ جائے اور دوسری طرف لاکھوں انسان بھوک کا شکار ہیں اور موت کے انتظار کے علاوہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔

نئی دنیا میں جہاں انسانی حقوق کے چارٹر اور کنونشن بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد بن چکے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں ایک ایسا غیر انسانی طریق حکومت رائج ہے جہاں محض رنگ کی بنا پر ملک کی اکثریتی آبادی کو ہر انسانی حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ریورنڈ الین بوساک (REVEREND ALAN BOESAK) جو کالوں کے حریت پرست لیڈر ہیں ایک ملاقات میں کہنے لگے "ہم لوگ، ہمارے ماں باپ، ہمارے بھائی، بہن اور ہمارے بچے

نہ سمجھ گئے ہیں کہ ہمیں ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ مرعانے کا حق 'اب ہم نے ملے کیا ہے کہ یہ حق ہم خود استعمال کریں گے' جب چاہیں گے اور جس طرح چاہیں گے۔" —
 مسیوئی نظام کی برصغیر مشرق وسطیٰ میں چابی و برادری کا سامان بنی ہوئی ہے، فلسطین سے جبری طور پر نکالے ہوئے لاکھوں لوگ کیپوں میں پناہ گزین ہیں اور انہیں وطن جانے —
 اور وہاں دوبارہ اپنے گھر بنانے اور خود اپنا ملک بنانے کا حق حاصل نہیں۔ کیپوں میں —
 فلسطینی بچے اور اسرائیلی سرحدوں کے قریب اجڑے ہوئے گھروں میں بیٹھے ہوئے بوڑھے —
 مرد اور عورتیں اسرائیلی ہندوؤں اور توپوں کی زد میں ہیں اور اگر آپ لندن میں یہ کہیں کہ —
 لئی ایل او حسرت پسندوں کی جماعت ہے اور اس کے سربراہ یا سر عرفات ایک حسرت پسند —
 لیڈر ہیں تو امریکہ اور یورپ میں یہودی خطیں آپ پر سام دشمنی کا ٹپہ لگا کر آپ کو بدنام —
 کرنے لگی ہیں۔

ایسی ہی وحشت اور برصغیر کی فضا میں احتجاج کی آواز ابھرتی ہے، شروع میں ایک فرد در پھر عوام کی آواز بن جاتی ہے اور قصر استبداد ٹوڑنے لگتے ہیں۔ یہ آواز کبھی صوفی کی کبھی شاعر کی اور کبھی شاعر کی آواز بن کر گونجتی ہے مگر اس کا ہدف ہر صورت میں جبر، نارسائی اور ناانسانی کا معاشرتی نظام ہوتا ہے۔

منصور حلاج نے ایک ہی غصے سے سارے معاشرے کے خیر کو دھن کر رکھ دیا، اس نے کہا اصل طواف تو کعبہ دل کا ہے تو سلطنت عباسیہ پر جو حرم شریف کی عاتقہ بنی بیٹی تھی عرش طاری ہو گیا۔ اس نے کہا مجھے مار ڈالو کہ میری اور میرے خالق کی روح ایک ہے اور یوں مل چکی ہے جیسے مٹک اور خیر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔
 نلیفہ دقت اور اس کے دذیروں نے فیصلہ دیا کہ اس احتجاج کی آواز کو بیش کے لئے خاموش کر دیا جائے۔ درباری قید اور منصف سب نے سر جھکا دیئے اور منصور حلاج سورۃ شوریٰ کی یہ آیت پڑھتا ہوا "ان خالوں کے لئے درد ناک عذاب ہے وہ عذاب ان پر اس دقت آئے گا جب وہ اپنے کئے کے انجام سے ڈر رہے ہوں" آخری سانس کے ساتھ وہی ایک صدا نکلی "انما الحق" اور منصور بیش کے لئے سر بلند ہو گیا اور احتجاج کی آواز زمان و مکان کی ہر قید سے بیش کے لئے آزاد ہو گئی۔

وہ نلیفہ منظر ہو یا سر عرفات سب منصور حلاج کی سنت پر عمل کر رہے ہیں، سب کا ایک ہی ایمان ہے کہ ظالم کا انجام بالآخر درد ناک عذاب ہے۔

اردو شاعری میں احتجاج کی تحریک نظیر اکبر آبادی سے حسرت موہانی اور ظفر علی خان تک پہنچی، اقبال کے کلام میں اس آواز میں ایک عظمت پیدا ہوئی اور فیض نے اسے ایک

عموی رنگ دیا۔ آج صیب جالب کے شعر میں منصور صلاح کی آواز کو بجتی ہے 'وہ احتجاج کا علم اٹھائے گاؤں گاؤں پھرتا ہے دنیا کی گلیوں میں'۔ رتبے اور آسائش اس نے اپنے لئے حرام کر لی ہیں۔ دنیا سے بے تعلقی احتجاج کی راہ میں پھلا اور عکین ترین قدم ہے یہ قدم ایک بار اٹھ جائے تو راہ آسان ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے کہا "یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند"۔ "تین دہم گماں لالہ الا اللہ" اس قطع تعلقی کی ایک عظیم مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جب یروشلم کی یہودی عبادت گاہ میں انہوں نے حضرت مریم علیہ السلام سے کہا "عورت چلی جا۔ میں نہیں جانتا تو کون ہے۔"

احتجاج کا شاعر جب دنیا سے قطع تعلقی کر لیتا ہے تو پھر وہ اپنی دنیا خود تخلیق کرتا ہے اس کی ذات میں ایک پوری کائنات ابھرتے اور سامنے کھتی ہے۔ اور اس کائنات کے سب اجزاء اس کی روح اور فکر کے عکاس بن جاتے ہیں۔ انگریزی میں کائنات کا متبادل لفظ COSMOS ہے جس کے ابتدائی معنی دنیا کے نظام کے حسن ترتیب کے تھے۔ مگر COSMOS سے حسن ترتیب اگر غائب ہو جائے تو دنیا ظلم اور جبر کا ایک بھیاں سا ڈھانچہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاعر اپنی کائنات میں وہ حسن ترتیب جو دراصل مقصد حیات ہے دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ غالب کی کائنات میں اس کے اپنے شب و روز ہیں جہاں شہود و شاہد و مشہود کی کوئی تفریق نہیں اور جہاں سر پہنچنے کی رسم کسی سنگ آستان کی محتاج نہیں اور جہاں قلعہ ساز انا لکھ رہے۔

احتجاجی شاعر کی دنیا کے اپنے شر، اپنے گاؤں، اپنے رستے ہیں اس دنیا میں لفظ بٹتے ہیں اور ان کی صدا صبح و شام گونجتی ہے 'یہاں لفظ خود اپنی حرمت کے امین ہیں اور اپنے حقوق کے ضامن۔ اس دنیا کے شہری ناقابلِ فہم ہیں اس لئے کہ لفظ دائم اور ابدی ہے۔ یہ صاحب کائنات شاعر صاحبِ دہان شعراء کی صف میں نہیں آتا اس لئے کہ ان کا ہر لفظ 'ہر یول اپنا ہوتا ہے اس میں کسی اور کا رنگ یا جھلک نہیں ہوتی' ان کا ہر لفظ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب کے محلے کا ہوں ناقابلِ شک کے گاؤں کا ہوں۔

ٹیکیز کے بارے میں ایک قصہ ہے کہ وہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتا ان پر اپنا نام بھی لکھوا دیتا ہے 'اس نے ایک سائینٹ سے مل کر دی۔

I SUMMON UP WHEN TO THE SESSIONS OF SWEET
REMEMBRANCES OF THINGS PAST SILENT THOUGHTS

اس کے بعد جہاں کہیں بھی SESSION کا لفظ آئے گا اس پر ٹیکیز کی سرنگی ہوگی بالکل ایسے ہی جیسے رگ سنگ پر غالب کا نام لکھا ہے اور فوقِ تن آسانی پر اقبال کی سرنگی

ہے۔

جالب کی ذہن 'جالب کا شعر' جالب کا بیان سب اس کی اپنی دنیا کے شری ہیں اور ان کی اپنی بچان ہے اور ان کی اپنی آواز ہے۔ "م آوازہ" جس طرح جالب کے دل کی گمراہیوں سے نکلا اور ہمارے دلوں کی گمراہیوں تک اتر گیا اس کی مثل نہیں اس لئے کہ یہ کوئی لمبی کمال نہیں آوارگی تو جالب کی دنیا کا مرکزی نقطہ ہے۔ آوارگی ہی کا شوق اسے اڑتے چوں کے پیچھے لئے پھرتا ہے، وہ سارے جہاں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے گو فلک دشمن جہاں 'نہن فیر ہے کوئی اپنا نہیں۔ اور یہ حسن آوارگی ہی کا اعجاز ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے ایک داستان چھوڑ آتا ہے۔

جالب کے جو نقطہ یہ کہتے ہیں کہ جالب کی شاعری عارضی اور وقتی موضوعات پر مبنی ہے وہ بعض شخصیتوں اور بعض مخصوص واقعات میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ جالب کی دنیا تک پہنچ نہیں پاتے 'جالب نے جب یہ کہا کہ "ایسے دستور کو صبح بے نور کو" میں نہیں مانا 'میں نہیں مانا' تو اس انکار کا قہقہہ ایک مخصوص آئین سے تو تھا ہی اور اس کی ضرب براہ راست اس آئین کے خالق پر پڑی مگر جالب کا موضوع ایک دائمی موضوع تھا وہ انکار تھا جبر کے ہر نظام سے وہ احتجاج تھا ظلم کی ہر دستاویز کے خلاف ابھی کل کی بات ہے کہ نیلا MANILA کے بازاروں میں یہی نمونہ گونج رہا تھا اور آج بھی جب جالب یہ کہتا ہے ————— ظلم کی بات کو 'جہل کی رات کو' میں نہیں مانا 'میں نہیں مانا

تو اس کے اپنے شری میں نہیں جو ہانبرگ JOHANNES BERG کے زندانوں میں قیدی زنجیر بدست رقص کرنے لگتے ہیں۔

قبر اور قلعی آج تک یہ طے نہ کر سکے کہ منصور طلاج کو "رد" کیا جائے یا "قبول" اور بہت سے اب بھی "توقف" فرما رہے ہیں مگر منصور کی دم احتجاج تمام دنیا کی معتبر ترین دم بن چکی ہے جالب کہتا ہے "کات دو میرا سر" کات دو میرا سر" اور اعلان کرتا ہے۔

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے

میں بھی منصور ہوں کہ وہ اغیار سے

جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک شعلہ ہوتا جو عمر بھر لپکتا رہتا 'جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک نمونہ ہوتا جس کی گونج سے اقتدار کے سندر لڑتے 'جالب اگر شاعر نہ ہوتا تو ایک سنگ تراش ہوتا جو جبر استبداد کے میب مجسموں کو پاش پاش کرتا اور پھر ان کے ٹکڑوں سے محبت اور سکون کی رنگین مورتیاں بناتا 'آج یہ مورتیاں 'یہ انکار کے شعلوں کی لپک پہ



اجحاج کے نمونے کی گونج جالب کی کلیات حرف مراد کے ہر سطرے پر جھنجھوٹی ہیں۔

امین مغل انسان دوست

اس نے برگ آوارہ ' سے اپنا شعری سفر شروع کیا۔ وہ سرمتل پر رکا اور اس نے اپنے مخالفوں کو تنہا آزمائی کی دعوت دی۔ آج وہ ہمارے سامنے اس ملک کے عہدِ ستم کی داستان پیش کر رہا ہے۔ ہمارے پچھلے دس بارہ سال جس جذباتی اتار چڑھاؤ سے گزرے ہیں حبیب جالب کی شاعری اس کا لسانی خاکہ ہے۔ عام لوگوں کی آہوں کی تصویریں ' محرومیوں کے نقشے اور پھر ان سب کے سیاہ گہرے رنگوں کو کاٹا ہوا حوصلوں کے اظہار کا آئینہ خونی رنگ ' ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز غریبوں کی بے چارگی کا نا آشنا کرنے والی لٹکار۔ حبیب جالب کی شاعری کا حسن ہیں۔ اس کے کلام میں اس ملک کے لوگوں کے لئے پیار ہے اور ان کی بے بسی پر جھلاہٹ بھی ' ان کی تھپی مپے پناہ بے کراں توانائیوں سے آگئی بھی۔ ان کے بیدار ہونے پر خوشی کا اظہار بھی اور ان کے لئے مستقبل کی تابندگی کا پیغام بھی۔ ہمتوں کی سرخوشی اور ولولوں کی محک بھی۔

انسان دوستی کی رعایت نے زندگی گزارنے کے جو طریقے دریافت کئے ' ان میں ایک قلندری بھی ہے۔ قلندری کی روش حبیب جالب کی زندگی ہے اور اس کی شاعری کی روح بھی ' قلندری ' شاعر کو یا صوفی بنا دیتی ہے یا مجاہد ' حبیب جالب کی قلندری مبارزت کی لذتوں کو سمئے ہوئے ہے ' اس کی عملی زندگی کا لمحہ لمحہ شعر بن کر ہماری تاریخ کا تابناک حصہ بن گیا ہے۔

سیدھے سیدھے لفظ ' عام بول چال کا محاورہ ' وہ لفظوں کو لیتا ہے اور ان کو اس ڈھب سے ترتیب دیتا ہے کہ موسیقی چمک چمک پڑتی ہے۔ لوگوں کی ثقافتی عصبیتوں کو لفظوں کی گرفت میں لے کر وہ ان کو جیت جیت بخش دیتا ہے اور اس طرح ثقافتی عصبیتیں ایک مادی ہتھیار بن جاتی ہیں جس کو وہ نہایت چابکدستی سے روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے استعمال

کرتا ہے۔ " پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ " کا نعرہ آسمانی اور ارضی مغایم کا خزینہ بن کر ابھر آتا ہے۔

حبیب جالب کو ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر عکراتی پسند نہیں۔ ہماری پچھلے دس بارہ سال کی سیاسی زندگی آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد کا مرقع ہے جس کسی نے اس عرصہ میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں ذی حس ہونے کا ثبوت دیا ہے اسے معلوم ہو گا کہ اس کے دل کی نفل کا اظہار جس بھرپور انداز میں حبیب جالب کی شاعری میں ہوا ہے وہ کسی اور ہم عصر شاعر کے پاس نہیں ملتا۔ خواہ جالب۔ قائد اعظم کے حضور میں ہے یا صدر ستم گر کے دربار کے باہر، وہ عوام کی عکراتی کی بات کرتا ہے، وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ

کوئی نصرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو تباؤ

لیکن اس کی جسوریت پسندی ایک تجریدی تصور نہیں بلکہ وہ اس حقیقت سے ابھرتی ہے کہ جسوریت سے ہی انسانی برابری کی کوئٹس پھوٹی ہیں۔ ایسی برابری جو صرف سیاسی نعرے بازی کی بات نہیں بلکہ سماجی انصاف کی طرف بھی پہلا قدم ہے۔ اسی لئے وہ صدر ستم گر کے سامنے محنت کشوں کی عکراتی کی بات کرتا ہے۔ قائد اعظم کے حضور وہ تیس روپیہ من آنے کا شکوہ کرتا ہے۔ پاکستان کے مطلب میں ایک حضورہ روٹی، کپڑے اور دوا کا بھی شامل کرتا ہے۔

حبیب جالب کی شاعری تنکیوں کی شاعری ہے۔ چنیوں کا دھواں اس میں حسین پاتا ہے کسانوں کا پھیند اسکی تازگی کا باعث ہے جمو پڑی اس کی پامٹی کا احتجاجی نشان ہی نہیں اس کے خوابوں میں سے ایک خواب ہے۔ ابھرتی ہوئی نوجوان نسل جو علم حاصل کرنے جاتی ہے اور جس کا گولیوں اور لاشیوں سے استیصال ہوتا ہے، اور جس کی جان کی قیمت سے زیادہ کار کے شیشے کی قیمت پڑتی ہے اس کے نزدیک ہماری قوم کا سرمایہ ہے، حبیب جالب محنت کرنے والوں کے گیت گاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے والٹ وٹ مین جسوری آدمی کی شاعری گاتا ہے۔

ایک طرف اس کو ان محنت کرنے والوں کے دکھوں کا احسان پہ تو دوسری طرف وہ ان کو آگے طرف بڑھتا ہوا انقلابی طبقہ بھی سمجھتا ہے۔ ایسا طبقہ جس کو اقتدار حاصل کرنے میں بے شمار ٹکٹن آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ ایسے میں وہ کنڈن لسل کا استعارہ تخلیق کرتا ہے جس کو پانچ کوڑے پانچ پانچ ماہ کی سزا محنت کش عوام کے راستے میں حائل مشکلات کا نشان بن جاتی ہے۔

حبیب جالب کے ہاں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں سے نفرت اس عظیم انسانی جذبے سے ابھرتی ہے جو تمام انسانیت کو ایک اکائی سمجھتا ہے جس میں رنگ نسل، عقیدے اور جنس کی قید نہیں، جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز ہے۔

حبیب جالب اس بات سے آشنا ہے کہ اس کے سماج میں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے ساتھی اور پشت پناہ اس ملک کی سرحدوں سے کہیں دور بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس ملک کو لوٹنے والوں کے پیچھے پوشیدہ سامراجی اور سرمایہ دار دیکھتا ہے۔ وہ عمارت گراہیاں ٹکس کی پاکستان آمد پر شور مچاتا ہے۔ عالمی سامراج سے دشمنی حبیب جالب کو ان حسرت پسندوں کی یاد دلاتی ہے جو آج کہ ارض پر ہر جگہ خوشحالی، امن، انصاف اور آزادی کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں اور وہ ہم سب کو نگاہ ہوچی منہ سے زندگی لینے کی تلمتین کرتا ہے۔ شرق الاوسط کے ایسے میں صدر ناصر کی ذات اس کے لئے روح انسانی کی عظمت کا اشارہ بن جاتی ہے۔

اور پھر حبیب جالب یہ دیکھتا ہے کہ آج جبکہ اس کے اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں شت کش عوام اپنے حکمرانوں اور ان سامراجی آکاؤں کے خلاف جو جدوجہد کر رہے ہیں ان میں ان کے معاون وہ سوشلسٹ ممالک ہیں۔ جہاں آج محنت کش عوام اپنے اقتدار کے پھول کھلا چکے ہیں۔ وہ سوشلزم کے خواب کو عملی شکل بخشنے والے یمن، اس کے عظیم وطن اور ساتھی ملکوں کو سلام کرتا ہے۔

حبیب جالب اپنے دشمنوں سے لڑتا ہے اور اس میں کسی رو رعایت کا روا دار نہیں۔ لیکن اس کی دشمنی اس شدید اور عظیم انسانی جذبے سے ابھرتی ہے جو تمام دنیا میں امن، خوش حالی اور پیار کا دود دودہ دیکھنا چاہتا ہے تاکہ نسل انسانی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے حسن کے ان گنت شاہکار تخلیق کر سکے اور پھر تخلیق کرتی رہے اسی لئے اس کا مشورہ سارے جہاں سے پیار سکھاتا ہے۔ اس کے قلم کی امن دوستی سے ظلم بھی ڈرتا ہے۔

حبیب جالب کی شاعری پر جو کلام قلم اٹھے گا وہ خود اس کی شاعری کے پاس سے چمک اٹھے گا۔

(عبدالحکیم مجاہد - سبزیہ)

سعیدہ گزدر شوقِ آوارگی

آج اس شہر میں
کل نئے شہر میں
بس اسی لہر میں
اڑتے چوں کے پیچھے اُڑتا رہا
شوقِ آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے
فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا، 'سکراتا رہا
شوقِ آوارگی
کوئی ہنس کے ملے
غنیچہ جاں کھلے
چاک دل کا ملے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا
شوقِ آوارگی

شوقِ آوارگی کا یہ سلسلہ نہیں رکا 'بڑھتا گیا' پھیلتا گیا۔ بہت گہرا اور بامعنی ہوتا گیا۔
جالب نے جو راست اپنی شاعری 'اپنی سیاست اور اپنی زندگی کے لئے پہلے روز سے اختیار کیا
'اس میں کہیں تبدیلی نہیں آئی۔ لوگ آتے جاتے رہے ملتے اور جدا ہوتے رہے
جواب مگر دکھ دیتے رہے۔ سچائی اور سیاست کے ملے ساتھ رہنے والے بہت سے 'ساتھ

پہ لڑنے - مگر جالب نہیں بدلا - راستے سے ہٹے والوں نے بارے میں اس نے کہا

نہ سمجھیں گے انہیں اب اپنی منزل
نیتیں گے اب نہ خوابوں کے سارے
ہمارے واسطے ان کے افق میں
نہ سورج تھا نہ روشن چاند تارے
تارے خوں سے آلودہ ہیں جو ہاتھ
وہ ہاتھ ان کو بست لگتے ہیں پیارے
کیا ہے جن میں جالب ذکر ان کا
بجلا دو تم بھی وہ اشعار سارے

اور آج جالب کے ساتھ ساتھ عوام بھی انہیں بھلا چکے ہیں۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ جالب پر صرف شاعری کے حوالے سے بات کروں مگر یہ ناممکن ہے۔ اس نے خود بھی تو شاعری کو اپنا ہتھیار بنایا ہے۔ 'قلم اور جبر کے خلاف' غلامی اور بے بسی کے خلاف، 'جہالت اور تنگ نظری کے خلاف ایک مسلسل جہاد' خود تنہائی اور سرشاری سے بھرپور کیفیت کا مکمل اظہار۔

جالب کے بارے میں بڑے پختے ہوئے اور رتے والے نقاد کہتے ہیں کہ وہ مشاعروں اور جلسوں کا شاعر ہے۔ وقتی شاعری کرتا ہے اور بعض تو اس حد تک جھنجھلا جاتے ہیں کہ اس کی شاعری کو تنگ بندی اور اشتہار بازی قرار دیتے ہیں۔ کیا حال سے بڑھ کر کوئی لمحہ اہمیت رکھتا ہے؟ جو اپنے حالات اور گرد و پیش سے متاثر ہونے سے بچنے اور اس پر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ فنکار تو کیا انسان بھی نہیں ہیں فقط مٹی کے دھوہ ہیں جن کی زبان اور قلم سے نکلے ہوئی الفاظ روشنائی تنگ ہونے سے پہلے ہی دھواں بن کر اڑ جاتے ہیں۔ جالب کی بے پناہ مقبولیت اس طرح کے حکم لگانے والے ادبی اور ثقافتی 'تخت نشینوں کی رہن منت' بھی نہیں رہی وہ زندگی کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کو سن کر اور پڑھ کر ایک

امید بندھتی ہے۔ سچائی اور آزادی کے حصول پر یقین تازہ ہوتا ہے۔

سرکاری قسم کے وظیفہ خوار ادیب اور دانشور جب جالب کی شاعری کو سیاسی شاعری اور اسی طرح کے باعزت ناموں سے نوازتے ہوئے اسے شاعرانے سے انکار کر دیتے ہیں تو جالب کے لئے بڑی عظیم بات بن جاتی ہے کیونکہ جالب کا ہاتھ تو جمع کے دل تک پہنچتا ہے

اور وہ وہاں سے جذبات کی شدت، غمزدیوں اور مایوسیوں کی داستانیں اور امید اور حوصلے کا جوش سمجھ کر ہم تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنے شعیہ ذاتی غم کو بھی اجتماعی بنا دیتا ہے۔ نواں سال بننے کی صحت پر اس کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

پونچھ لے آنسو مری جاں
اے مری بھم نہ رو
اپنا پچہ ہو گیا تیار آخر مر گیا
وہ بھی پچہ ہے جسے قاتل اٹھا کر لے گئے
جو نہ آنکھوں سے کبھی چپکے وہ آنسو دے گئے
پھول کتنے ہی یہاں بوٹوں تلے روندے گئے
غم کا ٹھکر کتنے آگن آنسوؤں سے بھر گیا
لے گئے ہیں خاک میں کتنی ہی ماؤں کے بچر
جانے والا تو فقط گھر کو ہی سوتا کر گیا
اپنا پچہ ہو گیا تیار آخر مر گیا

بست بیا دل چاہئے اپنے ذاتی غم کو ایسے ہاگیر اور آفاقی جذبے میں ڈھالنے کے لئے۔
جالب کی شاعری میں روحانی حسن اور نزاکت کے ساتھ ساتھ آج کی دہائی کی زندگی کا پ
آشوب، درد شامل ہے اور آنے والے خوبصورت زمانے پر یقین بھی۔ بے شمار تکلیف
سائل میں گھرے رہنے کے باوجود وہ ہر لمحہ خطرے کو لٹکارنے پر تیار رہتا ہے اور دین
سز سزا اسی اسی برس کے بوزمے جنہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ مرچکے ہیں اپنے آپ۔
سنت سمیت کرنے جانے کس دن کے لئے بچا رہے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے جموت کو ج
بنانے پر تے ہوئے ہیں جس کا اندازہ اسلام آباد میں ہونے والی اوبچوں کی سرکاری کانفرنس
کو ٹیلیویشن پر دیکھ کر ہوتا ہے۔

جالب کا فن تخلیقی 'بے چارگی' بے بسی اور بے جاگی کے احساس کو نہ صرف فہم کرتا
ہے بلکہ انہیں شکت دیتا ہے۔ قید خانے میں جب وہ اپنی بچی کو یاد کرتا ہے تو وہ بخشی سی
معصوم بچی خود بخود اس بست بڑے مظلوم طبقے کی بچی بن جاتی ہے جو آج مستقبل کی آس
میں زندہ ہے۔

میری بچی میں آؤں نہ آؤں

آنے والا زمانہ ہے تیرا

تیرے نئے سے دل کو دکھوں نے
 میں نے مانا کہ ہے آج گمرا
 تیری آشا کی بکيا کھلے گی
 چاند کی تجھ کو گھریا لے گی
 تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
 ختم ہو گا ستم کا اندھیرا
 جج کی راہوں میں جو مر گئے ہیں
 فاصلے مختصر کر گئے ہیں
 دکھ نہ جمیلیں گے ہم نہ بھپاکر
 سکھ نہ لوئے گا کوئی لیرا
 میری بچی میں آؤں نہ آؤں
 آنے والا زمانہ ہے تیرا

جالب کی شاندار نظمیں ان نقادوں کو بڑا شاعرانہ اور منہ توڑ جواب ہیں جو ادب کو
 سیاسی جدوجہد سے الگ دیکھنا چاہتی ہیں جبکہ بقول شوکت صدیقی سیاست تو آج ہماری
 خواب گاہوں میں داخل ہو چکی ہے۔ پھر بھلا کوئی جاس اور باشعور فنکار سیاست اور سیاسی
 کیفیت سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہے۔ سیاسی صورتحال سے الگ تھلگ رہنے والا شاعر
 اور ادیب دراصل ایک پتھر ہے۔ سرمایہ دارانہ اور استعمالی نظام کا حامی اور پروردہ۔
 ایک بہت بڑے اور بزرگ نقاد نے پاکستان کی موجودہ ذہنی، سیاسی اور پہنچاتی زندگی کا
 جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ ایک ایسے کمرے میں بند ہیں جو کہ چاروں طرف مضبوط
 دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ان دیواروں میں کہیں کوئی دروازہ، کھڑکی اور روشندان نہیں
 ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم سب ایک کھوکھلی قبر میں دفن ہیں۔ میں یہ پوچھوں گی کہ پھر کیا
 ہم سب اس قبر میں بند رہیں؟ اور جالب کے پاس اس سوال کا جواب ہے۔ وہ کہتا ہے آؤ
 ہم مل کر ان دیواروں کو توڑ دیں، انہیں ڈھادیں اور ان کی جگہ بہت، مبادری اور
 جوانمردی کی دیواریں کھڑی کریں۔

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا۔

نہیں رہے گا

غائب کو غائب جو کھل کر نہیں کہے گا

نہیں رہے گا
 کرتی ہوئی دیوار سے غلط توڑو بھی
 خوش فہم اب سراج کو چھوڑو بھی
 وقت کی جو آواز کو اب بھی نہیں سنے گا
 نہیں رہے گا

آج جو نہیں لڑ رہا وہ بزدل ہے۔ ہمارے کتنے ہی شاعر اور ادیب پیدائشی بوڑھے ہیں کیونکہ وہ شروع کرتے ہی شاعری برائے شاعری اور ادب برائے ادب کی بات کرنے لگتے ہیں۔ تھکیک اور زبان کی نزاکتوں کے بجائے اس جذبے کو ہمیشہ کے لئے گھوتا بیٹھتے ہیں جو سچائی اور حقیقت پسندی کی دین ہے۔ یہ وقت ماضی کی خواب گاہوں میں رہنے کا نہیں بلکہ خوابوں کی تعبیر کا زمانہ ہے ایک طرف ہمارے سامنے انسانی عقلیت اور وقار کی شاندار مثالیں ہیں اور دوسری جانب ہم ہیں غریب ملکوں کے عوام جن کی عزت کا مسئلہ بھیک کے چند نوالوں اور در آمد شدہ آسائشوں سے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہماری تعلیم، ہماری زندگی اور ہمارا ماحول سب کے سب ہمیں ادھورا، نامکمل، ذہنی طور پر مفلوج اور مغرب کی بھڑکیلی دولت پرست طاقتوں کا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ غالب اس ذہنی اور معاشرتی پس ماندگی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اس کی شاعری دراصل وضاحت ہے۔ ہماری جس سال تاریخ کی اس لحاظ سے اگر کسی فنکار نے اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو باخبر رکھا ہے، جمنجھڑا اور بگایا ہے تو وہ صرف غالب ہے۔

انھیں کہ نہ انھیں یہ رضا ان کی ہے غالب
 لوگوں کو سر دار نظر آ تو گئے ہم
 وطن اور مملکت سے وفاداری کا ڈھونگ پینے والے بگڑ دیش میں فوجی کارروائی کے
 وقت خاموش تھے یا حکومت کی شان میں قصیدے اور ترانے لکھ رہے تھے۔ جبکہ ہمیشہ
 نڈر اور ملک دشمن کہلانے والا غالب کہہ رہا تھا۔

محبت گلیوں سے ہو رہے ہو
 وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
 مگن تم کو کہ رست کٹ رہا ہے
 جیسے جیسے پاکستان میں طبقاتی تضاد، سیاسی پابندیاں اور سختیاں بڑھی ہیں ویسے ویسے
 غالب کی شاعری بھی زیادہ متقبل ہوئی ہے۔ لوگوں نے اسے دل و جان سے اپنایا ہے پھر

بھلا جالب کی شاعری کو وقتی شاعری کیسے کہا جاسکتا ہے؟ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ موقع پرست نہیں ہے، 'ایک آہود مندانہ زندگی کی آرزو اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا دینا جالب کا شیوہ ہے۔ اس سرفروشی کی سزا اسے بار بار بھگتنا پڑی ہے۔ مگر وہ کیا کرے کہ اس کا خیر ہی ان جذموں سے اٹھا ہے جو تنگی، درد مندی اور جاں بازی سے لبریز ہیں۔ جالب نے اپنی شاعری اور بے پناہ شہرت کو عام رواج کے مطابق اپنا کیرئیر نہیں بنایا

بست مشکل صیری پہچان ہوگی

بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجہ

اسلامی کھیل، اسلامی بینک، اسلامی کلچر، اسلامی قانون، اسلامی تاریخ اور مسلم خواتین کے بعد اب ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ اسلام کے لئے لکھیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس ادیب اور شاعر نے اسلام کے خلاف کچھ کہا اور لکھا ہے؟ ہاں جو شاعر اور ادیب اس جنون اور کڑپن کا شکار نہیں بننا چاہتے ہیں ان کے خلاف فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ ایسے حلوں کی زد میں جالب کا آنا قدرتی ہے، مگر وہ ان حلوں کی پروا ہی کب کرتا ہے۔ اس کا اسلام تل والوں کا اسلام نہیں ہے۔ یہ محبت، شرافت، درد مندی اور سب کے لئے یکساں خوشحالی کا اسلام ہے۔

خطرہ ہے زرداروں کو

گرتی ہوئی دیواروں کو

صدیوں کے بتاروں کو

خطرے میں اسلام نہیں

فاشیزم کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے پلٹو لوگوں کو کتابوں اور کلچر سے متفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر وہ مقصدی ادب کا مذاق اڑاتے ہیں، گھٹیا باتیں یا مقصدی ادب کو نیچا دکھانے کے لئے کی جاتی ہیں، 'کسی جاتی ہیں۔ کبیڈ شاعر اور ادیب کی حیثیت کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انہیں جالب پر اعتراض کرنے کا ایک اور نکتہ مل جاتا وہ کہتے ہیں کہ جالب اپنی آواز کے سبب مقبول ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جالب کو اس کی آواز سے الگ کرنا ناممکن ہے اس کی نرم، سلجھی ہوئی اور پر درد آواز جب جلسہ گاہوں اور مشاعروں میں گونجتی ہے تو نہ جانے کتنی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، ہزاروں دل کچھ کر گزرنے، کچھ نہ جانے کے لئے تڑپ اٹھتے ہیں۔

مشہور شاعر پابلو نرودا سے چلی کے آمر اس لئے خائف تھے کہ اس کی دکھ بھری آواز

لاٹینی امریکہ کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی، پکچے ہوئے اور درمائدہ عوام کی آواز! سی آئی اے کے ایجنٹ اور شناری کے 'نزداد کا چچا کرتے تھے کہ کسی طرح وہ ہاتھ آئے اور اس کی آواز کا گھا گھونٹ دیں۔ آج جالب کی آواز سے بھی اقتدار پر قابض لوگ خائف ہیں۔

انہیں معلوم ہے کہ سچائی جالب کی مجبوری ہے وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں کے سچ میں جانا ہے تو نتائج کی پروا کئے بغیر دل کھول کر سچ بولا ہے اسی لئے اس پر ملک سے باہر جانے کے دروازے بند ہیں۔ نزداد سے اس کے ہتھیار بند دشمن بے پناہ خائف تھے کیونکہ وہ ساری دنیا میں بغیر کسی خوف کے ان کے مظالم اور منافقوں کے پول کھول پھرتا تھا۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں جب وہ جلا وطن رہا تب بھی برابر اپنے ملک میں غریب اور دھکی عوام کے لئے کام کرتا رہا۔ آج کون ہے جو اس کی شاعری کی عظمت کو اس کی سیاست سے دور کر سکتا ہے۔ بے معنی اور مطمئن زندگی کو وہ اپنے اور اپنے فن کے لئے موت سمجھتا تھا۔ جالب نے بھی ابھی تک ہمیشہ اپنے عمل اور شاعری کے ذریعے اسی اصول کا پرچار کیا ہے۔

ہے	انجاز	ہے	حسن	آوارگی	کا
جہاں	بھی	گئے	دستاں	چھوڑ	آئے
گولوں	کی	صورت	یہاں	پھر	رہے
نشین	سر	گلشن	چھوڑ	آئے	
تیرے	شر	میں	اک	جہاں	چھوڑ
				آئے	

مجبوری تحریکوں کے حوالے سے جالب پر لکھتے ہوئے اس کے کام کے تسلسل پر خود بخود نظریں ٹھہر جاتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی اور سیاسی سلسلہ جس نے ہر صد کی عزمیوں اور تحریکوں کو شاعرانہ لب و لہجہ عطا کیا۔ کئی سال پہلے جالب نے لکھا تھا۔

مجبوری تحریک ہے یہ اب روکے سے نہیں دیکھی
کسی بحرِ آبر کے آگے نہیں گردن اپنی جھکتی

اور آج جب وہ کہتا ہے کہ

دنا پڑے کچھ بھی ہرمانہ جی ہی لکھتے جانا
 مت گھبرا ، مت ڈر جانا ، 'جی ہی لکھتے جانا
 باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی مجھ پائیں
 وہ ہمیں روشن کر جانا جی ہی لکھتے جانا
 بل دہل کے پیش کی خاطر کیا دنا کیا جھکا
 آخر سب کو ہے مر جانا جی ہی لکھتے جانا

تو۔ روا تکلف وہ انکشاف ہے جمہوریت اور آزادی سے ہماری مسلسل محرومی کا۔
 لوگوں کی ایف دوسرے سے دوری اہمیت کی کامیابی ہے۔ آج ہمیں ایک دوسرے
 سے بے گانہ کرنے ، احساس تنہائی اور شک و شبہ کی کیفیت میں جٹا رکھنے اور ایک
 دوسرے کی سوچ اور درد و غم سے آشنا رکھنے کے لئے ستر شپ اور طرح طرح کے
 جھکڑے استعمال کئے جا رہے ہیں اور اسی لئے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک
 دوسرے سے ہمدردی کی آج جتنی شدید ضرورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ جالب کو
 سرکاری اہمیت لئے کی توقع ہے نہ خواہش ، اسے عام لوگوں نے بیٹھ سر آنکھوں پر بٹھایا
 ہے۔ آج جب کہ بہترین اور عظیم کارکن صحافی ڈائجسٹوں اور ایسے ہی بے شکے پڑوں
 میں کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا خون کرنے پر مجبور ہیں ، پریس کلب کی یہ شام ایک بہت
 بڑی ضرورت اور کمی کو پورا کر رہی ہے۔ اور میں جالب سے یہی کہوں گی کہ اس ملک کے
 بہترین لوگ ان کے ساتھ ہیں۔

کہتے تھے جو آب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
 لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹا تو گئے ہم

(یہ مضمون جالب کو تاحیات رکیت دینے کی تقریب کے موقع پر ۲۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کو
 کراچی پریس کلب میں پڑھا گیا۔)
 (حرف حق کا پیش لفظ)



عندلیب شادانی برگِ آوارہ

ایک سال ہونے کو آیا دہلی کی بزمِ سخن میں پاکستان کے ایک جواں سال شاعر حبیب جالب کو دیکھا اس کا کلام اس کی زبان سے سنا۔ اب تک اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے اور اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں نامرادوں کی ترجمان، کتنا درد، کتنا سوز کتنی کک کتنی تھی اس کی آواز میں۔ کتنی تڑپ، کتنا گداز، کتنی دلاویزی تھی اس کے اشعار میں، کانوں تک پہنچے ہی دل میں اتر جاتے اور سننے والے کو بے اختیار شاعر کی زندگی کے غم کدوں میں لے جاتے۔ اس کی رو نیا د حیات کے منتشر اجزاء میں نے اس کے اشعار سے جمع کئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا۔

پچھلے چند سال میں طوفانِ حوادث نے کتنی پرسکون بستیوں کو انقلاب کا گوارہ بنا دیا، اور کتنے امن پسند انسانوں کو وطنِ آوارہ کر دیا۔ خدا جانے کن حالات کی جبر و دستوریوں نے اس جواں سال شاعر کو اس کے وطن سے اٹھا کر غربت میں پھینک دیا۔ جوانِ دل کی ساری انگلیں، سارے دلوں سے سک سبک کر موت کی گود میں جا سوئے۔ گزری ہوئی دلوں سمیتوں کی جاں گداز یادوں کے سوا اب کچھ بھی اس کے پاس باقی نہیں رہا۔

مولانا قنیت نے پنجاب کو ”حسن آباد اور انتخابِ ملت کشور“ کہا تھا۔ لاہور اسی حسن آباد اور انتخابِ ملت کشور کا دل ہے۔ تہذیب و تمدن کا مرکز، حسن و جمال کا گوارہ۔ نئی اصطلاح کے مطابق ”شہر نگاراں“ اور ”روشنیوں کا شہر“ یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک غرضِ ذوقِ انسان تنہا کر سکتا ہے۔ یہ جہاں نصیبِ شاعر بھی اسی رو مانی بستی میں کیسے بتا ہے۔ مگر یہاں کی سب کچھ بھلا دینے والی نشہ آور زندگی، جھوٹ جانے والے دیس کی محبوبِ یادیں اس سے نہ چھین سکی۔ اس کی زبان سے اس سرزمین کا تذکرہ سننے تو دل بے اختیار اس طرف کھینچنے لگتا ہے۔ فطرت کے دل کشا مناظر کا ایک طویل سلسلہ

آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے اور گوناگوں جذبات کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔

پھاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دل نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبز و دریا وہ بیڑوں کے سامنے
وہ گہیڑوں بھری بستیاں چھوڑ آئے
حسین ہنگشوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت وہ ساں چھوڑ آئے
وہ حسین پھول ' وہ سبز ' وہ نسوں ساز دیار
وہ مدر گیت محبت بھرے دریاؤں کے

وہ سرسبز و شاداب وادی ' وہ گاتی گنگناہتی ہوئی ندیاں ' وہ گھنیرے درخت ' وہ ہرے
بھرے گیت ' وہ گل پوش سبز دار اور وہ فضا میں گونجنے والے اہل البیلی معصوم دوشیزاؤں
کے مدر گیت ایسی روحانی فضا میں سانس لینے والے انسان سے اگر حادثہ روزگار ' یہ روح
پرور ماحول چھین لیں تو اس کے دل میں کس طرح نشتر نہ لٹائیں گے۔ درحقیقت صرف
ندیوں کے گیت اور گل پوش وادی ہی اس سے نہیں چھوٹی بلکہ وہ متاع عزیز بھی اس سے
چھین گئی تھیں وہ غزل ' کبھی جان غزل ' کبھی متاب ' کبھی نزہت متاب اور کبھی نازش
خورشید کہتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں حرا نام نہ لوں
میں تجھے متاب کہہ لوں گا
اے نزہت متاب ترا غم ہے مری مذہبت
اے نازش خورشید ترا غم ہے مری جاں

یہی سب ہے کہ جب وہ اپنے دلیں کو کہ وہی دیار محبوب بھی ہے یاد کرتا ہے تو اس کا
لفظ لفظ حسرت و نامرادی کی تفسیر بلکہ تصویر بن جاتا ہے۔ اس کی روئیداد حیات ایک سیدھا
سادہ الیہ ہے۔ کوئی غیر معمولی ' نادر یا عظیم سانحہ نہیں۔ ہماری سوسائٹی میں اس قسم کی
الم انگیز داستانیں خدا جانے ہر روز کتنی بار دہرائی جاتی ہیں۔
اس کے دل میں احساس محبت جاگ اٹھا ہے اور نیاز حرم ناز تک جا پہنچتا ہے۔ تنہا کی
پنہ پرائی لطف و کرم سے ہو رہی ہے۔ محبت کا جواب محبت سے مل رہا ہے۔ چھپ چھپ کر

طاقتیں ہوتی ہیں۔ لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور وہ اس سلسلے کو منتقل کر دیتا چاہتے ہیں
شاعرانہ دراز اندازوں کی اور ان کے اس طرز عمل کی مذمت کرتا ہے۔ ہر چند لوگ سد
راہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ خطوں میں پڑ کر اور غمبائوں کی آنکھوں میں خاک
جموٹ کر اپنی محبوبہ تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

تو رنگ ہے ' غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو رونق حیات ہے ' تو حسن کائنات
اجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو بیکر وفا ہے مجسم غلوص ہے
بدنام روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ
پھر جارہا ہوں تیرے جسم کو لوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

محبت کی ناقابل فہم زود رنجیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ محبت کرنے والوں کے درمیان
کبھی کبھی بے بات کی بات پر آزدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ہی آپ صلح ہو جاتی ہے
نہ اس کی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے نہ اس کی۔ غالباً اسی قسم کی کوئی بات ہوئی کہ اس
نے کوئے محبوب میں جانا چھوڑ دیا۔ یہ کہنے تو وہ کیوں جھکیں۔ کھلا بھیجا کہ ہم ایسے ہی
برے ہیں اور ہمارے یہاں آنا آپ کے لئے ننگ و عار ہے تو پھر اس شہری کو کیوں نہیں
چھوڑ دیتے نہ آپ یہاں ہوں گے نہ ملنے کا سوال پیدا ہوگا۔ اس نے جواب دیا :

یہ اور بات ' تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شر تیرا چھوڑ جائیں ہم

مگر پھر آزدگی کچھ اور بڑھ گئی اور بالاخر اس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر تمہاری ایسی ہی
خوشی ہے کہ ہم اس شر سے چلے جائیں تو ہمیں اس میں بھی کوئی عذر نہیں۔ تمہاری یاد تو
بہر حال ساتھ جانے کی اور ساتھ رہنے کی۔ مگر جانے سے پہلے ایک تنہا ہے ' وہ پوری کر دو
بس آخری بار ایک غزل سن لو۔ زندگی میں پھر ایسا موقع کا ہے کہ آئے گا۔

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہ چھوڑ جائیں گے

دور افتادہ بستوں میں کس
تری یادوں سے لو لگائیں گے
جمع ماہ رنجوم مکی کر کے
آنسوؤں کے میلہ جلائیں گے
آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم سنائیں گے

غرض ناز و نیاز کے یہ سلسلے ایک مدت تک اسی طرح چلتے رہے اور بلا تردد وقت آپہنچا کہ ایک بیگانے کی دولت و امارت ان کی محبت کے درمیان حاصل ہو گئی۔ والدین کو لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی۔ دولت نے حسن کو خرید لیا۔ محبت محروم رہ گئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ نامراد چاہنے والا دھک دھک کرنے والے دل کو سنبھالے۔ اس جاں نسل ساعت کا بھٹکا ہے۔ محبوب کو پالنے کے تمام امکانات تھوڑی دیر میں پیش کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کا دماغ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے

آخر کار یہ ساعت بھی قریب آ پہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تک میرا مقدر تھی تری زلف کی شام
کیا قیامت ہے کہ اب فیر کی کھلائے گی
میرے غم خانے میں اب تو نہ کبھی آئے گی
تیری سسی ہوئی مسموم نگاہوں کی لہاں
میری محبوب ! کوئی اجنبی کیا مجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس میں خوشی کے ہنگام
تری خاموش نگاہی کو کیا مجھے گا

تیرے پتے ہوئے انکوں کو ادا مجھے گا
میری دم ساز ! زمانے سے چلی آئی ہیں
ربن غم ، وقت الم سادہ دلوں کی آنکھیں
= نیا ظلم نہیں بیاہ کے حوالوں
ہم نے دیکھیں بوجھ نہیں سادہ دلوں کی آنکھیں
اور وہ لیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

یہ نظم فقط شاعر کے ذاتی تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ سماج کی دھماکی پر ایک دل نشین اور دلچسپی دہی طرحی ہے جو غیر محسوس طریقے پر قاری کو متاثر کرتی اور اسے سماج کی اس زبردستی کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے

آخر شادی ہو گئی۔ دلہن رخصت ہو رہی ہے۔ شاعر کی نگاہوں میں دنیا اندھیر ہے ایک طرف محبوب کی الم نصیبی کا احساس اس کا کلیجہ شل ہوتا ہے۔ ہائے اس ناز پروردہ کا نازک دل کیوں کر اس غم و اندوہ کا تحمل ہوگا۔ دوسری طرف خود اپنے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اپنی نامرادی کا قصور چاہے جہل اور روح فرسا ہے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آ رہے ہیں اور اشعار میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔

رخصتی

تو کلی ، نرہتوں ، نکلتوں میں ملی
چھوڑ کر شر مکی ، سوئے صرا ملی
وہ سلگتا دیا ، تو سر کی کرن
سوچا ہوں کی ، کیسے بیلے کا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بچنے کا دمن
لوگ تجھ کو کیسے گے نصیبوں ملی
تو کلی ، نرہتوں ، نکلتوں میں ملی
چھوڑ کر شر مکی ، سوئے صرا ملی
تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سر

اب کہاں نکلتاں وہ حسین بکڑ
شام غم چھائی ہے دکھتا ہوں جدھر
سکتی دیران ہے آج تیری مکی
تو کلی ، نرہتوں ، نکلتوں میں ملی
چھوڑ کر شر مکی ، سوئے صرا ملی

سستی ساتھ سستی لیلی اور سستی حسین ہے یہ نظم سستی دواں دواں اور خوش آہنگ اور پیر
سستی پر تاثیر معلوم ہوتا ہے کہ گئے دلوں نے علم کو اپنے دل کے خون میں ڈبو کر کھسا ہے۔

اس سانچے کے بعد شاعر کی زندگی کا ایک دور تمام ہو جاتا ہے۔ اب تک صرف تم
 جاہل سے ملتا تھا۔ اس کے بعد تم دور اس سے مقابلہ ہے۔ ایک غریب الدیاد انسان
 بیگانے دلیں میں 'محبت سے محروم' رفاقت کا بھوکا، کسی سارے کی تلاش میں سرگرداں
 ہے اور کوئی سارا نہیں ملتا۔ اس کی فخر سخی 'نود گری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ خوش
 نصیب لوگ مسرور ہیں کہ حوادث روزگار نے ایک نئے اور خوش آئند دور کا آغاز کیا ہے۔
 مگر شاعر کا حس دل اور حقیقت مگر آنکھیں خوشی کو ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں:

گھٹن کی فضا دھواں دھواں ہے کہتے ہیں پیار کا ساں ہے
 بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
 ٹوٹی ہوئی شاخ آسماں ہے
 جس دل سے اہل رہے تھے نئے
 پلوں میں وہ آج نود خواں ہے
 ہم ہی نہیں پائمال تھا
 اے دوست تباہ اک جہاں ہے
 ہاتھ صفت لوگ یہاں خاک بر ہیں
 ہم جو تماشاے سر راہز ہیں
 حسرت سی پرستی ہے در و بام پر ہو
 روتی ہوئی نگیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

مگر شاعر کی خود داری اور غیرت مندی، ہر حالت میں اپنی عزت نفس کی محافظ ہے۔
 اسے دولت کے بوجھ سے نہیں جھکا یا جاسکتا محبت کے زور سے رام کیا جاسکتا ہے۔

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سر بازار
 ہم یوسف کھان ہیں نہ ہم لعل و گھر ہیں
 ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
 ہم نہت مستب ہیں، ہم نود سر ہیں

اسی عالم میں بیٹے ہوئے دلوں کی یادیں اکثر اسے گھیر لیتی ہیں اور اس کا دل حسرتوں میں
 ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ وہ بھگور آزادیاں، وہ محبوب کی پرستاریاں، وہ ننگا آنکس غلوں
 وہ شہر و سخن کی محبتیں، ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور گر جاتی ہیں۔ مگر یہ حسرتیں

’یہ نامزادیاں ہر روز اس کی صلاحیتوں کو نکھار نکھار کے اسے ایک بہترین فنکار بناتی جاری ہیں:

لوگ گیتوں کا مگر یاد آیا
آج پردیس میں مگر یاد آیا
جب چلے آئے ہیں زار سے ہم
انفصافِ مکی تر یاد آیا
ہم زمانے کے حتم بھول گئے
جب ترا لطف نظر یاد آیا
تم بھی مسکورتے اس شب سر بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا
پھر ہوا دردِ تنہا بیدار
پھر دل خاکِ بر یاد آیا
ہم نے بھول گئے تھے جالب
پھر دی راہِ گزر یاد آیا

اور یہ تاثرات آہستہ آہستہ اٹنے شدید ہو جاتے ہیں کہ دل بے اختیار دیارِ محبوب کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ ہر چند کہ محبوب سے ملنے کا کوئی امکان نہیں، کوئی امید نہیں، پھر بھی ایک نامرہوم کشش، تمام فطرات سے بے نیاز کر کے ”ادھر“ چلنے پر مجبور کرتی ہے:

پھر دل سے آری ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا، اس گلی میں چل
وہ بامِ دور، وہ لوگ، وہ رسوائیوں کے ڈھم
ہیں سب کے سب عزیزِ جدا، اس گلی میں چل
اس پھول کے بغیر بہت سی اداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے ذرا اس گلی میں چل
جالب پکارتی ہیں وہ شطہ لوانیاں
یہ سو رت، یہ سرد ہوا اس گلی میں چل

جالب کے اشعار کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جالب کی

روایتِ ادبیات کی حیات اس کے دماغ کی ایجاد نہیں بلکہ حالات کی پیداوار ہے۔ اس نے سوچ سوچ کر دماغ سے مضامین پیدا نہیں کئے بلکہ اپنے محسوسات اور واقعات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کے اشعار میں تاخیر اور سوز و گداز کا بڑا سبب اس کے جذبات کا غلوص اور صداقت ہے۔ حسن بیان کی دلاویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کی تشبیہات میں تازگی اور استعاروں میں ندرت ہے۔ مصرعوں کی چستی، روانی اور خوش آہنگی پڑھنے والے پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ سادگی و پرکاری کے کرشمے جا بجا نظر آتے ہیں۔ بحر میں عموماً ایسی اختیار کی ہیں جو مترنم ہونے کے ساتھ غم آئیں خیالات و حالات کے اظہار کے لئے نہایت سوزوں ہیں اور شدت تاخیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ حسین

ترکیبیں اور ان کا اچھوتا پن قدم قدم پر دامنِ نظر کو تھام لیتا ہے۔ مٹانے کے دوران یہ آہائیاں اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اس لئے میں ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتا۔ اس زمانے میں جب کہ صحتِ زبان کی طرف سے عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ”برگ آوارہ“ شروع سے آخر تک زبان کی افلاط سے پاک ہے۔ پوری کتاب میں وہ شعر ایسے نظر آئے جو قواعدِ زبان کی رو سے مکمل نظر ہیں۔

”برگ آوارہ“ کا افلاطِ زبان سے پاک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والا زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے اور اس کے صحیح استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ”برگ آوارہ“ کو جالب کی ”آپ بچی“ کہنا یقیناً درست ہے۔ جہاں سے کھولیں، جہاں سے پڑھیں، اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ اب میں ”برگ آوارہ“ سے چند اشعار نقل کرتا ہوں اور اربابِ ذوق کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہوں

شاید بقیہ نیست وہ ساعت نہ آئے
تم داستانِ شوقِ سنو اور سنائیں ہم
بار آگے چلی بھی جی جی مگر جالب
ابھی نگہ میں وہ لالہ زار بھرتے ہیں
اس گلی میں کیا کھویا، اس گلی میں کیا پایا
تخنہ کام پہنچے تھے، تخنہ کام لوٹ آئے
بھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شر کی نکلیاں
ڈھونڈتا ہوا سورج تیرے ہوئے سامنے
اک عمر رہے محترم مددِ بہادران
اک عمر رہے لکھنؤ، تیش، خام رہے ہم

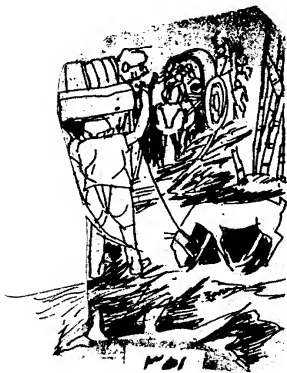
اس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
 اس پھول کو پھولنے میں بھی ناکام رہے ہم
 اجنبی دلوں میں پھر رہے ہیں آوارہ
 اے ہم جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں
 تیرے بام و در سے دور تیری دیکھار سے دور
 رات کی سیاہی ہے ' تیرگی کے سائے ہیں
 اس نگاہ سے جالب رسم و راہ کی خاطر

میرے نزدیک جالب اساتذہ فزل کا شاعر ہے۔ اس لئے میں نے اپنے تاثرات کے اظہار کو صرف اس کی فزل تک محدود رکھا ہے۔ جالب کی فزل کے متعلق دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے یہاں انفرادیت نمایاں ہے۔ مضامین و خیالات میں بھی اور طرز ادا میں بھی۔ اور اس انفرادیت کی وجہ وہی ہے کہ اس کے یہاں جو کچھ ہے حال ہے قال نہیں ہے اور ہے بھی تو برائے نام۔ اس کے اشعار اس کی منکوم آپ جتی ہیں۔ انفرادیت پھر اور پوچھ قسم کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جالب کی انفرادیت مستحسن ہے 'مضمون نہیں۔ آج اردو فزل کو شعراء کا شمار مشکل ہے۔ ان سب کے کام میں یکسانی پائی جاتی ہے اور اس یکسانی کا سبب یہ ہے کہ وہ اکثر رسمی اور تقلیدی فزل کہتے ہیں۔ نہ خیالات ان کے اپنے ہوتے ہیں نہ طرز ادا مقررہ مضامین کو مقررہ سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک قالب پہ سانچے سے جو چیزیں نکلیں گی وہ لازماً یکساں ہوں گی۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک ہی مادے سے تیار کی گئی ہوں۔ جالب کا مواد بھی اپنا ہے اور مواد کی مناسبت سے سانچا بھی اپنا۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جالب نے اپنی فزل کو داخلی واردات کے بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی حالات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان موضوعات پر اس کی طنزیہ نقیص خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں بھی جالب کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ میں اس مضمون کو "برگ آوارہ" کی سب سے پہلی فزل پر تمام کرتا ہوں۔

دل کی بات لیوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سکتے ہیں
 ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت کیا سادوں کا مینہ ، موسم نے نظریں بدلیں
 لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسوں پتے ہیں
 ایک نہیں آوارہ کتا ، کوئی بڑا الزام نہیں
 دنیا والے دل واہوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
 جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لئے بدنام ہوئے
 آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں
 وہ جو ابھی اس ریزہ سے چاک مگیاں گزرا تھا
 اس آوارہ دیوانے کو جاب جاب کہتے ہیں



قصور گردیزی قفس در قفس

ایک روایت ہے کہ حیدر آباد سنٹرل جیل ہو۔ اس میں مقدمہ سازش چل رہا ہو سیاسی گھٹان میں سے ایک سیاستدان ملک کا کوئی نامور شاعر ہو وہ جیل میں کوئی کلام مرتب کرے تو جیل کے کسی ساتھی کو ہی اس کا پیش لفظ لکھنا ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں کڑا اپنے سیل نمبر ۱۹ کی صفائی کر رہا تھا تو جب جالب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ان کے نئے مجرمہ کلام ”گوشے میں قفس کے“ کا پیش لفظ لکھنا ہوگا۔ جالب صاحب کو انکار کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ دوستی کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں میں نے اپنی بے چارگی کو چھپاتے ہوئے اس پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا مگر مٹھیاں بیچنے کے باوجود ایک ایک کر کے میرے ہاتھوں کے سب چھوٹے بڑے طوطے اڑ گئے کیونکہ مشاعرے میں اٹھ کر کسی شعری دلو دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ داد دینے والا محض واجبی ما شعر کہتا ہے اور مجمع بحر حمد شہلی کی طرح ہر سکون اور سستیاں ہوتا ہے تو سامعین میں سے کسی ”صاحب ذوق“ کی پہلی پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اٹھ کر داد دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر پھر چار سو سو کا عالم دیکھ کر کچھ کھینچنے بھی ہوتے ہیں اور کپڑے جھانک کر پھر اپنی نشست پر لڑھک جاتے ہیں ادب عالیہ کے حلق اپنا بھی کچھ ہی عالم ہے۔ خیر جالب صاحب تو حکم فرما کر واپس اپنے سیل میں چلے گئے اور میں اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے غیر سے اس کام کی انجام دہی کے لئے کبھی ایسے موزوں آدوی کی تلاش میں رہا جس پر جالب صاحب بھی متفق ہو جائیں۔

ہم لوگوں کو ۳۱ اپریل ۱۹۷۶ء کی صبح کو ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ہم اسلام آباد میں اپنے کسی عزیز کی بیٹی کی شادی سے فارغ ہو کر صبح گاڑی میں مسلمان رکھ کر گورنمنٹ ہوٹل میں سینٹ کے لیڈر آف اپوزیشن جناب محمد ہاشم خان غلظتی کو الوداع

کہنے کیا تھا۔ غزنوی صاحب اسبلی کے لئے تیاری فرما رہے تھے۔ اور ساتھ ہی اپنے چند
 تدریساتوں کے سامنے حالات حاضرہ پر سیر حاصل تبصرہ کر رہے تھے کہ ایف آئی اے کے
 ایک آفیسر صاحب سفید کپڑوں میں نمودار ہوئے۔ میں نے معاملہ کی نوعیت کا اندازہ کر لیا
 وہ مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیئے اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئے
 غزنوی صاحب نے بکمال شفقت انہیں سمجھانا شروع کر دیا کہ وہ آج اسبلی میں ایسا
 ریزولوشن پیش کریں گے کہ سرکاری جنہوں کے پاس جواب ہی نہیں ہوگا۔ آفیسر صاحب نے
 سرکوشی میں مجھے کہا کہ میں انہیں ان کی آمد کے متعدد آگاہ کردوں۔ میں نے عرض کیا
 غزنوی صاحب آپ آج اپنا ریزولوشن پیش نہیں کر سکیں گے۔ ہاں مجھے دیر ہو رہی ہے اور
 مجھے ابھی نماز بھی ہے، یہ کہہ کر وہ ہنگ سے اٹھنے لگے۔ میں نے عرض کیا۔ حضور آپ
 زیر حراست ہیں۔ انہوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسا کہ میں کوئی پولیس آفیسر ہوں اور
 آج تک ان سے اس بات کو چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں اور
 سینئر سید حسین شاہ صاحب بھی زیر حراست ہیں اور یہ کہ میں کوئی سلطان گواہ نہیں ہوں۔
 پولیس آفیسر نے اٹھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے مشن سے آگاہ کیا۔ دوسری صبح ہم
 جیل پر سوار کراچی کی طرف روانگی کے لئے تیار تھے کہ خان عبدالولی خان سالہ سے اپنی
 گارڈ نسیت آن پہنچے اور ہمراہ ہو گئے۔ میں اس وقت جب ہمیں گرفتار کیا گیا۔ حبیب
 جالب لاہور میں اپنے گھر میں جف ماتم بچائے اپنے بچے کی رسم سوئم پر فاتحہ پڑھتے ہوئے
 دھر لئے گئے اور کراچی ایئر پورٹ پر ہم سے پہلے حاجی غلام احمد بلور، امیر زاہد خان
 سمیت موجود تھے۔ جب سب حیدر آباد سنٹرل جیل کے گیٹ پر پہنچے تو دروازہ کھپکھپ بھرا
 ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام قیدی بیک وقت پہنچے ہیں۔ افراتفری کا عالم تھا،
 بیشتر حضرات دیگر جیلوں سے لائے گئے تھے۔ نوجوان قیدی انتہائی نعرے لگا رہے تھے۔
 زندانیوں کو سیل الاٹ کئے جا رہے تھے، دو دو چار چار کی ٹولیاں میں ادھر ادھر تقسیم کیا جا رہا
 تھا۔ ارشاد ہوا کہ جالب اور گردیزی صاحب کو پھانسی کی کوفڑیوں کی طرف لے جاؤ۔ اپنا
 تو خیر اڑنے سے پیشتر ہی دمگ زد تھا۔ جالب صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ پھانسی
 کے معاملے میں آخر غلط کیوں کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب
 نہ تھا۔ ہم جب احاطے میں پہنچے تو کراچی کے نامور ہیر سٹر عزیز اللہ شیخ پہلے ہی کھلے آسمان
 تلے بیٹھے انجم شامی میں مصروف تھے۔ انہوں نے پرجوش استقبال کیا۔ کچھ دیر بعد جناب
 شیر محمد مری بھی اپنے ساتھیوں سمیت آ پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے احاطہ کھپکھپ بھرا گیا اور پھانسی

کی ان کوششوں پر ایک ہوش کا گمان ہونے لگا۔ حقیقت میں ان کوششوں کا طبع بدل دیا گیا تھا اور وہاں عوام کی سولت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ روٹی اور مکان کی حد تک تو ہم لوگ مطمئن تھے۔ البتہ دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ قیدی عین اماطوں میں بند تھے مگر شام تک ایک دوسرے سے لٹنے کی اجازت تھی۔ قیدیوں میں سے میر غوث بخش بڑنجو اور نواب خیر بخش مری پہلے ہی موجود تھے۔ سردار عطاء اللہ کراچی سے لائے گئے اور باقی ماندہ ملک کی مختلف جیلوں اور شروں سے لائے گئے تھے۔ دوسری صبح جیل کے اندر ہی تمام ملزمان کو اسٹیشن کورٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا جس کی سماعت بمحال جاری ہے جیل میں دو ازحائی ماہ گزر چکے تھے۔ جب حبیب جالب نے مجھے پیش لفظ کہنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے میں کسی موزوں آدمی کی تلاش میں تھا۔ ادھاب سکندر خان خلیل اور محمد افضل خان صاحب شاعری سے زیادہ بیہوش میں دلچسپی لیتے تھے۔ کرنل سلطان احمد صاحب کے سامنے اگر شعر پڑھا جائے تو وہ شیروں کے شکار کی داستان بیان فرما دیجئے۔ میر گل خان قصیر کسی ترجمہ کے سلسلے میں موزوں الفاظ کی جستجو میں رہجئے۔ جناب شیر محمد مری تو خیر خود ہی شیر تھے ان سے گورنر جنک پر تو بات کی جا سکتی تھی شاعری میں ان کی دلچسپی محدود تھی۔ ہمارے سیلوں کی قطار میں پنجاب کے ہمارے سچے کرنل لطیف افغانی تھے۔ جو سری نگر کے محاذ پر اپنا لہوا منوا چکے تھے مگر بد قسمتی سے اردو پر انہیں اتنا ہی عبور حاصل تھا جتنا مجھے اور قارئین کرام کو لاطینی زبان پر ہو سکتا ہے۔ بستی میں تعلیم پائی اور پنجابی زبان بھی بھول گئے۔ اگلے سیل میں جناب عزیز اللہ شیخ تھے۔ سندھی میں ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کا اوزار تھا بھوٹا 'باقی تمام زبانوں پر انہوں نے جیل کے تین ماہ ہی میں عبور حاصل کیا۔ قرآن کریم مع تفسیر پڑھ لیا اور میں بھی ان سے مستفیض ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ گھنٹہ فی کتب کے حساب سے پڑھتے دیوان غالب اور کلام اقبال پر ایسا عبور حاصل کیا کہ جب غالب کے شعر پڑھتے تو دل دھل جاتا۔ کوئی شعر بھی ایسا نہیں تھا جس کی انہوں نے صحیح نہ فرما دی ہو۔ غالب کو تو خیر چھوڑیے مگر اقبال کا ایک صبح شدہ شعر آپ بھی سن لیجئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا خود بندے سے اگر پوچھے کہ میاں اب تو بتا یہاں تیری رضا کیا ہے۔ میں تو خیر ان کا دماغ تھا۔ انہیں داد دے ہی دیتا مگر جالب صاحب قمر آلود نگاہوں سے دیکھتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ میں ایک میزبان اور قیدی ہونے کی حیثیت سے کہاں جاتا۔ ظاہر

سے بیٹے پر ہاتھ مار کر داد دیتا رہتا۔ ایک مرتبہ جالب صاحب میرے بیل میں بیٹھے ایک صبح موزوں کر رہے تھے۔ زمین کچھ اس قسم کی تھی۔ سردار آگے، وغیرہ شامت اعمال کہ شیخ صاحب آگے اور انہوں نے سن لیا۔ انکسار سے فرمایا۔ جالب صاحب اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چند جملے تجویز کرتا ہوں اگر آپ ان میں سے کوئی موزوں کر لیں تو شعر جیساں ہو جائے گا۔ دراصل آپ انتہائی شاعر ہیں۔ اور یوں بغیر کسی مزاحمت کے سردار آجائے اچھا نہیں لگتا اور پھر جالب صاحب سے جواب موصول ہوئے بغیر فرمایا۔ وار پر دسی پکڑ کر چڑھ گئے اور دوسری طرف سے کود گئے۔ ”یا“ وار پر سپاہی کو دھکا دے کر علاقہ بمسٹ کو تھپڑ مار کر بھاگ گئے۔ اور کہنے ہی والے تھے۔ کہ جالب صاحب دونوں ہاتھوں سے سر قدام کر دووانے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی تو دل کا مریض تھا۔ میں نے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ کر رحم کی اپیل کی۔ شیخ صاحب نے ہنسا شروع کر دیا۔ یہی ادب پر کسی کی اجارہ داری تو نہیں۔ یہ کہہ کر چپنے لگے اور اسنے ہنپے کہ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مگر اس کے بعد ادب پر ان سنے تجربات کو انہوں نے اپنے بیل تک محدود رکھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہی جالب صاحب کے حکم کی اپنی بساط کے مطابق قہیل کروں گا۔ ہمارے کردہ میں اہل علم و دانش کی کسی نہ تھی۔ مگر زبان کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر کے حیات کا دیباچہ لکھنا سعادت سے کم نہیں جو انسانی عقلیت اور سہانہ سی کے لئے کوچہ یار کو خیر یاد کہہ کر سونے وار خوشی خوشی جائے اور اسے خون دل سے منور رکھے۔ جالب کی مجبوریوں ناممکنانہ اور اس پر یہ حوصلہ اسے اپنے دور کے شعراء میں یقیناً ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ کوئی جالب کو معمولی آدمی کہے تو شوق سے مگر وہ انمول ہے۔ جالب کو دور جدید کی ڈیڈ میسی سے چر ہے وہ جو کہتا ہے۔ برطا کہتا ہے۔ جالب کے کلام میں اشارہ یا کنایہ کم ہے۔ اگر کہیں اشارہ ہے تو وہ سبک میل کی طرح واضح منزل کا پتہ دیتا ہے۔ جالب عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا طرز کلام اتنا سادہ اور آسان ہے کہ زبان زد خاص و عام ہے۔ جالب کے کلام کو خالصتاً ادبی معیار پر تو کوئی ادیب ہی پرکھ سکتا ہے مگر میں ایک ادنیٰ سیاسی کارکن ہونے کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل کے مورخ کو وطن عزیز کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے کے لئے جالب کے کلام سے جتنا مواد میسر آئے گا وہ شاید اس دور کے معدودے چند نامور دیوں کے حصے میں آئے۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ سیاسی جلسوں میں جالب کو اسٹیج کے قریب پاکر لاکھوں عوام کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ کسی لیڈر کو دیکھ کر نصیب نہیں

ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ جب کسی صاحب نے میں احمد فیض سے شکایت کی کہ جالب اپنے آپ کو بڑا عوامی شاعر کتا ہے اور آپ پر بھی فخرے کئے سے باز نہیں آتا تو وہ مسکرا دیئے اور کہا کہ ”بھئی کیا حرج ہے اسے بات کرنے کا حق تو دینا چاہئے۔ دلی دکن سے لے کر مجھ تک کسی بھی شاعر کو سامعین کا اتنا مجمع میسر نہیں آیا جتنا جالب کو میسر آیا ہے۔ فراق گوز کچھوری نے ایک عرصہ ہوا نکلنے کے مشاعرے میں جالب کی ایک غزل سے متاثر ہو کر سامعین کے سامنے داد دیتے ہوئے فرمایا۔ میرا ہائی کا سوز اور سوراں کا نقد جب سیکھا ہو جائے تو اسے جالب کہتے ہیں۔

جالب کی ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کم وارد کیا دیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ ذرا ایس دور کی بات کریں جب جالب ایک غیر اہم پڑھتا تھا۔ جالب کا خاندان عزیزی دور میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ سلاطین غزنی آتے جاتے رہے۔ مگر پٹانوں کا یہ قبیلہ ہندوستان کی وسیع اور عریض وسعتوں میں کھو گیا اور بے شمار دیگر فوجی قبائل کی طرح بیٹھ کا ہو گیا۔ فروری ۱۹۳۸ء میں جالب ضلع ہوشیار پور کی تحصیل دسہہ میں سماںی افغان میں پیدا ہوئے اور وہیں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی جو شاعر بھی تھے۔ دلی جاکر ملازم ہو گئے اور اس دوران جالب کا تمام خاندان دلی منتقل ہو گیا۔ جالب صاحب میٹرک تک اینگو عربک اسکول اجیری گیٹ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دلی میں لڑکھن ہی میں اپنے بھائی کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد خن دیتے اور دلی کے شعراء کے کلام سے متاثر ہوتے رہے۔ پندرہ برس کی عمر میں کلاس دوم میں استاد نے طالب علموں سے جب وقت سحر کو بخار دینا استعمال کرنے کے لئے کہا تو جالب نے فی البدیہہ ایک شعر کہہ دیا۔۔

دعہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم

دعہ جن کو دیکھتے وقت سحر ہوا

استاد چونک پڑے اور جالب کو دل کھول کر داد دی۔

دعہیں ہو گئیں خطا کرتے

شرم آتی ہے اب دعا کرتے

یہ شعر بھی اس ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ جالب جگر مراد آبادی سے بے حد متاثر ہوئے۔ جگر مراد آبادی کی شاعری اور آئن کی درویشانہ حیثیت کدائی میں جالب کے لئے اتنی پناہنیت تھی کہ ایک طویل مدت تک وہ اس سے محروم رہے۔ تقسیم ہند کے بعد جالب

خاندان سمیت کراچی میں آباد ہوئے۔ اگرچہ کراچی ایک عرصہ تک اردو شعرا کا مرکز رہا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کی فضا ان کو راس نہ آئی اور وہ اکیلے لاہور کی جانب روانہ ہوئے لاہور میں زلف کوامہ بے آسرا بے یار و مددگار جالب کو ہر شب نیا میزبان میسر آتا مگر بعض اوقات کوئی بھی اس کی پذیرائی نہ کرتا اور غالب اس دور نے ان کے ذہن پر احساس محرومی کا ایک مستقل نقش چھوڑا اور بیعت معاشرے سے بغاوت پر مائل ہوئی۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے۔ ان دنوں ایک مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مشاعرہ عروج پر تھا۔ جالب کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پڑھی۔

دل کی بات لیوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سستے ہیں
ہم نے سنا تھا اس لمبی میں دل والے بھی رہتے ہیں

سامعین نے کھڑے ہو کر داد دی۔ اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی صاحب سے تعارف ہوا اور انہوں نے جالب کو گلے لگایا۔ لاکل پور کے ایک مشاعرے میں جگر صاحب نے جالب کی ایک غزل سن کر جالب سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر میرا شراب خوری والا دور ہوتا تو میں مشاعرے میں رقص کرنا شروع کرتا۔ کراچی میں قیام کے دوران جالب متعدد شعراء سے متعارف ہوئے جن کی صحبت میں وہ کھڑے مگر پاکستان میں جالب آزادی، خوشحالی کے متلاشی تھے جو انہیں کیس نظر نہ آئی اور آہستہ آہستہ ان کے سب سامنے خواب بکھر گئے اور وہ بکھر گئے اور وہ سب کچھ تیاگ کر باقی ہو گئے۔ انہیں کیس سکون میسر نہیں آیا۔ اس دوران ان کی سندھ کے مشہور کسان رہنما حیدر بخش جتوئی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ عرصہ ان کی رہنمائی میں سندھ ہاری تحریک میں کام کرتے رہے۔ مگر یہاں بھی انہیں کسانوں میں غربت افلاس اور مجبوریوں نے جھجھوڑا اور وہ پھر لاہور آ گئے۔ چند روز کی بے سرو سامانی کے بعد انہیں روزنامہ آفاق میں جناب سید نور احمد صاحب نے پچھتر روپے ماہوار پر پروف ریڈر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ جالب کو اس حقیر معاوضے کے لئے قریباً بارہ گھنٹے روزانہ دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا۔ لاہور کے معزز بزرگ سید اولاد علی شاہ صاحب گیلانی مرحوم نے جالب کو ایک مستقل مسان کی حیثیت سے گھر میں رکھ لیا اور کمال شفقت سے اپنے صاحبزادے سید کاظم شاہ صاحب کی طرح دیکھ بھل کرتے رہے۔ جالب اس خاندان کا جس حدیث سے ذکر کرتے ہیں۔ اس سے حائر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اتفاق کی بات ہے کہ شاہ صاحب کا قیام اپنے مورث اعلیٰ کے مزار کے قریب تھا۔

جہاں وہ انکے قیام پذیر تھے یا کاظم شاہ صاحب آکر رہتے تھے۔ اس مکان کا راستہ شاہی
 محلے سے گزر کر جاتا تھا۔ جالب ہر شب اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے مکان پر
 جاتے اور عام طور پر پولیس کا کوئی مستعد اہل کار انہیں دھر لیتا اور شاہ صاحب ان کی صفائی
 پیش کرتے رہتے۔ ۵۰ء کا زمانہ تھا۔ ملازمت کے بعد آپ نے سلسلہ تعلیم جاری رکھنے
 کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔ کم محظاہ تعلیم اور ملازمت کے
 بوجھ نے جالب کو ہرا دیا۔ ایک روز شاہ صاحب نے جالب سے دریافت کیا کہ چٹا کوئی ایسی
 ملازمت نہیں مل سکتی جو دن ہی کو ختم ہو جائے اور ہر رات کی اس پریشانی سے نجات مل
 سکے۔ حس جالب دل برداشتہ ہو گیا اور چند دن بعد تعلیم اور ملازمت کو چھوڑ کر رشتہ سسر
 باندھ کر لاہور کو خیر ہاؤس کر پھر کراچی پہنچ گیا۔

اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
 کس شر گیا چھوڑ کے لاہور کہیں گیا
 خدا جانے شر لاہور کی شاہراہوں، گلیوں اور کوچوں میں کیا کشش ہے کہ جالب صاحب
 کراچی میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور ۱۹۵۶ء میں کراچی سے لاہور آکر مستقر آباد ہو گئے۔
 اگرچہ مکان کی ایک کشادہ سڑک اور صاف آبادی میں ان کے خاندان کا ایک مکان ہے مگر
 مکان کے احباب کے تقاضوں کے باوجود جالب لاہور کی ایک گلی میں کرایہ کے ایک مکان
 میں قیام پذیر رہے۔ ایک رات نصف شب کے بعد میں نے حیدر آباد سنٹرل جیل میں ان
 کے سیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ جالب جاگ رہے ہیں۔ میں نے
 یو پی ان کے اندر میرے سیل میں جھانکا۔ انہوں نے مجھے آواز دی۔ معذرت کر کے آگے
 بڑھ گیا۔ دوسری صبح جالب ہنسنے پر مجھے اپنی غزل سنا رہے تھے۔۔

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
 پیچے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
 محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
 لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

جالب صاحب نے لاہور پہنچنے ہی سیاست کی راہی خارِ زار میں قدم رکھا۔ ان کی
 شاعری کا انداز بدل گیا۔ قلموں کے لئے کیت لکھے اور سرکاری بنگلوں کے اختیارات کا ایک
 ایکہ دروازہ ان پر بند ہوتا گیا۔ اور ملت محترمہ قلمِ جلیق کے انکیشن کے موقع پر جب ان

کی قائد مستی عروج پر تھی اور گپ اندھیری رات میں جب آمريت کے تند و تیز بکولے
 لوہان کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جالب جسورت کا چراغ لئے عوام کو گلی گلی پہنچ کر طلوع
 سحر کی نوید سنارہے تھے۔ ایسے دور میں ان کو جو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا اندازہ صرف
 ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ اپنی آمريت دور اپنی تمام تر دشت اور برصرت کے ساتھ
 پاکستان کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ مری کا ایک مشاعرہ تھا۔ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر صدارت
 فرما رہے تھے۔ بیشتر وزراء حضرات کی وجہ سے مشاعرہ درباری رنگ پیش کر رہا تھا۔ جنس
 محمد منیر صاحب کے علاوہ پاکستان کے بیشتر ادیب بخت و کشادہ موجود تھے۔ مشاعرے کا آغاز
 ہوا۔ مشاعرے کے منتظمین حضرات جالب کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ سید
 محمد جعفری صاحب عریف جبل پوری اور جناب شوکت تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔
 منتظمین نے ان حضرات کو یکے بعد دیگرے مانگیرد فون پر بلا کر مشاعرے کو نکتہ زعفران بنا
 دیا۔ شوکت تھانوی صاحب کے فوراً بعد منتظمین نے جالب صاحب کو اسٹیج پر بلایا۔ صاف
 عیاں تھا کہ جناب شوکت تھانوی کے فوراً بعد کسی سنجیدہ نظم یا غزل کا رنگ نہیں ہے گا۔
 جالب نے اعلان کیا حضرات میں پہلی بار اپنی نظم دستور پیش کروں گا۔ منتظمین کو کچھ بھائی
 نہ دیا۔ جب جالب نے نظم شروع کی تو منتظمین میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر کہا کہ یہ
 موقع نہیں جالب چلائے۔ بیٹھ جائیں میں موقع پرست نہیں ہوں۔ دوسرے لمے جالب
 کہہ رہے تھے۔

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
 میں نہیں ملتا میں نہیں جانتا

بس پھر کیا تھا مجمع بے قابو ہو گیا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آمر اور اس کے ہم نوا عوام
 کی عدالت میں پیش ہیں۔ نظم ختم ہوئی تو جالب مشاعرے سے باہر آئے اور مجمع ایک
 جلوس کی صورت میں ان کے ہمراہ ہولیا۔ ادیب بخت و کشادہ کے رنگ فن اور چہرے درد
 پڑ گئے۔ دوسری مرتبہ جالب صاحب نے یہی نظم ملتان میرے گھر میں محترمہ فاطمہ جناح کی
 موجودگی میں پڑھی اس نظم کی وجہ سے جالب صاحب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے وہ
 مزید گھر گئے۔ ملک بھر میں ایک ہائی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور بیسوں سے
 سلسلہ دار و رسن شروع ہوا۔ بار بار درجنوں ان پکھ لئے کھلا رہا۔ جالب ایک عوامی شاعر
 کی حیثیت سے پکھانے جانے لگے۔ دور اپنی کے آخری سالوں سے آج تک جالب مسلسل
 صلابت و دشت اور برصرت کا شکار ہیں مگر اب انہیں قافوں اور عروجوں سے خوف نہیں

محسوس ہوتا۔ جالب اب اپنے معاشرے کے ماحول ختم کرنے کا عہد کئے ہوئے ہیں۔ دور جدید کے فرعون اور قارون نہ تو اسے خوف زدہ کر سکتے ہیں اور نہ خرید سکتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کی انگلیوں کی تحویل کے لئے جو مشکل کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے شاید اس منزل پر پہنچنے تک ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئے۔ جالب کا پہلا مجموعہ کلام ”برگ آوارہ“ چوہدری عبدالحمید صاحب مالک مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کیا۔ چوہدری صاحب ایک شریف النفس انسان ہیں جن کا خاندان اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ خود بھی شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ”شام صحرا“ چھپ کر مقبول ہوا۔ آپ نے کسی محفل میں جالب صاحب کو سنا اور ”برگ آوارہ“ کی اشاعت کا ذمہ لے لیا۔ چوہدری صاحب نے ”سر متقل“ بھی شائع کی اور اس کی وجہ سے جالب کی معیت میں تھانے کا منہ دیکھ آئے۔ ”عہد ستم“ پبلشرز ہیشنگ ہاؤس کے روڈ ملک صاحب نے شائع کی اور اب چوہدری صاحب ان کے مجموعہ کلام ”گوشے میں قفس کے“ کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

زیرِ فکر مجموعے کی ہر نظم اور ہر غزل یا قطعہ حیدر آباد منٹرل جیل میں لکھا گیا۔ جالب جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے۔ عام طور پر مجھے اس روز سرگوشی میں سنائی دیتے تھے۔ اس لئے میں ان کا ہم قفس ہونے کی حیثیت سے اس ماحول اور فضا سے آشنا ہوں اور ہر شعر کے محرکات کا مکمل احساس رکھتا ہوں۔ ذرا آپ بھی دیکھئے کہ مسعود سعد سلمان کا یہ جانشین ہم شب کی تاریکی میں کس طرح نقد سرا ہے اور روزانہ زندان سے طلوع صبح فردا کا منظر دیکھ رہا ہے جالب نے آنے والے دور کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔

کسی لہجے سے نہ مجموعہ سماعت ہوگی
جمل کے باز اٹھانے نہ چڑیں گے ہم کو
پاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چمکائے گا
اُس کے دھپ بجھانے نہ چڑیں گے ہم کو
ختم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اٹھے گی
صبح فرخندہ جنیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت

جالب کی ایک غزل کا مطلع اور مطلع ملاحظہ فرمائیے اور جس ماحول میں یہ غزل لکھی گئی اس کے عکس کا تصور کیجئے تو یقیناً آپ بھی میری طرح اس سے لطف اندوز ہو سکیں گے مگر

حقیقت تو یہ ہے کہ جالب کے اس مجموعہ کلام کا کوئی بھی شعر لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں۔ یہ ہمارے زخم خوردہ معاشرے کے خلاف ایک زہر آلود طرہ ہے مگر یہ تو دقت ہی بتائے گا کہ شاعر کے ہاتھ قلم ہوں گے یا وہ اپنی روش بدلے گا۔

یہ منصف بھی تو قیدی ہیں ہمیں انصاف کیا دیں گے
 لکھا ہے ان کے چروں پر جو ہم کو فیصلہ دیں گے
 ہمارے قتل پر جو آئیں ہیں خاموش کل جالب
 بہت آنسو بہائیں گے بہت داد و دعا دیں گے

مگر جالب اپنا لہجہ بدلنے کو تیار نہیں کیونکہ انہیں اصرار ہے کہ

بہت مشکل مری پہچان ہوگی
 بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجہ

اس ضمن میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں

دنیا ہے کتنی ظالم بنتی ہے دل دکھا کے
 پھر بھی نہیں بھائے ہم نے دیئے دعا کے
 نامہ اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
 کھاتے رہے ہیں پھر ہم آئینہ دکھا کے
 خاموشی پر ہیں لوگ ذرا عجب
 اور ہم نے تو بات بھی کی ہے
 کہتے تھے کہ اب کوئی نہیں جاں سے گزرنا
 لو جاں سے گزر کر انہیں مٹا تو گئے ہم

آئیے ذرا ایک بار آپ کو پھر مشعل جیل خیدر آباد کے اندر کی سیر کرائیں۔ اس میں خوف کی کوئی بات نہیں۔ گو باہر بہت اونچی دیواریں ہیں جن پر برقی روکی تاریں نصب ہیں اور ان دیواروں کے اندر اور باہر شب و روز مستعد چاقو و چھریر کا قتل دتے مستعین ہیں۔ لوہے کے بلند و بالا آہنی دروازے کے اندر اور باہر پلوادی چہرے نظر آئیں گے۔ ایسے چہرے آپ کو کسی مغربی فلم کے جنگی مناظر میں نظر آئیں گے۔ آپ ایسا محسوس کریں گے کہ شاید یہ چہرے ہماری تہذیب اور کلچر سے بھی آشنا نہیں مگر ایسی بات نہیں یہ اپنے ہی بھائی ہیں اگر یہ بولیں تو ہماری ہی زبان بول سکتے ہیں۔ کچھ چہرے آپ کو اس طرح

گھوڑوں کے گویا آنکھوں سے انکسے شین کا نام لے رہے ہیں مگر اندر ان تین بیروں میں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ آپ کو قفسے سالی دیں گے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں میں گیت گائے جا رہے ہیں۔ ادب پر سبائے ہو رہے ہیں۔ سیاست پر سینار ہو رہے ہیں۔ کسی شہید کا دن منایا جا رہا ہے یا ہر کسی بتاؤنی خوشی پر دعوت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ سینے میں ایک مرتبہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ہر تیسرا آدمی شاعری فرماتا ہے بلوچی زبان کے معروف شاعر گل خان نصیر اور حبیب جالب کے علاوہ باقی تمام حضرات ادب پر کرانے یا فخری اسٹائل کے داؤدار تھے ہیں مگر خاطر احباب کے لئے کم از کم سبحان اللہ کہتا پڑتا ہے اور عام طور پر زیادہ داد اسی کو دی جاتی ہے جس کا کوئی شعر سمجھ میں نہ آئے سوائے اردو شعراء کے باقی ہر شاعر کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اردو ہی رابطہ کی زبان ہے۔ ہر شام خان عبداللہ خان کے احاطے میں والی ہال کھلا جاتا ہے۔ کچھ پیار لوگ سردار عطاء اللہ مینگل کی قیادت میں ایک طرف کرسیاں بچھا کر محفوظ ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہال کسی پیار کے سرگت ہے تو کسی کی میٹک کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ اس احاطے میں ایک گروہ صوفیائے بخش برنجو کے جلو میں شطرنج کھیل رہا ہے اور ان حضرات کے انشاک کا یہ عالم ہے کہ جب تک گپ اندھیرا نہ ہو جائے۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ دوسرے احاطے میں شیر محمد صاحب مری برآمدے کے سامنے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کے قریب میز لگائے اپنی محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ قونے کا دور چل رہا ہے۔ سراج محمد خان سے مبارک ہو رہا ہے۔ سردار خیر بخش مری جج کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ محم عزیز بیگم صاحب کا قفسہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ حضرات چڑیا گھر کے شیر کی طرح دیوار کے ساتھ جھڑی سے آگیا رہے ہیں۔ ان کے دروش کے انداز کو دیکھ کر ذرا سی بے بسی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس احاطے کے دوسرے برآمدے کے سامنے کونے کے ڈاکٹر صلیت اللہ خان صاحب اپنی محفل جمائے بیٹھے ہیں اور کچھ نوجوان بیٹے ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کونے سے پشتو یا بلوچی کا نغمہ بلند ہوتا ہے کچھ دیر بعد کچھ اور ساتھی مل جاتے ہیں اور یہ کورس تیلیوں کی قہاں میں اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ برآمدے کے آخری کونے میں بلوچی خانے کے سامنے والے چوتھے پڑاؤ پر قریب سلطان محمد 'جناب پرویز سلیم' عبدالجید صاحب اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ چارباٹوں پر بیٹھے چائے کی پیالی پر شازایات اور فنی ملازمت کے زمانے کے دلچسپ قصے سنارہے ہیں اور ہر گزرنے والے کو چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ انکی شریقی رنگ کی چائے

نے ہنر چائے کہتے ہیں کی پیالی چھوٹی سے چھوٹی اور اس میں شکر زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ چائے اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ کزور آدمی کے جسم میں ٹھنڈی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ مختار کا یہ عالم کہ رات گئے تک کام و دھن اس کے ذریعے سے لذت یاب رہتے ہیں۔ وہ چائے اس شفقت سے پیش کرتے ہیں کہ شکر کا مریض نہیں کر سکتا اور ہوا لسانی کر کر چڑھا جاتا ہے۔ شیر محمد مری صاحب کی میز سے چھ گز آگے برآمدے کے سامنے جالب صاحب اکیلے بیٹھے ایک درخت کو دیکھ رہے ہیں۔ جنہاں ایک کوسل کا بھرا ہے۔ وہ کو کو کرتی رہتی ہے۔ جالب صاحب کے خیال میں "بیابا" نکار رہی ہے اور وہ شاید ان کے گیتوں کا مواد مہیا کر رہی ہے مگر میں اس سے بیزار ہوں۔ میرا بس چلے تو پتھر پھینک کر اسے اڑا دوں مگر نیل کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں اور پھر جالب صاحب کا مصرع مجھے بار بار یاد آتا ہے۔

دنیا ہے کتنی خالام ہستی ہے دل دکھا کے
کوسل جتنا چاہے تنگ کر لے مگر شعراء کو تو ضرور افسانہ کرتی ہے اور پھر ایک معصوم
برآمدے کو روڑا مارتے ہوئے سلطان باہو کا یہ مصرع بھی یاد آ جاتا ہے۔

نازی مار اڑا نہ ہاںو اسیں آپے کڑن ہارنے ہو

جالب صاحب جیل کے ابتدائی چند ماہ اس دنسے کہو کہ ان کے جواں سال بچے کی موت ان کے لئے ایک سانحہ تھی۔ اس مجموعہ کلام میں کئی جگہ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کبھی کبھی محفل کو اپنے لطائف سے گفت و مضامین بناتے مگر پھر مجھ جاتے اور یکا دو جاتی کہ بعض اصحاب کے لئے معر بنے رہے ہیں۔ اپنے بچوں سے والہانہ محبت میں بھی وہ نشانے کو بدلتے کی سعی یتیم سے روگرداں نہیں ہوتے۔ نظم ہمیری بچی میں لکھتے ہیں

خیری آشا کی بکھا کھلے گی
چاند کی تھ کو گزیا لے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا حتم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تمہارا

جیل کے تمام عرصہ میں اپنے جواں مرگ بچے کے فم اور چھوٹی بیٹی کی ہدائی کے

احساس نے انہیں اپنی گرفت میں رکھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات کئی کئی دنوں تک وہ خاموش رہتے بالخصوص عید کے دن انہوں نے اپنے بیل کے اندر کی کنڑی لگا رکھی اور شام سے پہلے باہر نہ آئے کبھی کبھی ان کی مہبت میں چڑچاہن پیدا ہو جاتا۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ جالب بظاہر بھولے بھولے اور سیدھے سادھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ آہوئے زخم خوردہ کی طرح اپنے گرد و پیش پر گہری نظر رکھتے ہیں اور بات بات پر چونک اٹھتے ہیں۔ ان کا احمقہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں جس پر احمقہ کرتے ہیں اس سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسی مجموعے میں لکھتے ہیں۔

ہم نے سلوک یاراں دکھا جو دشمنوں سا
بہر کیا دل ہمارا دوائے ہیں منہ چمپا کے
دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کی ہے

اوپر میں نے جیل کے جس ماحول کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پیچھے ہر قیدی کی ایک قدر مشترک ہے۔ ہر دل دکھا ہوا ہر ایک کا گہرا اجڑا ہوا جس پر دہشت و برصیت اور موت کے گہرے سائے ہیں۔ یاد و فکریں و گم شدگان سے دل بوجھل پسماندگان کی بے چارگی و درماندگی کا فکریں ہر درد و دیوار پر مقدس مگر ازاں خون کے چھینٹے اور پھر سامنے تختہ دار کوئی بھی انسان دوست یہ حقیقت ہے تو محسوس کرے گا کہ یہ قیدی منہ چڑا رہے ہیں، استبدادی قوتوں کا یہ اور بات ہے کہ یہاں کا شیعہ مروا گئی ہے یہ ہے کہ کوئی اپنے مصائب اور تکالیف کا ذکر نہ کرے۔ میں نے جیل کے آٹھ ماہ میں کسی قیدی سے اس کی زبان سے اس کی خانہ دیرانی کی داستان نہیں سنی کوئی اس کی غیر موجودگی میں ذکر کرے تو اور بات ہے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے جگر صاحب نے لکھا تھا کہ

زخم پہ زخم کسا کر بھی اپنے لو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لیوں کو سی عشق ہے دل گئی نہیں
میں تو پہلے ہی بیمار تھا صحت بحال کیسے ہوتی آہستہ آہستہ
مرض پڑتا گیا جوں جوں دوا کی

مہبت ہے حد بگڑی تو لیاقت میٹھ نکل کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں چودہ روز ایڑیاں

رکڑتے رہے اور بالا خر ڈاکٹروں کی رپورٹ پر جنات پر رہا کر دیا گیا۔ چند دن بعد جالب صاحب بھی جنات پر رہا کر دیے گئے۔ پانچ ماہ کی شدید علالت کے بعد ذرا بصیرت سنبھلی تو بیٹیا لکھ رہا ہوں۔ جالب صاحب پھر کسی جیل میں ہیں اور ان پر کیا بیت دی ہے۔ بچے میرے ذمہ داری پر دستک ہوئی ہے۔ پولیس مجھے بغیر وارنٹ گرفتار کرنے آئی ہے۔ اجازت دیجئے۔ خدا جانے۔

ہاں مگر چلتے چلتے قزوین طاہرہ کا ایک شمر نئے جاوے



بجرح عشق توام ی کنند دغو غایت
تو نیز بر سرعام آکہ خوش تاشایت



مخدوم علی خان روشن مستقبل شاعر

جب میں نے اسکول جانا شروع کیا تو ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور ہم روز سویرے اخبار میں جنرل ایوب خان کی تصویر دیکھا کرتے تھے۔ ایوب خان کے علاوہ معاشرے میں جن افراد کا وجود پایا جاتا تھا ان میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو بست بولتے تھے اور کچھ وہ جو بولتے ہی نہ تھے۔ بولنے والے المیاء عامہ کے سرکاری ذرائع کا سارا لئے حاکم وقت کی خدمات پر رطب اللسان تھے۔ نہ بولنے والوں میں ہمارے دانشور تھے جنہوں نے ہامنی خاموشی سادہ رکھی تھی۔ رہے سیاستدان تو وہ بھی مندرجہ بالا دو طریقوں میں سے کوئی سا ایک اختیار کئے اپنی ذات اور مفاد کے تحفظ میں مصروف تھے آج عمر کی تین دہائیاں گزر چکی ہیں اور میرے بچے اسکول جانا شروع کر رہے ہیں لیکن جب اپنے اطراف پر نگاہ ڈالتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ وہی فحش کی طرح چلتی زبانوں کا شور اور وہی روح کو لٹک جانے والا سناٹا۔ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے۔ ایسی صورتحال ایک تواتر کے ساتھ پیش آتی رہے، کل کے ہائی آج کے مصاحب بن بیٹھیں، وفاداریوں کا رخ ہوا کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہے اور اس نظام کے خلاف کسی بھی سمت سے صدائے احتجاج بلند نہ ہو یا بلند ہو تو اس میں پائیداری نہ ہو، تو یقین سا آنے لگتا ہے کہ جس عہد میں ہم جیتے چلے آئے ہیں بس یہی صد اقیوں کا دور ہے اور ہماری آنکھوں نے جو دیکھا ہے اور کانوں نے جو کچھ سنا ہے یہی سچ ہے یہ حرف حق ہے۔ لیکن ہر دور میں جبر و استبداد کے خلاف اپنے گریباں کا پرچم بلند کر کے اگر کسی شخص نے ہمیں اس فریب کا شکار ہونے سے بچایا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔ اس نے یہ شعور پیدا کیا ہے کہ محض کامیابی کبھی بھی کسی فرد کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتی۔ اس نے نہ صرف ہمیں گنبد بے در کی محفل کا احساس دلانے رکھا بلکہ ہاتھ میں علم لے کر خود بھی کھلی فضاؤں کی سمت نکل کھڑا ہوا اور ہمیں بھی اس کی ترغیب دتا رہا۔

آج حرف آخر ہے بات چند لوگوں کی
 دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
 اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
 جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی

جالب کا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ اصولوں سے اس کی محبت ابدی ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی
 ان کو قربان کر کے کسی سے معاملت نہیں کر سکتا۔ انہی اصولوں کی وجہ سے نہ وہ چین سے
 کبھی بیٹھ پاتا ہے اور نہ دل کی بات زبان پر لائے بنا رہ سکتا ہے خواہ اسے اس صاف گوئی
 کی پاداش میں کتنے ہی دکھ اٹھانے پڑیں۔ وہ زخم کھا کر مسکرا تو سکتا ہے، قاتل کو معصوم ادا
 لکھ نہیں سکتا۔

دینا پڑے کچھ ہی ہرمانہ، سچ ہی لگتے جانا
 مت گھبرانا مت ڈر جانا، سچ ہی لگتے جانا
 باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بچھ پائیں
 وہ شمعیں روشن کر جانا، سچ ہی لگتے جانا
 پل دوپل کے عیش کی خاطر کیا دینا کیا جینا
 آخر سب کو ہے مرانا، سچ ہی لگتے جانا

سچ کی اس لڑائی میں کتنے ہی ساتھی ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ کون سی صعوبت تھی جو اسے
 اٹھانی نہ پڑی لیکن وہ آج اس شرم میں کل نئے شرم میں لوگوں کی کم نظری اور حقہ گری کی
 پرواہ کئے بغیر اپنا پیغام لئے سرگرداں رہا۔ اس طویل مسافت میں نہ تو اس کے پائے ثابت
 میں کبھی لغزش آئی نہ اس کی ہمت نے اس کا ساتھ چھوڑا، اور نہ ہی اسکی خود اعتمادی کبھی
 حشرزل ہوئی۔

ہم اہل محبت پائیں گے اپنے ہی سارے منزل کو!
 یاران سیاست نے برس پھیلانے ہیں رنگین جال تو کیا

لکھنے بیٹھا تو ارادہ کیا تھا کہ مضمون، حبیب جالب کی شاعری پر تحریر کروں گا شخصیت پر نہیں
 ذکر اس کے فن کا کروں گا سیاست کا نہیں، لیکن جب اوپر کی سطور پر نظر ڈالتا ہوں تو
 محسوس کرتا ہوں کہ جالب کا فن اور اس کی سیاست، اسکی شاعری اور اس کی شخصیت ایک
 دوسرے میں یوں سو گئے ہیں کہ انہیں جدا کرنا اور علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر بیان کرنا
 ناممکن ہے یا کم از کم میری استطاعت سے باہر ہے۔ یہاں پروفیسر کرار حسین کا قول یاد آتا ہے

ہے کہ ”کسی شخص کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کتنا معتمد انسان ہے۔“ انہوں نے یہ اس لئے کہا کہ شاعری زندگی کا حصہ ہے، یہ رگ و پے میں دوڑنے والے خون کی حرارت سے جنم لیتی ہے۔ اس کا شاعر کی ذات سے رشتہ جسم و جاں کا رشتہ ہے۔

ایک گلن کی بات ہے جیون، ایک گلن ہی جیون ہے

ہماری سیاسی تاریخ کا سفر غلط کرنا ہو تو جالب کی شاعری میں سفر کیجئے ہر سوڈ ہر دورا
آکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ جب دور ایلی میں ۱۹۳۳ء کا دستور عوام پر مسلط کیا
گیا اور ہر جالب سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہونے لگیں تو یہ جالب ہی تھا جس
نے بے پائی سے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

وہ جس کا عظمت ہی میں ہے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سامنے میں ہر مصلحت کے لیے
ایسے دستور کو ’صبح بے نور‘ کو
میں نہیں دیکھتا ’میں نہیں جانتا

پھر ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں جب بدور ملت محترمہ قاطعہ جناح، ایوب خان کے مقابلے
میں حزب اختلاف کی مدارتی امید دار نامزد ہوئیں تو جالب بحالی جمہوریت کی اس وسیع تر
لڑائی میں شامل ہو گیا۔ وہ نہ رہے کا طالب تھا نہ عہدے کا خواہشمند۔ آمد صبح باران کی
امید لئے وہ جمہوریت کی اس جنگ میں ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت
سے شامل ہوا تھا۔ اور اسی پر اس کو فخر تھا۔ عوام کے سامنے اس نے اپنی بات ہمیشہ کی
طرح واضح اور دو ٹوک انداز میں کہی۔

اُس طرف ظلم ہے بیداد ہے حق تلفی ہے
اِس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر آجاذ

انتخابات ہوئے اور اسی طرح ہوئے جیسے ہوا کرتے ہیں یعنی اس منفرد انداز سے جو
تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کا خاصہ ہے۔ مگر اس کا ایک ہا واسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام میں

بیداری کی لہر دوڑ گئی اور ایک ایسی تحریک منظم ہوئی جس نے ان ایمانوں میں دراڑیں ڈال دیں جن کی بنیاد علم، بیدار اور حق تلفی پر تھی تب وہ جو تاحیات حکومت کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور تخت پر یوں سکن تھے جیسے اترنا ہی نہیں، عوامی قوت کے ایک ہی ریلے میں خس و خاشاک کی طرح برہ گئے۔

کوئی بھیرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو تیار!
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

تاریخ کے اس موڑ پر ہمارے سیاستدان سجدہ شکر بجالائے۔ ایمان اقتدار میں محض ناموں کی تبدیلی ان کی خوشیوں کے لئے کافی تھی۔ نظام کی تبدیلی کے تصور سے تو وہ خود بھی ہراساں تھے۔ مگر جالب دور بہت دور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے بچے خان کے مراثیم کو بھانپ لیا تھا۔ قذا اس نے بروقت مدد دی۔

تم سے پہلے وہ جو اک محض یہاں تخت لٹھیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا

باہل ناخواسہ معتقد کئے جانے والے انتخابات کے ذریعہ جمہوریت کی راہ ہموار ضرور ہوئی اور عوام کے لمساحے غلبہ بھی ہوئے مگر جالب کی سوچ کس قدر سنجیدگی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگر اب اقتدار کی تنگ نظری اور ہر مسئلے کو طاقت کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت نے ملک کو ایک پر خطر اور خونیں مقام پر لا کھڑا کیا۔ شرقی پاکستان پر جب فوج کشی کا اعلان ہوا تو کتنے لوگ تھے جنہوں نے اس کی مخالفت کی؟ لیکن جالب بخوبی جانتا تھا کہ مسائل محض ہانے سے نہیں ملتے، عوامی انگلیں ٹھکینوں سے کھلی نہیں جاسکتیں تشدد کا جن ایک بار بول سے باہر نکل آئے تو پھر با آسانی بند نہیں ہوتا اور جب باہمی گفت و شنید کی جگہ دشمنی کن کا استعمال شروع ہو جائے تو اتحاد کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں

محبت گزلیوں سے ہو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

جالب کو جزائرشہ تھا وہی ہوا۔ ہم نے منزل کھودی۔ محبت کا زمزمہ آگ و خون کا دریا بن گیا۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں ہر سراقدار آنے والوں میں جالب کے دوست اور اس کے سیاسی سر کے ساتھی بھی

تھے لیکن اس اقتدار سے ' اس حکومت سے اس نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا - نہ وہ کسی نوکری کا طلب گار ہوا نہ کسی اعزاز کا - اس کی دوستی بے غرض تھی اس کی سیاست ذاتی اغراض سے بالاتر - اس کی جدوجہد کا مقصد بحالی جمہوریت تھا خوشحالی خاندان نہیں - اس دور میں بھی وہ غزل سرا رہا -

ایسی غزل کہی نہ کہیں گے تمام مر
انعام و داد جس پہ لے شریار سے
کچھ اور ہو گیا ہے وہ شاعر نہیں رہا
والہستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

ایک دور پھر ایسا آیا کہ دوست زیرِ عتاب آئے - ساتھیوں کی حکومتیں برطرف ہوئیں - قید و بند ' فرضی مقدمات اور جموئی شادقوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا - اس مرتبہ چونکہ دکھ ان سے ملا تھا جن سے اس کی امید نہ تھی تو دل ٹھکنے لگی بھی زیادہ ہوئی مگر اس نے اس حال میں خود کو بھی ہنسائے رکھا اور دوسروں کو بھی سارا دیا ہے -

غم سے مت گھبرا نا ساتھی
ہمت ہار نہ جانا ساتھی

تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا - ایک بار پھر مارشل لاء لگا اور کتنے ہی سیاستداں عوامی تحریک کو چھوڑنے آنے والوں سے کھجوتہ کر بیٹھے - وزارتیں بنیں ' تقسیم انعام و اکرام ہوا مگر جالب حسب سابق اس ہزارے سے دور رہا - وہ جانتا تھا کہ خواہش اقتدار نے رہنماؤں کو ظلم و ستم اور لطف و کرم میں تیز کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے وہ بخوبی آگاہ تھا کہ جمہوریت کی منزل کہنی مارشل لاء کے توسط سے حاصل نہیں ہوتی - وہ تو ہمیشہ سے سمجھتا چلا آیا تھا -

کس دور میں تم رہتے ہو
مرمر کو مہا کہتے ہو
کیوں دشمن جاں کو پل پل
دیتے ہو صدا غداؤں

یہ دولت اور اقتدار کے پجاریوں نے کبھی کسی کی سنی ہے جو اس کی سنتے ۔۔۔

محمد مجید

مانگی ہے ایک مراندھیوں سے روشنی
ہم نے بھی کب ثبوت دیا ہے شعور کا

اس عاقبت نا اہمٹی کے نتائج وہی نکلے جن کا جالب کو خدشہ تھا۔ بندے خدا بن بیٹھے
مگر اس دور میں بھی تمام تر پابندیوں کے باوجود گلشن کی دھواں دھواں فضا میں محبت
جمہوریت اور عوامی حقوق کی بحالی کے ترانے تخلیق کر رہا ہے۔

ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر خم کرتے جائیں گے
مظالم میں اب اپنے آپ کے دیئے نہ جتنے جائیں گے
کشیادوں سے جب تک صبح نے منہ پھیرے ہیں

اپنی جنگ رہے گی

بحالی جمہوریت کی تحریک چلے تو وہ پنجاب کو چگانے کے لئے کوشاں نظر آتا سندھ میں ظلم ہو تو
اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے خواتین اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سڑکوں پر نکلیں تو جالب
انگی مدد کو آگے بڑھتا ہے۔ اس تمام جدوجہد میں اسے نہ اپنی صحت کا خیال ہے نہ ڈاکٹروں کے
مشوروں کی پرواہ۔ وہ تو جس روز اپنی شاعری کو عوامی جمہوریت کی راہ پر لے کر نکلا تھا اس
نے تو اسی دن طے کر لیا تھا کہ

چینی کی دما دینے والے یہ راز تجھے معلوم کہاں
تخلیق کا اک لمحہ ہے ہمت، بیکار بنے سو سال تو کیا

دنیا میں انقلاب بیش انہی لوگوں نے برپا کیا ہے جو مدح سحر کی گھن میں بے خطر آتش
نمرود میں کود پڑے۔ یہی جنہی "یہی دیوانے قوموں کی تقدیر بدلتے ہیں اور تاریخ انہیں
سنہری الفاظ میں یاد رکھتی ہے۔ ڈاں پال سارتر کی مثال لے لیجئے۔ اس کی شاعری اس کا
قلم "اس کے ناول۔ اس کی سیاست ہمیشہ ظلم سے برسرِ پیکار رہے۔ کسی نظریہ سے
اسے خواہ کتنا ہی گمراہ اختلاف کیوں نہ ہو وہ اس پر سرکاری پابندی کے خلاف مدائے
احتجاج ضرور بلند کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر پیرس میں ایک جلوس کی قیادت کرتے
ہوئے اسے جب ایک سپاہی نے کوٹ کے کنارے پکڑ کر گھسیٹا تو سڑک کے کنارے گزری
ہوئی عورت چلائی۔ "تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ شخص کون ہے؟ یہ سارتر ہے" سپاہی
اس قدر غمگین ہوا کہ اپنی لاشی دھیں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بڑے بنے تھے جالب صاحب
گرے سڑک کے بچے
لاٹھی کھائی گلی کھائی
پٹے سڑک کے بچے

جہاں تک جالب کی شاعری کی فنی نزاکتوں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں ناقدین
فرماتے ہیں کہ یہ فن کے تقاضوں پر پوری نہیں اترتی "ان کا کلام جلسوں کے لئے سوزوں
ہے ادبی محفلوں کے لئے نہیں۔ اس کا ادب میں کوئی مستقل مقام نہیں یہاں سوال
یہ ہے کہ کیا کوئی بات اس بات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے جس کا پرچار جالب کی
زندگی کا نصب العین ہے۔ پھر جالب کا تو کچھ انداز ہی یہ ہے کہ وہ بات صاف صاف اور
کھل کے کہنے کا عادی ہے۔ ظلم کو وہ ظلم لکھتا ہے اس کی تشریح کے لئے استعاروں کی
طاش میں گم ہو کر خاموش نہیں ہو جاتا۔

مجھ سے خفیہ ہیں میرے ہم عمر اس لئے
میں داستانِ عہدِ حتمِ کھل کے کہہ گیا

اور پھر ہمارے لئے تو جالب کی شاعری کے بارے میں فیض صاحب کا یہ قول حرفِ آخر
ہے کہ "دلِ دکن سے لے کر آج تک کسی بھی شاعر کو اتنے سامعین میر نہیں آئے جتنے
حبیب جالب کو ملے ہیں" خود جالب بھی اپنی اس پذیرائی کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتا
ہے۔ شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے کہ پاس نہیں ہے بل تو کیا

افتخارِ عارف کا کہنا ہے موجودہ دور کے شعراء کو آنے والی نسلوں کے سامنے ٹامہ ہونے
سے اگر کوئی محض بچائے گا تو وہ حبیب جالب ہے۔ لیکن جالب ہمیں صرف خدمات ہی سے
نہیں بچاتا وہ گہنا نوپ اندھیری رات میں امید کی شمع بھی روشن کئے ہوئے ہے۔ اس کی
شاعری امید کی شاعری ہے۔ وہ یقین دلاتا ہے کہ ظلمت کا مقدمہ جھٹ جاتا ہے وہ نوبہِ دجا
ہے کہ مٹ جائیں گے سب پروردہ شب اور



ہو گا طوع کوہ کے پیچھے سے آفتاب
شبِ مستقل رہے گی بھی یہ نہ سوچنے

ہمایوں گوہر پیش نامہ

اُردو برصغیر ہندو پاکستان میں احتجاج کی زبان رہی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، غیر منظم ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحد رکھنے میں اُردو نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہی سبب تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد اُردو کو قومی زبان کے طور پر اختیار کیا گیا۔ حالانکہ پاکستان کے کسی بھی صوبے کی مادری زبان اُردو نہیں تھی۔ اُردو میں احتجاج نہ صرف شہر میں بلکہ نظم میں اور بھی زیادہ مؤثر اور پختہ وسیلہ اظہار کے طور پر سامنے آیا۔ اس مہدی کے آغاز میں علامہ اقبالؒ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ان کی صحیح صورتِ حال سے آگاہی بخشی اور قومی پہچان اور ملی تشخص کا شعور عطا کیا تاکہ وہ متحد ہو کر برطانوی راج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو سکیں اور اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی صورت گری کر سکیں۔

قیام پاکستان کے بعد فیض احمد فیض نے اقبالؒ کی روایت کو آگے بڑھایا اور خلقِ خدا کے رنج و الم کی حکایتیں اور ایک جمہوری اور عادلانہ نظام کے قیام کے لئے علمی جدوجہد

کا احوال رقم کیا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اظہار کی آزادی پر پابندیاں ہیں اور ابلاغِ
عائق کے ذرائع پر حکومت کا قبضہ ہے اُردو شاعری احتجاج کے ایک ایسے پرائیڈ
کی شکل اختیار کر گئی ہے جو ہر طرح کی سنسرشپ کی پابندیوں سے محروم باقی ہے اور
سُرخرو ہوتی ہے۔ جبر و استبداد کے اس ماحول میں حبیب جالب کی شاعری ایک فریاد
ایک مسلسل چیخ اور ایک متقبل چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

حبیب جالب عام لوگوں کا شاعر ہے۔ وہ خلقِ خدا سے براہِ راست مکالمہ کرتا ہے
بہت سہل اور سادہ مگر انتہائی نوثر لب و لہجے میں۔ یہی سبب ہے کہ اپنے اثر و نفوذ اور عوامی
مقبولیت کے باعث جالب کی شاعری عصری آوازوں میں نمایاں اور مست از نظر آتی ہے۔
جالب کے نئے مزدوروں میں اور کسانوں میں طالب علموں میں وکانداروں میں زندگی کے
سبب شبیوں میں ستائے ہوئے دکھی لوگوں میں شہروں شہروں قریوں قریوں گیوں گیوں
میں اپنا جادو جگاتے ہیں۔ جالب کی زندگی اور شاعری اپنے مقصد پر اس کے ممکن اعتماد کی
آئینہ دار ہیں۔ عوام سے وابستگی اُس کا عقیدہ اور اس سے منسلک رہنا اُس کا مقصد جیسا ہے
”حرفِ سرور“ کی صورت میں ہم حبیب جالب کو عوام کی قوت اور برتری پر فخر مندوں

یقین کے سبب خارجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔



(حرفِ سرور کا پیش لفظ)

شفق نظام

عزت سے جینا ہے اگر تو بیٹ گھٹاؤ مولانا
 امریکہ کی چوکت پر سر کو نہ جھکاؤ مولانا
 کما بیش جگ تباہی ' آنسو ' آہیں دیتی ہے
 کما بیش جگ سے اپنی جان بچاؤ مولانا
 آپ کی جانبداری تو لکھی ہے آپ کے چہرے پر
 آپ کرانے نکلے ہیں کیا بیچ بچاؤ مولانا
 عالی شان مکان بچاؤ غلت بات نوکر چاکر
 کیسے لٹے ہیں ہم کو گر سکھلاؤ مولانا
 اپنے رخ پر درد بجالا اب تو بے بس لوگوں کے
 جب تک جگ خلیج میں ہے سر نہ لگاؤ مولانا



جنگوں سے دور امن سے — انسان کی طرح
 زندہ رہو جہاں میں ایران کی طرح
 اہل عراق بھی ہیں فضیلوں کی شکل میں
 لشکر اگر عدد کا ہے طوفان کی طرح
 نکلے ہیں اس مگر سے بمشکل سفید قام
 آئے جہاں کہیں بھی یہ مسلمان کی طرح
 لوگوں کی کیا رضا ہے کوئی پہچانتا نہیں
 حاکم ہیں میرے دیس کے سلطان کی طرح

اہل ہوس نے دولت دنیا کے واسطے
آبادیاں بنائی ہیں شمشان کی طرح
زردار آج کے یہ ستم گار آج کے
دیتے ہیں اجرتیں بھی ہمیں دان کی طرح
مالک بنے ہوئے میرے گھر کے ہیں ان دنوں
جائب کبھی جو تھے میرے دربان کی طرح



جن کے ہونٹوں پر لگی ہیں ڈالروں کی پیسپاں
”ستم گر کو ستم گر کس طرح کہہ دیں میاں

جنگ نے بغداد کی راتوں کو ویراں کر دیا
کس کے ہونٹوں پر نہیں ’ بربادیوں کی داستاں
جنگ ہجر دوستان ’ قتل سرود نغمہ گر
جنگ شام کرلا ’ کہ و فغاں ’ اٹک رواں

اس طرح اجڑا نہ تھا ’ میرے خیالوں کا جن
خون میں لت پت ہیں پتے ’ دکھ میں ڈوبا ساں

چرو محبوب بھی اچھا مجھے لگتا نہیں
بجھ گئی ہے آرزوئے قربت زہرہ و شاں

چھوڑ دے اتنا سلگتا ’ اے میرے دل چھوڑ دے
کچھ نہ کچھ ہوگا ’ جہاں والے کو بھی فکر جہاں

ہر نفس ان کے حصار مرگ میں ہے زندگی
وہ نے تیری غزل جائب انیس فرمت کہاں



کہاں نسبت انہیں کیجے سے بھائی
 کریں جو بُش کے در پہ جب سائی
 اور جانوں کی شمعیں بجھ رہی ہیں
 اور بپا پنہلوں کی لڑائی
 یہاں آپس میں ہم دست و گریباں
 وہاں باطل سے بچنا آزمائی
 سلامت آپ کی عزت ما آبی
 نہ ہونے دیں وطن کی جگہ ہنسی
 بلا لیں جگہ سے لشکر بلا لیں
 کریں پھر امن کی نذر سرائی
 محبت سے رہے آباد عالم
 نہیں اچھی کسی پر بھی چڑھائی
 بے گما اور کتنا خون انسان
 اری دنیا دہائی ہے وہائی
 شکستہ ساز ہوں میری صدا کیا
 تماشا بن گئی ہے بے نوائی
 بتاؤں کیا ہر کیسے ہوئی ہے
 جو دن مگرا تو غم کی رات آئی





آج پھر تم نظر نہیں آ—
پھر تمنا کے پھول مر جانے

آج پھر سرگوار آنکھوں نے
لا لگن پہ اشک برمائے



نیسری آنکھوں کا عجب طرز سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب بگراں دیکھا ہے

کتے انوار سمٹ آئے ہیں ان آنکھوں میں
اک تبسم تے ہونٹوں پہ رماں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بے کار سمجھنے والو
تم نے کب اس بُتِ کافر کو جواں دیکھا ہے

صحنِ گلشن میں کہ انجم کی طرب گا ہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جس نے کہاں دیکھا ہے

دہی آوارہ و دیوانہ و آشفستہ مزاج
ہم نے جالت کو سہ کھوئے تباں دیکھا ہے

آج پھر عہدِ غم کے افسانہ
میری بے تاب یوں نے پھانے

اس بھرے شہر میں تمہارا پتہ
کس کو معلوم کون بتلائے

بہن دیاروں میں کھو گئے بہن
ہم تاراں کی خاک چھپاں آئے



شہر پہ خوف کے سائے ہیں
یہ کیسے دن آئے ہیں!
روتے ہیں پیاسے نیٹاں
درد کے بادل چھائے ہیں
سوت سے لڑنے والے لوگ
گہرائے گہرائے ہیں
چاند سے چہرے پھول سے لوگ
مڑجائے مڑجائے ہیں
چھوڑ کے ہم اُن گلیوں کو
آوارہ کہلائے ہیں
حال یہ ہے اب تجھ سے بھی
شرائے شرائے ہیں
گئے تھے شہر کراچی مسم
آنسو، آمیں لائے ہیں



بیلیں نہ آنسوؤں سے کھائے سوز کے
بتے رہیں سکون سے دھائے سوز کے
مجھے نہ پائے موج ہوائے یہود سے
اک جوت جگ رہی ہے سہلے سوز کے
دامِ فضا میں پرچم نصرت سہے بلند
مولیٰ رہی نہ ہیں نظارے سوز کے
عجبے کا ہے خیال تو عقبہ کا ساتھ دو
نئے ہوتے دلوں کی نیت کا ساتھ دو
ناٹہ ہر ایک توڑ کے اڑ گئیوں سے آج
خود دار ہو تو مشرقِ دہلی کا ساتھ دو
مغرب کے اہلزن کا جنوں پھر ہے جوش پر
گراں چاہتے ہو تو دنیا کا ساتھ دو



ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا
چہرہ کو گہر دھو کر دور کر گیس کو صبا کیا لکھنا
آتش پر پابے غم غم میں گھٹتا ہے گہر بڑا میں
اک شخص کے ہاتھوں میں سے رسوا ہے وطن کیا بھریں
اے دیدہ رو اس وقت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا

حق بات یہ کوئے اور زندان ہاں کے شکنجے میں ہے ہیں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خوشخوار منہ میں قصاں
اس غم و غم کو طعنت کر کم اس کہ کو دو کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا

یہ اہل حشم یہ دارا و حشم نقشب بر آب میں اے بہم
بٹ جائیں گے سب پڑو شہلے اہل قار جا بیٹے ہم
جو جاں کا زلیں پر دستاں کو مصدوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا

ہر شاہ یہاں شاہ اور اہل سید نہ رستے نمایاں
جس شہر کی دمن میں نکلے تھے وہ شہر ادا کیا کہاں
صحر کو جہنم بن کر کشن بادل کو روا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پر ہی ہم نے جاں داری کی ہم نے انہی کی غزازی
بہتے ہیں تو ہمیں پہنچتے قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست شن کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے نکلا و ظلمت پہ نہ اپنا فن داڑ
میں سڑوں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یار
وشتے میں ہیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بہنے کو خدا کیا لکھنا



ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
لیکن ان دونوں ملکوں میں امریکہ کا ڈیرا ہے

ایڈ کی گندم کھا کر ہم نے کتنے دھوکے کھائے ہیں
پوچھ نہ ہم نے امریکہ کے کتنے نماز اٹھائے ہیں
پھر بھی اب تک وادیِ گل کو سنگینوں نے غیر ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے
خان بہادر چھوڑنا ہو گا اب تو ساتھ انگریزوں کا
ساپ گریباں آپہنچا ہے پھر ہے ساتھ انگریزوں کا
میکین تیرا نہ ہوا تو کینینڈی کب تیرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

یہ دھرتی ہے اصل میں پیارے مزدوروں بھائیوں کی
اس دھرتی پر چلنے کی گئی مرضی چند گھرانوں کی
ظلم کی رات ہے گی کب تک اب نزدیک ہو رہا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے



نام چلے ہر نام داس کا کام چلے امریکہ کا
مور کھاس کر کش میں ہیں سوج نہ ڈھلے امریکہ کا
نر جن کی آنکھوں میں آنسو آج بھی ہیں اور کل بھی تھے
بتلا کے گھر دیوالی ہے تیل جیسے امریکہ کا
دنیا بھر کے مظلوموں نے بحیدرہ سارا جان لیا
آج ہے ذرا زرد اردوں کے سائے تلے امریکہ کا
کام ہے اس کا سوا بازی سارا زمانہ جانے ہے
اسی لئے تو مجھ کو پیارے نام کھلے امریکہ کا
غریبے بل بوتے پر جینا مردوں والی بات نہیں
بات تو جب ہے اے جانبِ احسان نے امریکہ کا

اشک آنکھوں میں اب میں آئے سے
بات چیتی نہیں چپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرانے سے



اشکوں کے جگنوؤں سے اندھیرا نہ جانے گا
شب کا حصار تو زحر کوئی آفتاب لا
میر عہد میں رہا ہوں میں لوگوں کے دہلیاں
میری مثال نے کوئی میرا جو ب لا



وطن فروش

اصول بیچ کے مسند خریدنے والو
نگاہ جسل و فانیں بہت حقیر ہو تم
وطن کا پاس تمہیں تھا نہ مجھ کے کاہلی
کہ اپنی حرص کے ہنسد مجھے میر ہو تم



آج اپنا ہے نہ کل تھا اپنا
کیوں کہیں تاج محل تھا اپنا
ایسا اُجڑا نہ ہوا پھر آباد
ہاں جو اک شہر عزت تھا اپنا



صحافی سے

اب شعر دی ہے اے جالب جس پر کوئی افسر جھوم اٹھے
کراہی منزل سے ہم لہ نہ دفتر کا دفتر جھوم اٹھے
جینا ہے اگر اس بستی میں لے دست قصیدہ خواں ہو جا
اخلا میں لکھ ایسی باتیں صاحب کا سکر جھوم اٹھے



ابھی اے دوست ذوق شاعری ہے وچر رسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام کہیں گے
اگر اب بھی ہمارا ساتھ تو لے دل نہیں دے گا
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکسلا چھوڑ جائیں گے



صد شکر

اہلِ ہستم کے حلقہٴ بگوشوں میں مسم نہیں
صد شکر ان غیر نشوونوں میں مسم نہیں



خاشی سے ہزار غم سنا
کتنا دشوار ہے غزلِ کبنا



دکھ اٹھانے میں ہے کمال ہمیں
کر گیا فنِ یہ لازوال ہمیں



غم یہاں پر وہاں پہ شادی ہے
مسئلہ سارا اقتصادِ یہی ہے



کے خبر تھی ہمیں راہِ برہی کوئیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ ہے



ہوا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا اختصار کیوں کرتے



میں بھی بوں تری طرح سے آوارہ و بربکار
اڑتے ہوئے پتے بے ہمراہ لئے چلی



ہم اُن بجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے تجھیں فخرِ آسمان ہم نے





نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہارا آئی پہنے حنزاں کا لباس

گھنی چھاؤں میں دُکھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو
رفیقو کہیں ٹوٹ جائے اس

شہر سے بستی سے دیرانے سے جی گھبرا گیا
اے جنوں تیرے برانے سے جی گھبرا گیا

اک مکمل خامشی اک بکراں گہرا سکوت
آج محراب کا بھئی دیوانے سے جی گھبرا گیا

پھر گئے جالِ رنگا بوں میں کئی اُڑے چمن
موسم گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

دوستو مشورے نہ دو صدم کو
مشوروں سے دماغ جلتا ہے
یہ کسی نے غلط کہا تم سے
ان کھلونوں سے جی بہتا ہے



ویار بزنہ دگل نے نکل کر
دل و جان نذرِ صحرَا ہو گئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنسی جبین
گفتنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں



دوب جائے گا آج بھی خورشید
آج بھی تم نظر نہ آؤ گے
بیت جائے گی اس طرح ہر شاخ
زندگی بھر ہمیں رُلاؤ گے

فصل فرار آئے گی

ذہلے گی شامِ سخنِ نذرِ آئے گی
ہم آئیں گے تو جن میں بہا آئے گی
امیدِ عہدِ ستم کے گماشتوں نے کچھ
ہٹائے ساتھ ہی فصلِ بہار آئے گی

تجھے پایا کہ تجھ کو کھو دیا ہے
یہ اکسٹر سوچ کر دل رو دیا ہے
ہمارا داغِ دل جائے نہ جلے
ترا دامن تو صدم نے دھو دیا ہے



تیری بستی میں جدھر سے گزرے
ہٹے کیا لوگ نظر سے گزرنے
کتنی یادوں نے ہمیں تھام لیا
ہم جو اُس راہ گزر سے گزرنے



جنوں کے بس میں ہے میرا بھری جالِ وطن
وہ ظلم اس پر ہوئے ہیں کہ ہے شمالِ وطن
اسے ربانی ملے تو مری رھائی ہو
ازل سے ہے میری صورتِ خرابِ حالِ وطن



جہاں آساں تھا دن کو رات کرنا
دو ٹھکیاں جو گنتی میں ایک سپنا
اب ان کی یاد ہے پکوں پر روشن
اب ان کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا



بچ کہے کے کسی دوز میں بچھٹے نہیں ہم
 کردار پہ اپنے کبھی شرم کے نہیں ہم
 زنداں کے دروہا میں دیرینہ شناسا
 پہنچے ہیں سدا رگوں کے نہیں ہم

سو گئے انجم شب * یاد نہ آ
 اے مری جان طرب یاد نہ آ
 مری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
 کوئی آنسو نہیں اب یاد نہ آ

*
آدم جی ایوارڈ

سیہ انساں کا یارو
 زخم سے اب یا نہ بے
 اپنی تو بس دوز ہے یہ
 آدم جی ایوارڈ ملے

*
اے لوگو!

شیوخ و شاہ بھی کب ہیں سے یاد لے لوگو!
 ہمارا خون پیتے ہیں یہ سب مکار اے لوگو!
 یہ تخت و تاج والے غاصبوں کی مصیبت میں
 ہمارے راستے کی یہ بھی ہیں دیوار اے لوگو!

*

راستہ رنگ

ذہانت رو رہی ہے من چپائے
 جہالت قبیحہ برسا رہی ہے
 ادب پر افسردہ کا ہے لفظ
 حکومت شاعری فسر رہی ہے

*

رنگ و بوئے محب کہہ لوں گا
 موج جسم شرم کہہ لوں گا
 لوگ کہتے ہیں تیرا نام سن لوں
 میں تجھے ہاتھ بک کہہ لوں گا

*

زلزلہ کی بات کیے جاتے ہیں
 دہلی کو یوں رات کیے جاتے ہیں
 چند آنسو ہیں انہیں بھی جالت
 نذر حالات کیے جاتے ہیں

*

سبزہ زاروں میں گزرتھا اپنا
 مس و شاہاب نچرتھا اپنا
 جب اٹھتا ہے کوئی محفل سے
 یاد آتا ہے کہ گھسرتھا اپنا

*

غریبوں کا گلشن جلا ہی کرے ہے
خدا جو کرے ہے بھلا ہی کرے ہے
نہیں جس کو آنا مفت نہ بنا
یونہی ہاتھ اپنے ملا ہی کرے ہے



عزم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چسپاں ہے
صورتِ شمع چل سکو تو چلو



شہرِ بد طلبا کے نام

فضا میں اپنا بندھ جس نے سہی اچھال دیا
ستم گروں نے اسے شہر کے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صبح کے رستے پر خود کو ڈال دیا



آج کل

قانونِ اصل جبر نے ایسے بنا دیئے
لڑاں عدالتوں کے ترازو میں آج کل
مسند نشیں ہوئی ہے تہِ تابِ شیطنت
انسانیت کی آنکھ میں آنسو ہیں آج کل



کوچہ صبح میں جسا پہنچے ہم
صورتِ موج صبا پہنچے ہم
نزدتِ گل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے ابلہ پا پہنچے ہم



کہتے خادوش تھے چپ چاپ تھے رستے گلیاں
یہ زمیں بول اٹھی میت کے سخن سے یار
ملک میں عام کریں اپنے قلم کی دولت
یہ گزارش ہے مری اہل سخن سے یار



لبریز جامِ درو تہہِ جسام کو لکھو
حسنِ تمامِ بختی ہوئی شام کو لکھو
وجہِ نشاطِ نشرِ آلام کو لکھو



مٹی ہو گھٹیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دُعا کرتے
چاند تارے بھی اُن کالے جالے
تھر تھراتے ہیں سامنا کرتے



وہ کنارِ جزا سلامتیں گئیں
ساتھ ان کے چاندنی راتیں گئیں

دل عجب قبضوں میں اب ہے مبتلا
گیسو و رخسار کی باتیں گئیں

ہر اک شاخِ منتِ جلّٰی ہے
مری بندِ دلِ مجھ پر چل رہی ہے
اگر کہتے ہیں ہم قاتلِ کو قاتل
تو ان کو بات یہ کیوں کھل رہی ہے

رسم آتا ہے

ہر ایک شاخِ پہرِ برقِ تپاں ہے قص کناس
فضائے صحنِ چمنِ تجھ پہ رسم آتا ہے
قدمِ قدم پہ یہاں پر ضمیر کہتے ہیں
مرے عظیم وطنِ تجھ پہ رسم آتا ہے

مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھ
راہوں میں بھی کبھی اس نگاہ کا معیار
یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالت
دین درو نہیں ہیں یہ بستیاں یہ دیار

میں تو سوچ ہوں ستارے مرے آگے کیا ہیں
شبے کیا شبے سہلے مرے آگے کیا ہیں
جو ہمیشہ ہے شاہوں کے ثنا خواں جالت
وہ سخن ساز بچائے مرے آگے کیا ہیں

نت نئے شہرِ نت نئی دنیا
ہم کو آوارگی سے پیار دھا
ان کے آنے کے بعد بھی جالت
دیر تک ان کا انتظار دھا

برقِ پاشی

نظرِ جگمگے نوکِ بزمِ بایوں کی برعاشی پر
توجہ ان دنوں ہے شیخِ صاحب کی فحاشی پر
سگلتے ہیں نشین اور غرض شاخوں سے مبتلا ہے
مشوش ہیں فقط وہ بس بلا کی برقِ پاشی پر

میں خوش نصیب شاعر

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب سارے
بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب سارے
بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالب
میں خوش نصیب شاعر اور بد نصیب سارے



ہر لوانہو س ہے مقبرہ یاد و نایاں
ہر راہزن ہے راہبرد میسر کارواں
ہر اہل زربہ ہے خاک نشینوں کا تر جہاں
لوگ اپنے قاتلوں کے ہیں عشاق میر جہاں



احمد ریاض کی یاد میں

پہلے ہی اپنا کون تھا اے دوست
اب جو تو ہو گیا جدا اے دوست
ساتھ کس نے دیا کسی کا یہاں
ساری دنیسا بے وفا اے دوست
تو جلا شمع کی طرح سہرزم
نور تھا تیرا ہم نوا اے دوست
کتنی خوش بخت ہے زمیں وہ بھی
اب جو دے گی ترا پتا اے دوست
یہ زمانہ ہے شعر کا دشمن
اس زمانے کا کیا گلا اے دوست
صبح آئے گی لے کے وہ خورشید
جس پہ تو ہو گیا فدا اے دوست ❀

بیادِ جوش

حسن ناصر

ہم نے دل سے تجھے سدا مانا
تو بڑا احتسا تجھے بڑا مانا

میز و غالب کے بعد انیس کے بعد
تجھ کو مانا بڑا بجا مانا

تو کہ دیوانہ صداقت تھا
تو نے بندے کو کب خدا مانا

تجھ کو پروا نہ تھی زمانے کی
تو نے دل ہی کا ہر کہا مانا

تجھ کو خود پہ تھا اعتماد آتنا
خود ہی کو تو نے رھنما مانا

کی نہ شب کی کبھی پنہ پائی
صبح کو لائقِ شرف مانا

ہنس دیا سطحِ ذہن عارف
جب کسی بات کا بُرا مانا

یوں تو شاعر تھے اور بھی اے جوش
مہم نے تجھ سے دوسرا مانا

نزا ہو ہمیں دیتا ہے یہ پیام کہ ہم

نہام دہریں لہر لہریں من کا پرچم
تجھے نظر ہی رکھیں تیرے راتے چلیں

سر زمانہ کریں سامراج کا سر خم

نہ تجھ کو اور نہ تری سوچ کو بھلائیں گے

ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر

ترے خیال و نظر کے دیئے جلائیں گے

یہ رہزنیوں کی حکومت تھی نہیں یارو

ہر ایک چہرے سے پڑھ ہیں اٹھانا ہے

ہماری جنگ ہے بے گناہت

ہیں دوام ہے ہم کو جہاں پہ چھاننا ہے

ہم آ رہے ہیں ہم آئیں گے ہم ہی آئیں گے

ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر

ترے خیال و نظر کے دیئے جلائیں گے ❖

نذر سآھر

یوں وہ ظلمت سے رہا دست و گریہاں یارو
اس سے لرزاں تھے بہت شرب کے گہاں یارو

اُس نے ہر گام دیا حوصلہ تازہ ہمیں
وہ نہ اک پل بھی رہا ہم سے گریزاں یارو

اس نے مانی نہ کبھی تیرگی شربے شکست
دل اندھیروں میں رہا اس کا فروزاں یارو

اس کو تھی کشمکش دیر و حرم سے نفرت
اُس سا ہندو نہ کوئی اس سا ملہاں یارو

اس نے سلطانی جہو کے نغمے نکلے
روح شاہجہاں کی رہی اس پکریاں یارو

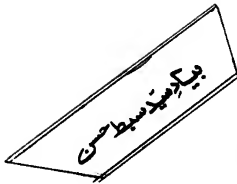
اُس کو ہر حال میں جینے کی ادا آتی تھی
وہ نہ حالات سے ہوتا تھا پریشاں یارو

اپنے اشعار کی شمعوں سے اجلا کر کے
کر گیا شب کا سفر کتنا وہ آساں یارو

اُس نے ہل سے نہ تازلیت کیا سمجھوتہ
دہر میں اُس سا کہاں صاحبِ ایماں یارو

اُس کے گیتوں سے زمانے کو سنواریں آؤ
روحِ ستآھر کو اگر کرنا ہے شاداں یارو





تہذیب تھا، شعور تھا سبھ حسن تمام
وہ کیا اُٹھا کہ خواب ہوئی اجن تمام
اُس کو کہاں تھی چند غلوں کی بستا عزیز
اُس کو تو آرزو تھی کہ بچے چسپن تمام

اُس کی نگارشات سے بڑھتی رہے گی بات
ہوگا نہ ارقصہ کا کہی بانکہ بن تمام

سیکھیں گے اور بھائیں گے کیسے کریں حیات
اُس کے خیال و فہم سے اہل سخن تمام

یہی ہے ذہیت اُن کے قدم اُس نے سچ کہا
ڈرتے نہیں ہیں موت سے جب مرد و زن تمام

فاصلہ نہیں رہیں گے وہ کیا خوب کہ گیا
انہیں گے جب مناسب زدہ خستہ تن تمام

چہرہ چاہے اُس کے نام کا جالب گلی علی
جاگے ہیں اُس کی سوچ سے کوہ و دین تمام



زود چٹاؤں تو مہنت سے نہانے والا

اب کہاں کوئی مرے تاز اُٹھانے والا

نہر کے پل جاتے ہیں دربار میں ب اہل قلم

کون اب میری طہت سسر نہ ٹھکانے والا

عمر بھر وہ بھی رہا قصر نشینوں سے الگ

دامِ دربار میں وہ بھی مہمان آنے والا

سکرافوں کا رہا وہ بھی ملازم نہ مشیر

اُس کو اتنا مہتا کہجساں کام زمانے والا

خواب میں محو مہتا خاموش پڑا مہتا کیسے

خواب سے سارے زمانے کو جگانے والا

میں بھی ہوں آپ بھی ہیں کون مگر افسس جیسا

دشمن تاجِ دریاں تختِ بگرا نے والا

زود فتنِ بزمِ چہاں نہو نہی رہے گی جالب

کچھ مگر اور مہتا وہ رنگ بمانے والا



بیادِ فراق

مہم پرانا بہت نیا تھا فراق
اک عجب رمز آشنا تھا فراق

بیادِ فیض

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں
موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں

ہم جس وقت نے وہ شاہِ سخن چھین لیا
ہم کو وہ وقتِ الم بھولنے والا ہے کہیں

تیرے اشک اور بھی چمکائیں گے یادیں اسکی
ہم کو وہ دیدہ نم بھولنے والا ہے کہیں

کبھی زنداں میں کبھی دور وطن سے دست
جو کیا اُس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں

آخری بار اُسے دیکھ نہ پائے جانب
یہ مُقَدَّر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں



دور وہ کب ہوا تنگاہوں سے
دھڑکنوں میں بسا ہوا تھا فراق

شامِ غم کے سلگتے صحرا میں
اک امند ثقی ہوئی گشتا تھا فراق

امن تھا پیار تھا محبت تھا
رنگ تھا نور تھا نوا تھا فراق

فاصلے نفرتوں کے مٹ جائیں
پیار ہی پیار سوچتا تھا فراق

ہم سے رنج و الم کے ماروں کو
کس محبت سے دیکھتا تھا فراق

عشقِ انسانیت سے تھا اس کو

ہر تعصب سے مادرِ اتم تھا فراق



لِیَا

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیٹے ہیں دن زین ہمارے

تیسری اگر آواز نہ ہوتی
بجھ جاتی جیون کی جوتی

تیرے سچے سر ہیں ایسے
جیسے سورج چاند سہمے

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیٹے ہیں دن زین ہمارے

تجھ کو سن کر جی اٹھتے ہیں
ہم جیسے دکھ درد کے مارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیٹے ہیں دن زین ہمارے

کیا کیا تو نے گیت ہیں گائے
سُرجب لاگے من بھک جائے

میرا ہتھ میں آن بسی ہے
انگ وہی ہے رنگ وہی ہے
جگ میں تیرے داس ہیں اتنے
بختے ہیں آکاش پر تارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیٹے ہیں دن زین ہمارے



(عیدِ تہہ میل میں لکھی)

میراجی

گیت کیا کی مکھ گیا، کیا کیا فسانے کہہ گیا
نام یونہی تو نہیں اُس کا ادب میں رہ گیا

ایک تنہا رہی اُس کی انیسویں زندگی
کون جانے کیسے کیسے دکھ وہ تنہا بہہ گیا

سوز میرا کا ملا ہی کو تو میرا جی بنا
دلنشیں رکھے سخن اور دھڑکنوں میں رہ گیا

درد بیتنا بھی اُسے بیدار دُنیا سے ملا
شاعری میں ڈھل گیا کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا

اک نئی پُجیسے زیادہ اک عجب ڈھبے جیا
اک مکھ اٹھا کر جس نے دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا

اُس سے آگے کوئی بھی جانے نہیں پایا ابھی
نقش بن کے رہ گیا جو اُس کی رہ میں بہہ گیا



نذر مصحفی

اک شخص باضمیر مرایا مصحفی
میری طرح وفا کا پرستار مصحفی

رہتا تھا کج کلاہ امیروں کے دریاں
یکسر لیے ہوئے مرا کردار مصحفی

دیتے ہیں واغیر کو کب اہل لکھنؤ
کب داد کا تھا ان سے طلبگار مصحفی

نافذی جہاں سے کسی بار آئے تنگ
اک عمر شعور رہا بے زار مصحفی

دربار میں تھا بار کہاں اس غریب کو
برسوں مثال میسر پھرا خوار مصحفی

میں نے بھی اس گلی میں گزاری بچوں کے عمر
ملتا ہے اس گلی میں کے پیار مصحفی



نذر مارکس

یہ جو شب کے ایوانوں میں اک بچل اک حشر پاپا ہے

یہ جو اندھیرا سمٹ رہا ہے یہ جو اچالا پھیل رہا ہے

یہ جو ہر دکھ سہنے والا دکھ کا مداوا جان گیا ہے

مظلوموں مجبوروں کا غم یہ جو مرے شعروں میں ڈھلا ہے

یہ جو مہک گلشن گلشن ہے یہ جو چمک عالم عالم ہے

مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم —



نورجہاں

ہجومِ یاس میں جوت آس کی تری آواز
ہم اہل درد کی سہے زندگی تری آواز

بلوں پہ کھلتے رہیں پھولِ شرو و نمبر کے
نفساں میں رنگِ بکیرے یونہی تری آواز

دیارِ دیدہ و دل میں بے روشنی تجھے
ہے چہرہ چاندِ مدھر چاندنی تری آواز

ہونا زکیوں نہ مُقتدر پہ اپنے نورِ جہاں
تجھے قریب سے دیکھا سنی تری آواز

زمٹ کے گا ترانامِ رہتی دنیا تک
رہے گی یوں ہی سدا گوِ نجاتِ تری آواز



یوسف کا مَران

او جھل ہوا ہے جبکہ وہ چہرہ بہارِ سا
عالمِ تمام گنگے نگا ہے غنبارِ سا

وہ کیا اٹھا یستینِ زمانے سے اُٹھ گیا
وہ تھا تو اس جہاں پہ تھا کچھ اعتبارِ سا
کذب و ریا سے اُس کا کوئی واسطہ نہ تھا
جیتا وہ کس طرح سے یہاں بن کے پارِ سا

اس سے ملے بغیر نہ آتا تھا ہم کو چین
رہتا تھا وہ ہمارے لیے بے فتنہ ارِ سا

بھس کو دکھائیں داغ کہیں کس حالِ دل
اب کون اس جہاں میں ہے اس غمگسارِ سا

اس سے دیارِ دیدہ و دل تھا چین چین
وہ تھا جو ایک اُس کا ہمیں انتظارِ سا

لے کے پھیرے میں دل کو ہشتِ بلاغ میں
سایہِ نعلِ سکا کہیں دیوارِ یارِ سا

دُشوار کب تھے اس کی رفاقت میں مڑے
جالت نہیں ملے گا کوئی اپنے یارِ سا



شہرِ دہلی

دیارِ داغ و بجزوہ شہرِ دہلی چھوڑ کر تجھ کو
نہ تھا معلوم یوں روئے گا دلِ شام و سحر تجھ کو
کہاں ملتے ہیں دنیا کو کہاں ملتے ہیں نیامیں
ہوئے تھے جو عطا اہل سخن اہل نظر تجھ کو
تجھے مرکز کہا جاتا تھا دنیا کی نگاہوں کا
محبت کی نظر سے دیکھتے تھے سب نگر تجھ کو
بقولِ مہرِ اوراقِ مصور تھے ترے کوچے
مگر ہائے زمانے کی لگی کیسی نظر تجھ کو
نہ بھولے گا ہماری داستاں تو بھی قیامت تک
دلائیں گے ہماری یاد تیرے دہکڑ بچھ کو
جو تیرے غم میں بہتا ہے وہ آنسو رشک گوہر ہے
سمجھتے ہیں متاعِ دیدہ و دلِ دیدہ در تجھ کو
میں جالبِ دہلوی کہلا نہیں سکتا زمانے میں
مگر سمجھا ہے میں نے آج تک اپنا ہی گھر تجھ کو



لال پور

لال پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
 دھڑکن دھڑکن ساتھ ہے گی اس سبکی کی یاد
 مینھے بولوں کی وہ بکری گیتوں کا سنار
 جنتے بٹے جانے وہ سستے نغمہ ریز دیار
 وہ گلیاں وہ پھول وہ گلیاں رنگ بھکے بازار
 میں نے ان گلیوں پھولوں گلیوں سے کیا ہے پیار
 برگ آوارہ میں بکھری ہے جس کی روداد
 لال پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

کوئی نہیں تھا کام مجھے پھر بھی تھا کتنا کام
 ان گلیوں میں پھرتے زمانہ کو کرنا شام
 گھر گھر میرے شعر کے چپے گھر گھر من نام
 راتوں کو دلیروں پر ہی کر سنا آرام
 دکھ سہنے میں چپ ہے میں کتنا شاد
 لال پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

میں نے اس بکری میں کر کیا کیا لکے گیت
 جتنے کارن لوگوں کے من میں ہے میری پریت
 ایک لگن کی بات ہے جیوں کیسے ادا ورجیت
 سب سے مجھ کو ہا یہ ہے جالب سب میں میرے میت

داد تو ان کی یاد ہے مجھ کو بھول گیا ہے داد
 لال پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد



اک شاہِ سخن

اک کٹیا دِچ پیامِ ہیا اک شاہِ سخن
دُنیا جنوں کہندی سی دامن، دامن

ہوِ رال دا لگوں اودہ درباری بنیا نیں
بھل کے دی شاعرِ سگری بنیا نیں
لوکاں اُتے وار گیا اپنا جیون

اک شاہِ سخن

اودہ سے شعرِ ستم گاراں نوں کھلے ہے
ٹوٹاں دِچ دِلوے اودہ سے بلے رہے
کردا روے گا اودہ سے اُتے ناز و ملے

اک شاہِ سخن

اک مجبورِ عورتِ دِاگیت

ایہہ گھٹنگرو نیں زنجیراں نیں
دنیا نے پیرس پاتیاں

ایہہ چھنکدیاں رُسواتیاں

نیں سندا کوئی دُہاتیاں



اک نظم

امریکہ توں جنگ اوندی اے

امریکہ توں جنگ اوندی اے
بھکھ اوندی اے ننگ اوندی اے

روٹی پکڑا پھت نیس اوندی
چہریاں تے رنگت نیس اوندی
تاپ اوندی اے کھنگ اوندی اے
امریکہ توں جنگ اوندی اے

امن، محبت، پیار نیس اوندی
کوئی اوتھوں غم خوار نیس اوندی
اوتھوں بارشیں ننگ اوندی اے
امریکہ توں جنگ اوندی اے
بھکھ اوندی اے ننگ اوندی اے



ایہہ کھیرا اودھر گھاں
دس بندیا میں کدھر جاں
ایہہ غلامی چھوٹی ایس
اودھر پنڈت دی قوتی ایس
ایہہ حال اگر مندا اے
اودھر وی تے بھکھ چونی اے
آدے کتے ناں سکھ دا ساں
دس بندیا میں کدھر جاں



باز آجَوا

بن دی باغ چو فیروں نوسدا اے
کلا سپ سا ڈالہو چو سدا اے
آپ ساز کے اپنے آ لسنے نوں
اساں اکھنادوش لے رُوس دا اے

غزل

جالب سائیں کدی کہائیں چٹلی گل کہہ جاندا اے
لکھ پوچو چو مہدے سوچ نوں آخرا یہہ لہہ جاندا اے
باج تھیکے او دل مے ساتھی دل دی طالت کی نہاں
کدی کدی ایہہ تھکیا راہی رستے پوچ بہہ جاندا اے

بوٹاں دی سرکار

ڈاکواں دا جے ساتھ نہ دندا پنڈ داپہر دیار
آج پیریں زنجیر نہ ہندی جیت نہ ہندی وار
چنگاں اپنے گل وچ پالو نو پیٹ مے بھار
چڑھ جائے تے مشکل لہندی بوٹاں ہی کرکار
ساندل بارو سیندے ہیرے مندے ہیرے ہلے
دوہل تیرے غم داپہر مہنا اکھیاں وچ رہ جاندا اے
ہائے دو آہے دی او دُنیا جتھے محبت مُندے ہی
بہنوجن کے دکھ مٹاں اُاکھیاں چوں یہہ جاندا اے



نچسے اوہ چمکاندا ڈٹھا جالب ساری دُنیا نوں
راتیں جہڑا ایک دکھاں مے نہں بس کہہ جاندا اے



(بھٹی خان کے دورِ صبح، بکھرے محبت)

دو جاگیت

چند وانگ شمع دے میری اے
 راتاں توں جھلایا جاندا اے
 دن چڑھیاں بھجایا جاندا اے
 ایچ جشن منایا جاندا اے
 اے کھید اے ساری دولت دی
 دتر کی خطا اے عورت دی
 اک محلاں اے دچ راج کرے
 اک نوں سچوایا جاندا اے
 ایچ جشن منایا جاندا اے

دل ساتھ نہ وی تے مننا کی
 بستی دچ ظلم دی وسنا کی
 حال اپنا کسے نوں دستا کی
 چپ بنانا ای تعذریاں نیں
 ایہہ گھن گرونتیں زنجیراں نیں



دجی کمی دی

دجی کمی دی

دوڑے گھر وچ بُستیاں کردی

بجھ چندی ہو کے بھسردی

نہ اے جیندی نہ اے مردی

بڈھے خان دا حقہ

دن وچ سوسو داری تازہ کڑی

خان دا پُستہ

بٹھک دے وچ ہا سے پانے

بانہ پھیر لیزا اینویں سیدا اینویں کھیندا

کی دساں اوہ کی کی کہہندا

اُدھی راتیں چھوٹی بی بی کہندی

اُنھ تکیے ول چلیے

جے کمی نے پسند وچ رہنا

فیرا ایہ سب کچ کرنا پسینا

دھول سپاہی

اُکو کوٹھا اوہ وی چروے

ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ

دکھیا جاگے قسمت سووے

پیار نشانی سینے لا کے

یاراں دے دروازے اُٹے

و دہی بن کے آن کھلوے

آج توڑی آیا نہ مہا ہی

دل دا جانی دھول سپاہی



رات کلینی

دنیا بھر لے کالے پتے چور نینرے

سوچیں پے گئے

کی ہموے گارات جے نک گنی

جے دھرتی لے کامیاں آگے

گردن جھک گئی

رات نوں روکو

دوشنیاں لے ہڑ لے آگے

اچیاں اچیاں کنڈاں چٹکو

رات نوں روکو!

شہنشاہی واجشن مناؤ آیا لے فرمان

دیکھو کون وی صدیاں پچھے ایتنے انسان

مرجاندا جے میرے ہتھوں جاندی اک دی جان

ایہہ جیوندے اُدھ مویکے کے میرا پاکستان

ادھو پچرا ادھو ای میں ادھو ای صیتا د

ادھو پپرے ہنجاں لے تے سہی لے فریاد

ضبط لے ہن تک اک شجران بچ لکھی سی رُودا

انگریزاں نوں کد کے ہی میں ہویا نہیں آزاد



ہز دی گونج تے گھو کر سن کے

ساجاں تے تختیاں وی دنیہ کنپ اُٹھی لے

اک منہی لے

جدوں اینہاں دی ٹٹ ٹھٹ نوں خطرہ پیندا

رب رسول نوں خطے لے بچ پادندے لے

زب رسول لے حکم لے نال لے رین نہیں لگے

خونیں قاتل چور ٹیڑے کالے گئے

جائب بھانویں لکھ اکٹھے جو ہو بہینون

نسبیں ہن رینی

رات کلینی



کڑے

نہ جا امریکہ نال کڑے
ایہہ گل نہ دیوں ڈال کڑے
ایہنے قتل آزادی نوں کیتا
ایہنے ایس دھرتی دا بو پیتا
ایہنے کوٹھایا جنگال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے

ایہہ دوس دے ال لٹو دنا آ
ایہنویں لوکاں نوں مرو دنا آ
سانوں تیرا بڑا خیال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے

گل ٹھک ای کیندا ساقی دی
کتے چلا نہ جائے باقی دی
کر راکھی دسیں نبھال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے



جام ساقی

گل سُن چپنا

گل سُن چپنا
راج لیا اپنا
وڈیاں وڈیریاں را
ظالماں کُئیریاں را
چھڈناں چپنا
گل سُن چپنا !
راج لیا اپنا

سراں دیاں پرتیاں نے
پرتیاں پرتیاں نے
رہگیاں دے طہیاں نے
کچھ تیسوں دتا دی
اینویں پیاسپنا
گل سُن چپنا

راج لیا اپنا
بندے نہیں اے پایہ
اینویں تینوں چارے
جھوٹ پتے ملے

ہرکس کر پاگلا
چل پلھپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا

گورے چنے صاباں کوں
کالیاں نواباں کوں
بیج ایہناں عذاباں کوں
نہیں تاں تیسوں دتاں
پوے گا کھپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا



ماں بولی

پستراں تیری چادر لائی
ہور کے دادوشس نہ مائی

غیراں کرودوی او آگ بانی
سینے ہو گئے پیار توں حنائی

پستراں نوں توں لگیں گائی
تینوں بون توں شرمادان

غیراں ایسی وا وگائی
پستراں تیری چادر لائی

ایہناں کول زمیناں وی نے
ایہناں ہتھ سنگیناں وی نے

دولت بنک مشیاں وی نے
ناں ایہ تیرے ناں ایہ میرے

ایہ لوکی یوسف دے بھائی
پستراں تیری چادر لائی

ہور کے دادوشس نہ مائی



کدی کیندے پنج ہزاراں وچ

کدی چندے رے دیواراں وچ

رہی شرم نہ رانجھن یاراں وچ

ہوئیاں بے بس نکھاں بیسراں نیں

ایہہ گھن گروئیں زنجیراں نیں

نہیاں دے جھگڑے جھیرے وچ کی رکھیا اے

اساں تے جام محبت والا پی رکھیا اے

پی لیندے نے کھالیندے نے سولیندے نے

یاراں خردوؤں و طونوں دور سکھی رکھیا اے



مُنڈیا

چپ کر منڈیا نہ منگ روئیاں
 کھائیں گا زمانے بھٹوں میں تے سوئیاں
 دزڈ کے توں کٹ آیتھے دن چار
 صدیاں توں بھکے لوکی کھانے آئے مل
 اک منکی چپکے دوسری تیار
 دلاں وچ جنہاں تے محبتاں دائور
 حبان ٹھکراے بنا کیتیاں قصور
 رہن سکھی واجداں ولیکیا دے یار
 صدیاں توں بھکے لوکی کھانے آئے مار

میاں عبدالخالق

درومنداں دا دروی سی اوہ ٹھلے یار سی یاراں دا
 اوہ بے تیکھے بولاں آگے کم رسی کیکہ تلواراں دا
 سوچ سی اوہی سورج دُرگی منزل امن آزادی کی
 زخمی دل ہندیاں ہویاں سی جیہڑا پیل بہاراں دا
 رہندی ذیبا توڑی رہنا اس دھرتی تے اوہ ناں
 دل سی اوہا شیشے درگا خالقیں سی یو اراں دا
 ایہ دکھ ساری عمر نہیں بھلنا زخم کدی ایہہ جانا نہیں
 ایناں سوہنا سچا بندہ مید ہویا سکاراں دا



وچھڑے دل وی بل سکدے نے

دل دی کالک

ہنجاں نال ای دھل سکدی اے

زخم جگر دے دھو آئیں

ہنجاں نال ای بل سکدے نے

وچھڑے دل وی بل سکدے نے

رو آئیں

نفرت دی آگ

ہنجاں نال ای بچھ سکدی اے

اکھیاں دے وچ ہنجاں بھر کے پیار دی نعت تک

بو آئیں

دل دی کالک

ہنجاں نال ای دھل سکدی اے



دھو آئیں

جالب

کمی

چند

تحریریں

خطوط

خط جالب

اور سب پر لکھی حرف صداقت لکھا
 رہ گیا عام ہمارا ہی بشارت لکھا
 تاکہ کہنے میں غلط نہ ہو غلط لکھا
 ہم نے سیکھا غیر ہمارے بشارت لکھا
 نہ چیلے نہ سن لکھی غلط ہم کر
 مقبر پر لکھی ہمارے بشارت لکھا
 چہ چہ لکھی ہمیں بشارت لکھا
 شہر آئی اس تحریر کی بشارت لکھا
 ہر سے لکھی کر رہے غمیں ملا لکھا
 لکھی ہمارے ہمارے بشارت لکھا
 ہر سے لکھی ہمارے بشارت لکھا
 سہو تانت کر جان کو قیامت لکھا
 کہ جس کہنے ہر کہ لکھی معاہدہ جالب
 رہ لکھی ہیں اپنا اس صورت لکھا

جس لکھی

لندن ۱۰ جون ۱۹۸۸ء

حبیب جالب سراغاز

زیرِ نظر کلیات برگِ آوارہ، 'سرمقل'، 'عہدِ ستم'، 'ذکرِ بستے خون کا گوشہ میں قفس کے'،
گنبدِ بے در کے کلامِ مشعل ہے۔ سرمقل، 'ذکرِ بستے خون کا اور گنبدِ بے در ضبط شدہ کتابیں
ہیں۔ ان تین ضبط شدہ کتابوں کا نقابِ حرفِ حق کے نام سے مکتبہ دانیال کراچی سے شائع ہو
چکا ہے۔ اس کلیات کے شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے عزیزِی ہمایوں گوہر کے
ذہن میں آیا۔ انہی کے زیرِ اہتمام یہ کلیات طبع ہو کر آپ کے سامنے ہے۔

یہ کلیات کیسی ہے، کیسی چھپی ہے، اس کے بارے میں قارئین کی رائے ہی بارہ
مستند بھی جائے گی۔

برگِ آوارہ دیکھ لے کی شاعری ہے جس میں چھوٹے بڑے وادوں، بچھڑے
ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں، جگہ جگہ عدمِ تحفظ کا احساس شدت سے پایا
جاتا ہے۔ بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیمہ لہجہ بلند آہنگ ہو گیا ہے۔ کیوں ہوتا کہ

ایک نظم منصور بے کے تحت دین عزیز کو خوں کا آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا، مہربان
 جس بڑھانگیا لہر آتا ہی تند و تیز ہوتا گیا۔ اسی لہجے کی وجہ سے میں کئی بار پسینوں پر زندان
 گیا اور زندان سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔

ایک مدت سے جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان شعراء کے بارے میں لکھا جائے
 جوازل سے رجعت پسند عوام دشمن برسرِ اقتدار طبقے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مثلاً
 قرآن العین طاہرہ، منصور حلاج، ابرالقاسم لاسوقی، ایران میں قاجاری اور پہلوی دور
 کے شعراء جن کے جسم میں موم بیاں گاڑی گئیں، زندانوں میں ڈالے گئے اور وہ شعر
 پڑھتے رہے:

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
 رقص چنین میان میدانم آرزو است!
 اے خوش آن عاشق سر مست کو پائے حبیب
 سر و دستار نداند کہ کدام اندازد!

سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے سلسلے کا شاعر ہوں، مولانا حسرت موہانی اور
 محمد تقی الدین کا بھی پر و کار ہوں۔ بچپن سے بزرگوں سے سنتا چلا آیا ہوں
 کہ اے خدا ایمان کے ساتھ قبر میں آنا، اس دعا کا مطلب اسید سمجھ میں آیا کرتے
 دم تک لوگوں سے پیان و فاباندے رکھنے والے شاعر کو ہی عوامی شاعر کہا
 جاتا ہے۔

چند خطوط منو بھائی، افضل صدیقی کے نام

یارے منو بھائی! میں لندن بخیریت تو نہیں پہنچا لیکن پہنچ گیا ہوں
جان بچے ہو سکے کہ مجھے کراچی ایئرپورٹ پر روک لیا گیا تھا۔ ایئریشن والے پکڑ کر
اپنے دفتر لے گئے۔ جس بے جا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں اس حالت میں دل و دماغ
کے ساتھ بیٹھ سے جو ہوتا آیا ہے وہی کچھ ہوا۔ بتایا گیا کہ تم بلیک لسٹ ہو اس لئے باہر
نہیں جاسکتے۔ میں نے کہا عدالت عالیہ مجھے باہر جانے کی اجازت دے چکی ہے۔ ڈپٹی
سیکرٹری کہہ چکے ہیں کہ حکومت اگر جالب کو باہر جانے کی اجازت نہ دیتی تو پاسپورٹ بھی
نہ دیا جاتا اور مجھے روک کر تم توہین عدالت عالیہ کے مرتکب ہو رہے ہو مگر یہ شاید ان کے
لئے بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔

میں نے یہ بھی کہا کہ تم لوگ اپنی وراثت میں حب الوطنی کا ثبوت دے رہے ہو مجھے
عدالت کی اجازت کے باوجود ملک سے باہر جانے سے روک دینے کی خبر سے ملک کی عزت و
آہود میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ میرے قہارے صفائی دوست عبدالحمید چھاڑا نے انہیں کہا
کہ بے شک اسلام آباد سے اس امر کی تصدیق کر لو مگر وہ اپنی حب الوطنی پر ڈٹے رہے اور
ہر بات سنی اور سنی کردی۔ وہ گھنٹے بھنائے رکھنے کے بعد کہا کہ ہم تمہیں ملک سے باہر ہرگز
نہیں جانے دیں گے لیکن دفتر سے جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔

یہ زخم دل پر افشائے ایئرپورٹ سے باہر آیا تو میرے بیمار دل کی حالت غیر تھی۔ چھاڑا
نے کہا کہ آج رات کے کسی حصہ میں داخل ہونا پڑے گا وہ حوصلہ دیتا رہا کہ دو چار دن
میں اجازت مل جائے گی۔ میں نے کہا میں اب باہر جانا ہی نہیں چاہتا وہ مجھے میرے بھائی کے
گھر آکر کیا۔ رات کانٹوں پر گزاری صبح مجھ پر بیلوی کے دفتر کیا کہ تباہوں واپس لاہور جا رہا
ہوں اور عدالت عالیہ کو بتاؤں گا کہ مٹا کر وہ اجازت میرے لئے کافی نہیں ہے۔ اتنے میں
چھاڑا نے اطلاع دی کہ اسلام آباد سے اجازت نامہ آگیا ہے مجھے اعتبار نہیں آیا اور دوبارہ

زخم کھانے کی بہت بھی نہیں تھی۔ کہا میں نہیں جاؤں گا..... مگر اس نے سمجھا بھاکر
 زبردستی ٹرکس ایئر لائنز کے طیارے میں بٹھا دیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔
 جب جہاز دن دسے سے اٹھا تو یقین آیا کہ اب کوئی کان سے پکڑ کر جہاز سے باہر نہیں کھینچے
 گا۔

اسٹینڈل میں جہاز دو گھنٹے رکا۔ اسٹینڈل کی عمارتوں کو میں نے دیکھا۔ سائیکر بہت اونچے
 تھے جہاز دوبارہ اڑا تو ایک خوبصورت ایئر ہوسٹس نے میرے قریب جھک کر مسکراتے ہوئے
 پوچھا ”پینے کے لئے کیا لوگے؟“ میں اس کی مسکراتی ہوئی دعوت کو مسکراتے ہوئے
 قبول کیا اور لندن تک تین شرکر فری کو کاکولا پی گیا۔

بہت خوفزدہ کیا گیا تھا کہ لندن میں ایمریشن والے بہت سے سوالات پوچھتے ہیں۔ میں
 اپنے ساتھ کچھ انگریزی اخبارات لے گیا تھا کہ ثابت کر سکوں کہ میں خلاصہ مشہور آدمی ہوں
 انگریزی نہ جاننے کے سبب میں نے سوالات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن ایک سوال میری
 سمجھ میں آگیا ”تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟“ ”فٹنی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ ”آٹھ بچوں کا
 باپ ہوں“ انہوں نے مجھے اجازت دیدی..... میں یہ مطلب سمجھا کہ جس کے آٹھ بیٹے
 ہوں وہ یہاں نہیں رہ سکتا شادی نہیں کر سکتا اور پھر میری عمر اٹھاون برس کی نہ صرف ہے
 بلکہ نفرت بھی آتی ہے۔

میرے سابق حکمرانوں کو کیا پتہ کہ اپنے وطن میں میرے آٹھ بیٹے ہی نہیں ہیں ساڑھے
 آٹھ کروڑ دست، ’ہریز اور پیارے بھی ہیں اور امیں میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی
 خوف، کسی خطرے اور کسی لالچ میں نہیں چھوڑ سکتا اور پھر میرا وجود بھی میرے وطن میں ہی
 کی امانت ہے اور میں بھی وہی خاک اودھ کر سوتا چاہتا ہوں جو فیض احمد فیض، خواجہ
 فرید الدود اور میراج احسان محمد اودھ کر سوتے ہوئے ہیں۔

لندن ایئر پورٹ پر لیڈی سینٹ اللہ قادری اور کچھ دست لینے آئے ہوئے تھے۔ یہ
 ناٹون جتنی اردو دے جاتی ہیں میں اتنی انگریزی نہیں سمجھتا۔ ان کے گھر پہنچا۔ میرسر قادری
 محروف ہونے کے علاوہ مصروف بھی ہیں انہوں نے جلدی جلدی اپنے موٹوں سے اقبال
 جرم کرا کے فراغت حاصل کی اور میرے پونچنے پر بتایا کہ اقبال جرم سے ان کے موٹوں کو
 فائدہ پہنچے گا..... (حیرت !!)

لندن میں پارلیمنٹ کے عمارت اور کراؤیل کا مجسمہ دیکھا وہاں سے سعید انجم کے پاس
 تاروے پہنچا ان کے بتول تاروے میں پاکستانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع ہوا یہاں

اسی پہنے انتخابات ہوئے اور سب سے بڑی پارٹی ایوزیشن میں بیٹھ گئی ہے..... (حیرت !!!)
 ناروے کی پارلیمنٹ کے دونوں طرف شیروں کے بچتے ہیں جیسے کبھی لاہور کے شیرانوالہ
 گیٹ پر ہوتے تھے۔ سعید انجم اب سویڈن لے آیا ہے یہاں کے انتخابات جیت کر سوشل
 ڈیموکریٹ کیونٹ پارٹی کے تعاون سے حکومت قائم کر چکے ہیں یہاں کے پاکستانی اچھا
 کھاتے، اچھا پینے اور اچھے گھروں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بنیادی ضرورتیں
 پوری کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے میں نے کہا دیار غیر میں تم پاکستانیوں کو جو تحفظات
 حاصل ہیں ایک روز تمام پاکستانیوں کو پاکستان کے اندر حاصل ہوں گے۔ ناروے اور سویڈن
 کے باشندوں نے ہماڑوں اور جزیروں کو آباد کر دیا ہے ہر چند کہ یہ دنیا کے غریب ملکوں کی
 دولت ہے پھر بھی انسانی محنت قابلِ تحسین ہے۔ یہاں کام کرنے کے قابل لوگ گھروں میں
 نہیں رہتے۔ ہاتھ اور کام کے درمیان فاصلہ نہیں ہے۔ محنت اور انسان کے درمیان فاصلہ
 نہیں ہے۔ متاعِ حسیں ہیں لوگ خوش ہیں، قومیں ترقی کر رہی ہیں مگر یہاں کے متاعِ کا
 حسن اور یہاں کی ترقی میرے کس کام کی.....
 مون بھائی! میں تو اپنے ملک کا حسن اور اپنے لوگوں کی ترقی چاہتا ہوں...

تمسارا حبیب جالب
 ۲۰ جنوری ۸۵ء شاہ ہولم (سویڈن)

لندن ۷ مئی ۱۹۸۶ء

پیارے ساتھی افضل!

اب کے میں واقعتاً بخیر و عافیت لندن پہنچ گیا ہوں۔ کراچی ایئر لائن والوں سے میں نے ایک
 مکھن پہلے ہی رابطہ کر لیا تھا۔ کیونکہ ہوائی جہاز میں سالان چلا جاتا ہے تو اسے اتارنے میں
 بڑی دیر لگتی ہے بہت دیر تک جس بے جا میں رہتا پڑتا ہے، 'مکھن کے آدمی نے اپنے افسر
 سے پوچھا، اور اس کے افسر نے مجھے تک نہ کرنے کا مشورہ سنایا، 'یوں میں ہوائی جہاز میں
 بیٹھ گیا اور لندن پہنچ گیا۔ اب لندن میں داخل ہونے کا مسئلہ تھا۔ داخلہ کا فارم میرے
 مہمان مہنوں نے بھریا۔ ایئر لائن افسر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اپنے دوست کے ہاں
 قیام کریں گے۔ میں نے اس سے کہا کہ انگلستان میں میرے بے شمار دوست ہیں اور میں
 بہت مشہور شاعر ہوں وہ میری یہ بات سن کر شاید تصدیق کیلئے اپنے دوسرے ساتھیوں کے
 پاس گیا۔ اور مسکراتا ہوا واپس آیا۔ اس کی مسکراہٹ سے میری چہرے پر بھی روشنی آئی۔

منہ روتی چہ سینے کا دیرا دیکھ کر آئی۔ اب کے میں بلیر اطلاع کے لندن آیا تھا اسلئے کوئی میرے استقبال کے لئے نہیں آیا میں جلدی جلدی اندر سے باہر آیا۔ اور ایک دوست کی دکان کی طرف چل پڑا۔ چلو اس کا نام بھی لکھ دتا ہوں شیر شاہ قریشی موصوف آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ اور باہر فروش ہیں

پلے کی اور پلے کی دکان باہر فروش
دکان بک کے بیکہ مکان باہر فروش

یہ شعر نبائے کس کا ہے 'قریشی کی صورت حال مندرجہ بالا شعر سے مختلف ہے قریشی صاحب قریبی بھی ہے اور صاحب دل بھی لندن میں کسی کا صمان نواز ہونا بہت بڑا واقعہ ہے لندن میں تو لوگ آنے والے سے پوچھتے ہیں کہاں بھرے ہیں اور کب جانا ہے؟ آنے والا جب یہ جواب دیتا ہے کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوں اور پھر وہیں دن میں جا رہا ہوں۔ تو لندن کی بہت اطمینان ہوتا ہے۔ مگر میں تو اپنے بہت پیارے دوست نیر حسن ڈار کے ہاں مقیم ہوں جو ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں اور فیصل آباد کے رہنے والے ہیں ان کے بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ میرے دیرینہ مراسم ہیں 'میں بھی تو لاکھ پور فیصل آباد میں کچھ مدت رہا ہوں

دل کی بات لیوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سنے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بہتی میں دل والے بھی رہتے ہیں

یہ غزل اور " بزرگ آوارہ " کا بیشتر حصہ فیصل آباد میں ہی لکھا گیا۔ نیر حسن ڈار اور اس کے بھائی میری شاعری سن سن کر ہی جوان ہوئے ہیں دوست امن اخبار دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس میں آپ نے جس بہت سے میری خبر شائع کی ہے میں آپ کا بہت ممنون ہوں ' آپ نے جمہوریت کی بحالی کیلئے بے مثال کام کیا ہے۔ آپ ایک بے لوث بہادر ' صحافی ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں میں مسلسل قید و بند کی وجہ سے آپ سے سمر لگتا ہوں مگر آپ میرے بزرگ دوست ہیں ' آسموں کے حق میں ایڈیٹوریل لکھنے والے صحافیوں اور قہیدے پڑھنے والے شاعروں سے آپ کا کیا تعلق ' میں آپ کی عقلیت کا معترف ہوں زمانہ آپ کا معترف ہے چند موقع پرستوں سے گھبرائے والے نہ آپ ہیں نہ میں

جموئی خبریں گھڑنے والے جموئے شعر سنانے والے
لوگو! صبر کہ اپنے کئے کی جلد سزا ہیں پانے والے

آپ کا دیرینہ نیاز مند حبیب جالب

یارے ساتھی افضل مددتی صاحب!

امید ہے آپ اور میرے تمام خیر خواہ دوست بخیر ہوں گے۔ دو روز پہلے سعیدہ کزور سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ آگاہی ہوئی کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے دل و نظر میں میری جگہ ہے، یوں تو پہلے بھی آپ کی منصف مزاجی کا مستزف تھا مزید ہو گیا۔

کتاب کا نام ” حرف سردار “ رکھا ہے اور یہ نام مشتاق احمد یوسفی نے دیا ہے۔۔۔ مشتاق احمد یوسفی کا نام بڑے فخر نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک بار میرے بارے میں کہا تھا کہ مار تو سڑک پر حبیب جالب کھائے اور عزت و شہرت کمر بیٹھے والوں کو لٹے یہ کیسے ہو سکتا ہے جو مار کھائے گا عزت و شہرت بھی وہی پائے گا۔ ان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اپنی عظمت سے لوگوں کو خوفزدہ نہیں کرتے۔ کرشن چندر میں بھی یہی خوبی تھی۔ اس کے پاس پہروں بیٹھے وہ خود کبڑا افسانہ نگار نکلنے نہیں دیتا تھا۔ سنتا تھا سنا تا نہیں تھا۔ یہی خوبی خدوم محی الدین میں تھی بہت سادہ مزاج تھے، بڑی شاعر تھے، بڑی آدمی تھے۔ ہاں ذکر تھا کتاب کا اس کی رونمائی جولائی میں ہوگی۔ اگلے ہفتے تارے چلا جاؤں گا، پھر سوئٹن دنیا کے سب سے اونچے مقام پر پہنچ کر غالب کا یہ مطلع پڑھوں گا۔۔۔

ہانچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان دونوں پر ہیرو کی انتہا کر رکھی ہے، صبح ایک گھنٹہ پیدل چلتا ہوں اور کرلیے کا جس بیتا ہوں۔ صحت پہلے سے بہتر ہے کھل صحت اب کہاں۔ یہ بھی ہے قیمت کہ چل پھر رہا ہوں، آج صبح ہائل چھائے ہوئے تھے، ہوا سے ہرے ہرے بڑے مجوم رہے تھے۔ بہت عرصہ کے بعد یعنی مدت کے بعد متاع کو بغور دیکھا می خوش ہوا۔ ناصر کاظمی کا شہریاد آیا

منہ اندھیرے ذرا اٹھ کر دیکھو
کیا تو تانہ ہوا ہوئی ہے

مگر جوش صاحب کا وہ شعر بہت ہی خوب ہے آپ کو یاد ہوگا کہ

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی حتی

ایک مطلع دیکھئے اگر کہیں کے تو غزل نگاروں کا

ہجوم دیکھ کر رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم

ان دنوں احمد فراز کی الوداعی محفلوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ انہوں نے اپنی ایک بڑی الوداعی محفل میں میرا یوں ذکر کیا کہ آسپت کے اس کھن ستر میں صیب جالب نے بھی میرا ساتھ دیا۔ چونکہ فیض صاحب کے بعد فراز کو بڑا شاعر کہا اور بابا جاتا ہے اس لئے یہ جملہ تاریخی ہو گیا ہے۔

مجاہد بریلوی کو میرا سلام کہہ دیجئے گا اور جسے چاہے سلام کہہ دیجئے گا۔ میں دو ایک دوست ہیں مجاہد بریلوی، چھا پڑا، مشتاق گزدر ہمارے ساتھ چلے ہیں۔ سوائے زبان کے اور کیا ہے۔ کون چلے ہمارے ساتھ کہا جاتا ہے بچ بولنے کے لئے لائیک کی جائے بھی ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں، ہم ٹھہرے مولانا حسرت موہانی کے حلقہ۔

منا ہے کہ کراچی کو گری نے گھیر رکھا ہے۔ اچھا خدا کراچی کو ہر بلا سے نجات دلائے (آمین)

آپ کا
صیب جالب



صیب

پریم پال اشک

حبیب جالب بحیثیت فلمی نغمہ نگار

اس حقیقت کو جان کر نا سوریج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے کہ ایک فنکار ہمیشہ اپنے دور کا ترجمان ہو کر کرتا ہے۔ اپنے عہد کی سماجی سیاسی اور ثقافتی تحریکات کی عکاسی ہر شاعر اپنے منفرد انداز سے کرتا رہا ہے۔ اس برصغیر کی ایک قدآور ادبی شخصیت حبیب جالب نے پاکستان ہی کا نہیں بلکہ پورے برصغیر کی سیاسی اور سماجی تحریکات کا شہر آشوب نہایت ہائیکے، مترجیے اور نمکنت آمیز انداز سے پیش کیا ہے۔ اس دور میں ہونے والی سماجی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کا مرثیہ انہوں نے نہایت غم و غصے کے ساتھ لکھا ہے۔ اسی لئے احتجاجی شاعری کے میدان میں ان کا شمار صرف اول کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ خواہ ان کا اردو کلام ہو یا پنجابی، فلمی ہو یا غیر فلمی، ہر سمت ان کی صدائے احتجاج کی گونج اور دھمک نہایت شدت کے ساتھ سنی گئی ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی کے کئی برس قید و بند کی محو بتوں میں گزارے ہوں، جس نے ہمیشہ جھجک جانے کی نسبت لوٹ جانے کو فوقیت دی ہو، جس نے جبریل ایوب خاں ذوالفقار علی بھٹو، یحییٰ خاں، اور ضیا الحق جیسے _____ سربراہوں سے سرعام سبب سہر ہو کر نبرد آزما کی ہو اور اس کے باوجود اپنی خونہ چھوڑی ہو۔ اور محاپداند انداز سے زندگی گزار رہی ہو اور اپنی شان نمکنت کو جس نے زیست کا حاصل جانا ہوا اُسے اردو دنیا کیسے فراموش کر سکتی ہے۔

جہاں تک فلمی نغموں کا تعلق ہے۔ اس کی صورت ادبی شاعری سے قدرے مختلف ہو کر رہتی ہے یوں تو فلمی نغمے عموماً فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار اور فلم کی کہانی کے موڈ، مزاج اور سچویشن کے

مطابق تحریر کئے جاتے ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ ہر نغمہ فلم کی کہانی کی ضرورت کو پورا کر ہی دے۔ یا موسیقار اسے دُھن و عطا کر ہی دے۔ اس میں فلم کی کہانی کی سچویشن کے ساتھ ساتھ فلم ساز، ہدایت کار اور خصوصاً موسیقار کی پسند کو بھی دخل ہوتا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

حبیب غالب نے فلمی شاعری میں بھی اپنے تیکھے تیور برقرار رکھے۔

حبیب غالب کے فلمی نغمے دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہاں بھی مصلحت اندیشی کا ثبوت نہیں دیا اور کہانی کے مزاج اور اپنی خو کو اہمیت اور فوقیت دی۔ اُن کے فلمی نغموں میں بھی ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ احتیاجاً اور محابذاً انداز بھی خود کو آتا ہے۔ اُن کے فلمی گیت سواہ پنجابی ہوں یا اُردو سب میں یہی کیفیت ابھرتی ہے اگرچہ اُن کے یہاں خالص گیت کا انداز نہیں ملتا۔ نہ ہی ہلکے پھلکے سکس نرم اور کوئل الفاظ اور تراکیب کی ہلکی ہلکی آجی غسوس ہوتی ہے۔ اور نہ ہی چونکا دینے والے مکھڑے ملتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ اُردو اور ہندی کے موڈ اور مزاج میں اختلاف ہے۔ چونکہ گیت بنیادی طور پر ہندی کی منفی سخن ہے اور پاکستانی اُردو پر فارسی اور عربی غالب ہے، اسی لئے پاکستانی شاعری میں نغمے ہی کو اہمیت اور فوقیت حاصل ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حبیب غالب کے یہاں گیت کی روایت کم ملتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے فلمی نغمے توجہ طلب ہیں۔

یوں تو حبیب غالب نے حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے اپنے کردار کی اُن برقرار رکھی اور خود داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اداکار علاؤ الدین جو اپنے دور کا ایک لاجواب اداکار بڑا انسان دوست اور قدردان انسان تھا وہ غالب کو فلم انڈسٹری میں لانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ فلم انڈسٹری کے لئے لکھے اور اُن کے مالی حالات بھی تھیک ہو جائیں لہذا وہ کوشش کر کے انہیں لاہور لے آیا لہنے پاس ٹھہرایا۔ غالب میں خود داری کوٹ کوٹ کھیر رہی ہوئی تھی۔ کبھی اس پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہی دنوں اس وقت کے مشہور ریڈیو کار جعفر شاہ بخاری اپنی گاڑی میں آئے اور غالب میٹھو روڈ لاہور میں ایک دوکان سے پان خرید رہے تھے کہ گاڑی ٹھوڑی دور اگر تکی اور جعفری صاحب نے اپنا آدمی بھیجا کہ جا کر انہیں بلالائے تاکہ اس سے فلم کے گانے لکھوائے جائیں۔ غالب اس بات پر بُرا مان گئے کہ کوئی کار میں بیٹھ کر اُسے اپنے پاس بلائے۔ انہوں نے اُس شخص سے کہا کہ جا کر کہہ دو کہ میں نہیں آتا۔ تب بخاری صاحب گاڑی سے اُنکر اُن کے پاس خود آئے تو غالب نے کہا: ”بخاری صاحب، مغربوں کی عزت امیروں سے

زیادہ نازک ہوتی ہے۔

انہوں نے لاتعداد فلمی نغمے تحریر کئے لیکن ان کی مختلف ۱۲۴ فلموں میں ۷۰ اردو اور چار پنجابی فلمیں ہیں۔ ان میں فلم جوکر، ساں بہو اور بیٹی، موسیقار، بھروسہ، الحاضہ، ہرانی آگ، گھر پیار گھر، سیما، دورا ستے، ناگ، مٹی، زرقا، خاموش رہو، ہم ایک ہیں، کون کسی کا، سازو آواز، یہ امن، قیدی، جو روں کی ہارات، سماج، موت کا نشہ، حسینہ، چار سو بیس (پنجابی) رزمی عورت (پنجابی) رنگیلے جاسوس (پنجابی) سرفروش (پنجابی) شامل ہیں۔ ان کے موسیقار اور گلوکار مصلح الدین حسن، لطیف خورشید، انور، رشید عطرے، اے۔ حمید، نثار بزمی، ساسٹر عنایت حسین، خلیل احمد، منظور اشرف، مشتاق علی، وجاہت عطرے، مہدی حسن، نور جہاں، احمد رشدی، سلیم رضا، منیر حسین، مجیب عالم، ناہید نیازی، منہاز نسیم، بیگم، آئین ہر دین، غلام عباس، اے منیر کے نام فخر سے لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے بیشتر فلمی نغمے گانے کا شرف برصغیر کی ممتاز گلوکارا اور عہد ساز فلمی شخصیت نور جہاں کو حاصل ہے۔

حبیب جالب کی فلمی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل برصغیر کی دو عظیم گلوکاراؤں نور جہاں اور نغمہ نگار شکر بھٹن کی دونوں گلوکاراؤں کا جائزہ لے لینا بہت ضروری ہے۔ یوں تو انہوں نے ان کے علاوہ فلمی دنیا کی ایک اور عظیم المرتبت شخصیت ساحر لدھیانوی پر بھی ایک نظم لکھی تھی۔ لیکن چونکہ ساحر کی شخصیت میں فلمی رچاؤ کم اور ادبی رنگ زیادہ ہے لہذا ان پر تحریر کردہ نظم کا تذکرہ یہاں بر محل نہ ہوگا۔ البتہ نور جہاں اور نثار پر تحریر کردہ نظمیں خصوصی طور پر توجہ کی طالب ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ نور جہاں کو انہوں نے دیکھا سنا اور ان کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس لئے ان کی یہ نظم محض روایتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی احساس ان کے اس شعر سے بھی ہو جاتا ہے:-

دیارِ دیدہ دل میں ہے روشنی تجھ سے

ہے چہرہ چاند، مدھر چاندنی تری آواز

ہو نا زکیوں نہ مقدر پہ اپنے نور جہاں

تجھے قریب سے دیکھا، مٹی تری آواز

ان کی اس نظم کا مطلع پوری نظم کا حاصل ہے۔ جبکہ وہ آواز کو امید کی توقع راہ دیتے ہوئے

کہتے ہیں:-

ہجومِ یاس میں جوت اُس کی تری آواز

ہم الہا درد کی ہے زندگی تری آواز

یہ مسئلہ حقیقت ہے کہ ایک سچا فنکار مذہب و ملت اور ملکی حدود کی قید و بند سے پیشہ
 آزاد ہو کر رہتا ہے۔ یہی کیفیت حبیب جالب کی ہے۔ انہوں نے حیدر آباد جیل میں لٹریچر نظم لکھی
 اسے ایک فنکار کا کسی دوسرے فنکار کو حقیقی معنی میں خراج عقیدت تصور کیا جانا چاہیے۔ یہ
 نظم پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لٹاکا آواز کا جادو حبیب جالب کے سر پر چڑھ کر یوں بولتا ہے۔

تیری اگر آواز نہ ہوتی مجھ جاتی حیون کی جیوتی
 پوری نظم سے یوں لگتا ہے گویا وہ جیل میں ان کے نغمے سنتے رہے ہیں اسی لئے لکھتے ہیں۔
 تیرے مدھر گیتوں کے سہارے بیٹے ہیں دن رین ہمارے
 ایک گلوکار کو اس سے بہتر اور کیا خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ کہتے ہیں۔
 کیا کیا تو نے گیت ہیں گائے سر جب لاگے من جھک جائے
 حبیب جالب نے لٹاکے اندر رہنے والی روح رچی بسی محسوس کی ہے۔ تبھی تو وہ اس شعر میں

کہتے ہیں۔

میرا تجھ میں آن بسی ہے انگ وہی ہے رنگ وہی ہے
 لٹاکا آواز کا امرت رس کا نون میں یوں گھلتا ہے جیسے کسی نے کان میں چپکے سے تم بہ اللہ
 بول دیا ہو، کم و بیش یہی کیفیت حبیب جالب پر طاری ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔
 تجھ کو سن کر جی اٹھے ہیرے ہم جیسے دکھ درد کے مارے
 بقول جگر کہنے کا مقصد یہ ہے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو روح سے اور روح سنائے
 حبیب جالب نے اپنے فلمی نغموں میں بھی ایک غازی کی طرح روایت سے بغاوت کا علم
 بلند کیا ہے۔ وہ صحیح معنی میں عوامی شاعر کی صورت میں آفاقی نوعیت کا پیغام دیتے ہیں فلمی عالم
 کا یہ نغمہ ہمارے اس نظریے کی تائید کرتا ہے۔

جاگو کہ جاگنے سے تقدیر جاگتی ہے
 اٹھو تمہاری منزل تم کو پکارتی ہے
 باطل سے دہ کے رہنا تو ہیں زندگی ہے
 ابد دل میں آگ بھردو، اب ختم رات کر دو
 اے صبح کے نشا نو
 الفج کے جوا نو

حبیب جانب اپنے جن کو چلتا نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لئے وہ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد کا تماشا ایک خاموش تماشا کی طرح کھڑے ہو کر نہیں دیکھ سکتے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

اپنے جن کو چلتا دیکھوں اور خاموش رہوں آخر کیوں

اس دھڑکی پر رہا ہے کتنے انسانوں کا خون آخر کیوں

ساری زمینوں کو بہن گھرے

صدیوں سے خونخوار لیڑے

عزت دولت میرے وطن کی

لوٹ رہے ہیں چند لٹیرے

کب تک یہ بربادی دیکھوں کب تک خدایت کروں آخر کیوں؟

گردشیں دوران کی پہلی میں پسے اور ظلم و تشدد کے شکار رہنے کی وجہ سے حبیب جانب کے یہاں قزاقیت کا عنصر تو ہے ہی اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کی مثالیں یوں تو لاتعداد دی جا سکتی ہیں فلم جو کہ ان کے شوقِ آوارگی کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔ کتنا درد، کتنی غمیں اور کتنی کسک ہے ان کے لہجے میں فرماتے ہیں۔

یوں لاہم نے فرض محبت کیا آنسوؤں کو پیا

زخم کھاتا رہا، مسکراتا رہا

اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا۔ شوقِ آوارگی

لوگوں کی کم نظری اور فتنہ گری کا شکوہ اور دل کی دولت کے نشے کے افسوس کا اظہار وہ اس فلم میں

یوں کرتے ہیں۔

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے۔ فتنہ گر لوگ تھے

ہائے کیوں دل کی دولت ڈھاتا رہا

اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا

شوقِ آوارگی

لیکن اس کے باوجود اُمید اور اُس کی نفسی سی کرن بھی ان کے دل میں روشن رہتی ہے۔ اسی لئے وہ راجا نہت پسندی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے فلم گھر پر بار گھر کے نئے رات کا سفر کا یہ بند توجہ طلب ہے۔

ہنسیں گی سہمی ہوئی شگاہیں

چمک اٹھیں گی وفا کی راہیں
ہزار ظالم سہی اندھیرا
سحر بھی لیکن قریب تر ہے
رات کا سفر ہے
اسی طرح فلم ناگ منی میں میرا ایمان محبت ہے لفظ میں وہ یوں لفظ سراہیں۔

مسکراہاں بہاراں کر سویرا ہوگا
ختم صدیوں کے دریچوں کا اندھیرا ہوگا
شب کی تقدیر میں لکھا ہے گزری جانا
راہ سو رنج کی کہاں روک سکے اہلی ستم

میرا ایمان محبت ہے

حبیب جالب روایت سے بغاوت کا درس تو دیتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے عوام کو
آزادی کی خاطر کٹ مرنے اور زنجیر پہن کر رقص کرنے کی بھی تحریک فلم زرقا میں یوں دیتے ہیں۔

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا پاؤں اٹھا
کل کو جو لوگ کر بس گے تو ابھی سے کرجا

ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مرجا

منزل عشق میں مہر کے جیا جاتا ہے

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

اس کے ساتھ ہی وہ فلم موت کا نشہ میں ڈرگ اور نشی ادویات کے تاجروں کے خلاف بغاوت

کا علم بلند کرنے کا پیغام یوں دیتے ہیں۔

بچتے ہیں یہ جو زہر اُن کو بے نشان کرو

اس جنویشن کشت و خون کی ختم داستان کرو

چہرہ حیات پر یونہی نکھار آئے گا

بے حسی و بے کسی کا دور بیت جائے گا

یہ جہاں مسکرائے گا

لیکن اس کے باوجود وہ عوام کو محبت اور اتحاد کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ فلم ہم ایک ہیں میں

وہ عوام کو جہاں یہ پیغام دیتے ہیں وہاں ستمگروں کو تنبیہ بھی کرتے ہیں۔

یہ رشتے ہیں وہ خون کے

کبھی نہیں جو ٹوٹتے

ستم گروں سے یہ کہو

دکھائیں ان کو توڑ کے

انہیں سے ہیں بندھے ہوئے

امیر کیا غریب کیا

ہم ایک ہیں - ہم ایک ہیں

حبیب زمانے کا ہر ستم ہنس کر برداشت کرتے ہیں۔ اور ان کی ایک چپ میں متغیر طوفان پوشیدہ
ہیں جیسا کہ اس کا اظہار انہوں نے فلم گھر پیارا گھر میں اپنے گیت ”جو دکھ ملے ہیں ہنس کے سہے ہیں“
میں کیا ہے۔ اسی طرح حبیب غالب شوئے تصویر کاروانا نہیں روتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان پر ستم آسمان
نے نہیں توڑے بلکہ اس کی ذمے دار دنیا ہے۔ فلم ساز و آواز میں کہتے ہیں۔

کیوں کہیں یہ ستم آسمان نے کئے

آسمان سے ہمیں کچھ شکایت نہیں

دکھ ہمیں جو دیتے اس جہاں نے دیتے

ان کی فلم پنجابی ہو یا اردو وہ اپنے برگیت میں عوام کی زبوں حالی، غاصبوں کی لوٹ کھسوٹ اور
اخلاقی انحطاط کا تذکرہ بیانگ دہل اس طرح کرتے ہیں۔

فلم چوروں کی ہاراتیں ان کا یہ نغمہ دیکھئے۔

میں چور ہوں تو چور چوروں کا ہے یہ جہاں

ہے بات گھٹانے کی ایمانداری یہاں

آجائے گانگاہ میں کھوئے گاجوز ہاں

میں چور ہوں تو چور

اسی گیت کا ایک اور بندہ لوں ہے۔

رشتوں چلار ہا ہے ہر اک کاروبار دیکھ

فائل پہن رہی ہے سرک بار بار دیکھ

خون ہے سب کے منہ کو لگا

چوروں کے اس سماج میں انسانیت کہاں

میں چور ہوں تو چور

اسی طرح پنجابی فلم حسینہ چار سو بیس کا یہ فنی فلمی توجہ کا طالب ہے۔

میں ٹھگیاں اہیں دنیا اندر دنیاں کون رکھیں
دو تارن کے ایتھ بھر دے بڑے بڑے اہلیس

حسینہ چار سو بیس۔ حسینہ چار سو بیس

یہی نہیں بلکہ حبیب جالب، ایک اور پنجابی فلم رنگیلے حاسوس میں اپنے دل کے زخم یوں دکھاتے ہیں۔

پیسے لئی نا بچہ لو کی کی کج کر دے
لہو دی تھال وگاں وچ زہر پئے بھر دے
الٹھ کو لوں ڈر دے نہ بندے کو لوں ڈر دے
پیسے لئی ایہہ جیندے نیئیں تے پیسے لئی ایہہ مر دے

دین پیسہ ایمان پیسہ

خون پیسے شیطان پیسہ

حبیب جالب کو بھی ایک نئے مسیحا کی تلاش ہے اسی آئینہ میں وہ زندہ ہیں کہ کوئی مسیحا آئے گا
جو دہے کچلے انسانوں کو سماج کی ستانی ہوئی زخم خوردہ عورتوں کو دکھ کی سولی سے اتار دے گا اور ظلم و ستم
کی حکومت ختم کر دے گا پنجابی فلم زخمی عورت میں وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

کوئی ایسا مسیحا آوے

دکھ دی سولی تو لاوے

ہر غیرت گلیاں ڈھاوے

ظلموں داراں مٹاوے

اک نواں سماج بناوے

جکڑی زنجیراں وچ نہار دیکھوے

صدیاں تو لنگا ایہہ ہزار دیکھوے

حبیب جالب کی فلمی غزلوں میں محض تنگ ہندی یا قافیہ پیمانی نہیں ملتی اور نہ ہی ان میں
روایتی شاعری کا مزاج پایا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی غزلیں محض کہانی کی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔
بلکہ ان میں جہاں پورا ادبی مذاق پایا جاتا ہے وہاں ان کا سماجی شعور ہر قدم پر بیدار رہتا ہے جتنے جہاں
غزل کا منفرد انداز اشارے کنائے کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ فلم ماں بہو بیٹا کی غزل کا یہ شعر دیکھو۔

۱۲ نہانے آئے تھے جو رسم دوستی ہم سے انہیں کے تیرہم کا یہ دل نشان ہے
اسی طرح فلم سماج کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ اعجاز ہے حسنِ آوازی کا جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے
انہیں زندگی کی تمام آسودگیاں حاصل ہو جائیں اگر وہ حالات سے سمجھو ترک کر لینے لیکن وہ فلم
سماج میں فرماتے ہیں۔

بہت مہرباں بھتیں وہ گل پوش راہیں مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے
ایک نظم کے ذریعہ جو بات کہی بندوں یا اشعار میں کہی جاتی ہے۔ غزل کے ایک شعر ہی میں
وہی بات حبیبِ حالہ ماں ہو بیٹا میں زمانے کی بے دردی کا شکوہ اس انداز سے کرتے ہیں۔

بے درد زمانے کو ہے ہنس دینے کی علوت ہر اک سے یہاں دردی رو داد نہ کرنا
اور یہی اُن کی زندگی کا حاصل رہا، اُن کا دل خون بھی ہو گیا لیکن پھر بھی انہوں نے اُن تک نہیں
کی صرف اپنے غم کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتے کو اپنا شعار جانا۔ فلم ماں ہو بیٹا میں وہ یوں کہتے ہیں۔
پھر شکہ بہانے کی اجازت بھی نہ ہوگی

دل خون بھی ہو جا تو فریاد نہ کرنا
دیکھئے فلم پرانی آگ کے اس مطلع میں کتنا درد کتنا کرب چھپا ہے، درحقیقت یہ غم، غمِ جانان
نہیں بلکہ غمِ دوران ہے وہ شامِ غم سے پوچھتے ہیں۔

اے شامِ غم بت کہ کھ کتنی دُور ہے
آئسو نہیں، جہاں وہ نگر کتنی دُور ہے
انہوں نے اپنی نظم روئے کجگت کہیں میں فلمی دنیا پر نہایت تیکھا طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سکوں پر کھوکھو کے پھرتے ہیں شاعر موسیقار
ایکڑسوں کے باپ لے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک اکھو بچے سید بیر فقیر
روئے کجگت کہیں

اس تجزیے سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جاسکتا ہے کہ حبیبِ حالہ کی فلمی شاعری میں ادبی لطافت کے
ساتھ ساتھ اعلیٰ سماجی شعور کے عناصر بھی ملتے ہیں اور یہ عوام کے جذبات اور احساسات کے صحیح معنی
میں ترجمان ہے ❀❀❀❀

فلمی نغمے

آج اس شہر میں کل نے شہر میں بس ای ہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اب اور پریشاں دلِ ناشادہ کرنا
وہ یاد بھی آئیں تو انہیں یاد نہ کرنا

بے درد زمانے کو ہے ہنس نے کی عادت
ہر اک سے بیاں درو کی رُو داد نہ کرنا

پھر اشک بہانے کی اجازت بھی ہوگی
دلِ خون بھی ہو جائے تو فریاد نہ کرنا

چاہت پہ ہماری کہیں الزام نہ آئے
بھولے سے کبھی شکوہ میاں نہ کرنا

لمحہ ماں بہویشا مومینتار: حسن لطیف
گلوکار: مہدی حسن



میرے سٹافوں پہ زلفوں کو لہراؤ گے، میرے کہلاؤ گے
یوں خیالوں کی دنیا بسانا رہا،
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا،
شوقِ آوارگی

یوں ادا ہم نے فرضِ محبت کیا، آسوں کو پیا
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا،
شوقِ آوارگی

اُس گل کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
اُسے کیوں دل کی دولت لٹاتا رہا
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا!!
شوقِ آوارگی

نغمہ: چوکر مومینتار: مصلح الدین گلوکار: احمد رشیدی



اپنے چہرہ کو جلتا دیکھوں اور خاموش رہوں آخر کیوں
اس دھرتی پر پہلے کتنے انسانوں کا خون، حرکیوں

ساری زمینوں کو ہیں گیسے

مدیوں سے خونخوار کیڑے

عزت دولت میرے وطن کی

لوٹ رہے ہیں چند کیڑے

اُس بے وفائے داغِ متنا دیا مجھے

بدلہ سری دفا کا یہ اچھا دیا مجھے

کبت تک یہ بربادی دیکھوں کبت تک ضبط کر دلی خیر کیوں

ہر دل پر ہے دہشت چھاؤ

کس نے یہ آگ لگا لی

دشمن دُور ہے چین سے بیٹھا

لڑتا ہے بھائی سے بھائی

دنیا میں اب کہیں بھی بھت نہیں رہی

آج اُس کی بے رخی نے یہ سمجھا دیا مجھے

کیوں اُس کے در پر اے دلی متاب لے گیا

میں تو کہوں گا تو نے بھی دھوکا دیا مجھے

قاتل کو پہچان کے بھی قاتل کا نام نہ لوں آخیر کیوں

ظلم و ستم کے یہ ستارے

کریں ہیں کیا کیا دھندے کا لے

لٹنے بے حس اتنے ظالم

نامِ نبیؐ کا لیتے والے

ان کے ہاتھوں ہتے پتے شہرِ اجر طے دُوں آخر کیوں

گلوکار: مہدی حسن



اس درد کی دنیائے گزریوں نہیں جاتے

یہ لوگ بھی کی لوگ ہیں سر کیوں نہیں جلتے

زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

ہے کون زمانے میں سراپو چھنے والا

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی مشہم

ہر رات مری رات پہ نہتے رہتے تھے

شعلے ہیں تو کیوں ان کو بجھاتے نہیں دیکھا

ہیں خاک تو راہوں میں بکھر کیوں نہیں جلتے

کب رات ڈھلی، یہ تو اندھیرا کا سما ہے

دیران ہیں صحرایہ طرح خواب ہمارے

آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں تبت

بگڑے ہوئے حالات سنو کیوں نہیں جاتے

کس طرح گزرتے ہیں یہ دن رات نہ پوچھو

اُہوں کے سہارے کبھی اشکوں کے سہارے

نغمہ: موسیقار: رشید عطرے

گلوکار: سلیم رضا



نغمہ: زنجی موسیقار: خورشید انور

گلوکار: مہدی حسن



ایک بھول سمجھ کر ہم دل کی اُلفت کا زمانہ بھولی گئے
کیا ہم نے کبھی تھا کیا تمہارے سارا افسانہ بھول گئے

الفتح کے جوانو، کبے کے پاسبانو
اب وقت آ گیا ہے گھر سے قدم نکالو
جسنا بازو کامرانو
الفتح کے جوانو

غم دل کی نشانی چھوڑ آئے
خاموشی کہانی چھوڑ آئے
مت پوچھ ہماری نظروں کا !
تھا کون نشاء بھول گئے

جاگو کہ جاگنے سے تقدیر جاگتی ہے
اٹھو تمہاری منزل تم کو پکارتی ہے
بالن سے دب کے رہنا تو بین زندگی ہے
اب دل میں آگ بھرد آب ختم رات کر دو
اے صبح کے نشانو
الفتح کے جوانو !

ہر رات نئی محفل میں ہے
آباد کسی کے دل میں رہے
ایک بار جہاں ہم نے پی لی
پھر وہ سینہ بھول گئے
ایک پھول پر ہم کب مرتے ہیں
وہ سارے چین کا بھرتے ہیں
کس کس کی محبت کا ہم نے
کایا نہ ترا نہ بھول گئے

محکوم ہے نعلیس ہے خاک اپنا جینا
تیروں سے نفرتوں کے چھلنی ہے آج سینہ
اس کا نشان مٹا دو جس نے پیچہ چھینا
لے کر رہو نعلیس جھپٹو مثال شاہیں
اے عزم کی چٹانوں
الفتح کے جوانو

فلم: بھروسہ موسیقار: اے جی

گلوکار: منیر حسین



فلم: العاصف



جئے نہ دل مات کا سفر ہے
مات کا سفر ہے

یہ ناکھ لوگ بے خطا ہیں
ہم اے غم کی کسے خبر ہے
رات کا سفر ہے

اے شامِ غمِ بستا کہ سحر کتنی دور ہے
آنسو نہیں جہاں وہ گزر کتنی دور ہے

دم توڑتی نہیں ہے جہاں پر کسی کی آس
وہ زندگی کی راہ گزر کتنی دور ہے

دکھائیں داغ اپنے کس کو لے جاں!
یونہی لے لے ہیں ہم اے ارماں
رہیں ہیں تر آنسوؤں سے داماں
یہ غم کا طوفان ڈگر ڈگر ہے
رات کا سفر ہے
نہیں گی سہمی ہوئی ٹنکا حسیں
چمک اٹھیں گی، دف کی راہیں
ہزار ظالم ہیں اندھیرا
سحر بھی لیکن قریب تر ہے
رات کا سفر ہے

اب کوئی پاسِ جہاں نہ کوئی اپنا ہمسفر
منزل ہماری کس کو خبر کتنی دور ہے

کوئی پکارتا ہے تجھے کہے اے خدا
کہتے ہیں تو ہے پاس گزر کتنی دور ہے

نغم: پرانی آگ مویستار: خورشید افروز
گلوکار: مہدی حسن



نغم: گھر پیارا گھر مویستار: شاربزی
گلوکار: عجیب عالم



بھول جساؤ گے تم
 کر کے وعدہ منم
 تمہیں دل دیا تو یہ جانا
 بھول جساؤ گے تم

درد کا ہے سناں غم کی تنہائی ہے
 جس طرف دیکھئے بے کسی چھائی ہے
 آج ہر سانس پر ہو کے بے تاب دل
 دھڑکنے لگا تو یہ جانا
 بھول جساؤ گے تم

چاند کو دیکھ کر ہوتا ہے گنا
 بھول کے رُخ پہ چھائی ہو جیسے خزاں
 مٹ کر آتا ہوا میسری اُمید کا
 چمن لٹ گیا تو یہ جانا
 بھول جساؤ گے تم

کیے گزے گی شب کیسے ہو گی سحر
 اب نہ وہ منہ لیں ہیں نہ وہ ہنسہ
 دیکھتے دیکھتے دم گذر رہا گذر
 اندھیرا ہوا تو یہ جانا
 بھول جساؤ گے تم

نغمہ: سیما موہنتار: ماہر غنائت حسین

گلوکار: بیلم رضا



پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے
گاتے ہیں اسی کے گُن سارے
بے تمنا اس جہاں میں
کوئی دل سے، میں پکارے

پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے

یہ جنگِ یہ فساد ہے
پیسے کے واسطے
یہ زندہ مُردہ یاد ہے
پیسے کے واسطے
صبح بے فزیب کی
منافقت کی شام
لب پہ دوستی کا نام



پیارے بھرے خوابوں کی مالاپلی میں ٹوٹ گئی
کس منزل پہ آسکے مجھ سے قسمت رُوٹھ گئی

بنا کے میرا نیشن جیسا دیا تو نے
مری دُعا کا بجے یہ صلا دیا تو نے
کیا تھا عہدِ وفا تو نے جو محبت میں
بچے تو یاد ہے اب تک بھلا دیا تو نے
نفساؤ اس نظر بے قرار دل ویراں
ہر اک چراغِ تمنا بچھا دیا تو نے
زماں میری تباہی پہ سُکرائے گا
بھرے جہاں میں تماشا بنا دیا تو نے

فلم : دولتی موسیقار : ماسٹر مائٹ حسین

گلوکار : سلیم رضا



تن توپے واروں

من توپے واروں

بگڑی بنا ہے

توہے رو رو پکاروں

تو کہنا واقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
رقصِ زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

پرست کا ناٹ ٹوٹ نہ جائے

جیونِ تجھ سے روٹ نہ جائے

پیارے ملائے، موری بگڑی بنا ہے

تن توپے واروں ...

رو رو نیساں مار نہ جائیں

لٹنے جگ کے مار نہ جائیں

بھاگ بھاگئے، موری بگڑی بنا ہے

تن توپے واروں

آج تامل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی

سرسنل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے

موت کا رقصِ زمزمہ کو دکھایا جائے

اس طرح ظلم کو نذر نہ دیا جاتا ہے

رقصِ زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا پاؤں اٹھا

کل کو جو لوگ کریں گے تُو ابھی سے کہ جا

ناپختے ناپختے آزادی کی خاطر مرجا

منزلِ عشق میں سرمر کے جیا جاتا ہے

رقصِ زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

نغمہ: زرقا موسیقار: رشید عطرے

گلوکار: مہدی حسن



آس نر اس میں ڈھلے لگی ہے

من کی بکیرا جلتے لگی ہے

آگ بھائے، موری بگڑی بنا ہے

تن توپے واروں

نغمہ: ناگ منی موسیقار: نثار بزمی

گلوکار: نور جہاں



جاگئے والو جس کو مگر خاموش رہو

کس کیا ہو گا کس کو خیر خرابی خوش رہو

کس نے سُنی ہے اس ٹکری میں دل کی بات

کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو

رات کے بعد ایک رات نئی آجائے گی

اس گھر میں ہوگی نہ سحر خاموش رہو

کلم کے پہرے، خوف کے سائے سر پہ ہیں

ہو جائے گی سحرِ سحر خاموش رہو

نغمہ خاموش رہو موسیقار، تحلیل احمد

گلوکارہ: نابیہ نیازی



چل میرے ہدم سنگ سنگ میرے

جہاں پلتے ہیں شام سویرے

سری امید بر آئی

ہوئی اب دور تنہائی

لگی ہے گونجے اب تو

سرے کانوں میں شہنائی

نکرم تو نے کیا بھچر

میں دھرتی سے بنی ابھر

پھر دل اڑتی ہواؤں میں

میں تیری ساجنا ہو کر

بیٹے گھایا جیسوں

قدموں میں تیرے

چل میرے ہدم

دل تنہی کب خوشی پہلے

تھی غم سے دوستی پہلے

کبے ہم داغ دکھلاتے

نہ تھا اپنا کوئی پہلے

نظر تو نے بلائی کیا

مقدّر میرا جاگ اُٹھا

محبت ہو گئی خود سے

جو تو نے پیار سے دیکھا

چھٹ گئے سائے

دکھ کے اندھیرے

ہوں کیونٹس دل ہیں

خوشیوں کے ڈیسے

چل میرے ہدم



پھوڑ میرے یار کوئی اور بات کر
تجھ کو نہیں کچھ بھی خبر

کیا اندھیری شبوں میں ہوتا ہے
کون ہنسا ہے کون روتا ہے

آج تجھ کو زخیم دکھاؤں

چہروں سے پرے سر کاؤں

دیکھ یہ رنگِ دُور کے سودے

دیکھ دلِ مجبور کے سودے

بکھاشا ہے جان یہ باتیں

کیا کہتی ہیں جاگتی راتیں

پیٹ بھروں کے دیکھ وہ ننگے

ادھر بچا ہے بھوکے ننگے

دیکھ کر دل کا خون ہوتا ہے

کون ہنسا ہے کون روتا ہے

ہے ہے لوگ ہیں دیکھو

صدیوں کے یہ روگ ہیں دیکھو

دیکھ سحر بن وہ کٹیاں

جلتی بجھتی وہ آشائیں

دیکھ دھواں سانسوں میں جاتا

جسم سے جاں کا ٹوٹنا ناٹ

علم جنہیں کرنا تھا حاصل

بیچ رہے ہیں پین و پنسل

کیوں انہی کا نصیب روتا ہے

کون ہنسا ہے کون روتا ہے

فلم : ہم ایک ہیں موسیقار : نثار بڑی

گلوکار : ہناز



دے گا زکوٰۃ ہمارا
 ان بے درد فضاؤں میں
 سوجا علم کی چھاؤں میں
 اپنا دکھ ہے جیوں بھر کا
 پل کی بات، نہیں ہے
 رونے کا طے جاسے یہ
 ایسی رات، نہیں ہے
 رحم نہیں ہے اس نگری کی براؤں میں
 سوجا غم کی چھاؤں میں
 آج اگر اپنی ماں ہوتی، گود میں لے کر سوتی
 نتھے نتھے تیرے آنسو دیکھ کے کتنا ڈرتی
 بھرے ہیں کانٹے پھول سے تیرے پاؤں میں
 سوجا غم کی چھاؤں میں
 فلم، کون کی کا موسیقار، منظور شرف
 گلوکار، نسیم بیگم، آئرن پروین
 *
 یہ جرم ہے میرا
 میں لیتا ہوں کیوں نام یہاں
 پیار سے تیرا
 بدلہ مجھے اچھا دیا یہ میری دنانے
 ٹیگت نہ جانے
 فلم، ساز و آواز، موسیقار، حسن لطیف
 گلوکار، نسیم بیگم
 *

دین پیسہ ایمان پیسہ

خون پیسہ شیطان پیسہ

پیسے لٹی کر کے ایہہ قتل عام

پیسے دے غلام

ہنسے پیسہ، رُلانے پیسہ

پاگل سب نوں بنائے پیسہ

پیسے بنا دنیا چہ بنا اک گالی لے

ادھری دی کی زندگی اے جیب جیدی خالی لے

چہریاں تے جان میری پیسیاں دی لالی لے

جگ اُتے ہر کوئی پیسے دا سوالی لے

دین پیسہ ایمان پیسہ

پیسے لٹی نہ پچھ لوکی کی گج کر دے

لٹو دی تھال رگاں وچ زہر پیسے بھر دے

اللہ کو لوں ڈر دے نہ بندے کو لوں ڈر دے

پیسے لٹی ایہہ جیندے نیں تے پیسے لٹی ایہہ مر دے

دین پیسہ ایمان پیسہ

خون پیسہ شیطان پیسہ



فلم : رنگیلے جاسوس

ص ۳۴

زندہاناں دے دریشیں کھلے

ہنواں ہانواں نال
قسم خُدا دی کھلن گے

لوہے دیاں ہانواں نال

دُور ہیرے ہون گے
ختم لیڑے ہون گے

ایہناں ظالماں توں نہ ڈرجا
پنج نی چندے میریئے
پنج پنج کے مرجا

میں نیس نچدی ایہہ عجوبی میری پنج دی اے
میرے نچدیاں لاج وطن دی پنج دی اے

آن اے پیاری جان توں
ڈرنا کہ طوفان توں
ہُن دُب جیسا تر جا
پنج نی چندے میریئے
پنج پنج کے مرجا

پنج نی چندے میریئے
آج پنج پنج کے مرجا
ہر ظالم نوں مادے کے
چند وطن توں دے کے
اُچا ناں اپنا کر جا

سولی تے پہنچ کہنیاں جیہڑے دُور دے نیس
زندہ رہندے موت کو لوئی مرے نیس

✽ فلم ہر فروش موسیقار بشتاق علی گلوکارہ: نورجہاں

ظلم ہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تمہاری کہو

ہنستی کاتل، روشن دادی
تاریکی میں ڈوب گئی
بیٹے دن کی لاش پر اے دل
میں رونا ہوں تو بھی رو

یہ جیون بھی کیسا جیون ہے
آگ لگے اس جیون کو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسو پر پابندی

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تمہنے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر تو نسیت نہیں تو
مجھ کو ہی پس کہنے دو

ظلم رہے اور امن بھی ہو



ظلم : یہ امن موسیقار : اے حیدر گلکار : مہدی حسن، نورجہاں

غلط ہیں سب یہ فاصلے
 یہ دُور کیا قریب کیا
 مگر یہ بات پیار کی
 گلے میں اُدغ پرغ کی !!!
 سمجھ سکے رقیب کیا
 یہ میری جہاں ملیب کیا
 ہم ایک ہیں
 ہم ایک ہیں
 ہم ایک ہیں

یہ رشتے ہیں وہ خون کے
 یہ پھول رنگ رنگ کے
 کبھی نہیں جو ٹوٹتے!
 کنوارا ہیں ہر اُننگ کے
 ستمگروں سے یہ کہو
 جوان ان سے دھڑکنیں
 دکھائیں ان کو تڑپ کے
 یہ سُربیں جلتے رنگ کے
 اپنی سے ہیں بندھے ہوئے
 امیر کیا غریب کیا
 ہم ایک ہیں
 ہم ایک ہیں
 ❀

فہم: ہم ایک ہیں موسیقار: شاربزی گلوکارہ: مہناز گلوکار: غلام عباس

لو وہ چل، ڈولی میں آسون کی

دکھ بن کے آئے کھار

لاگے دنیا اندھیری

دل جل گیا، آہ نب پر نہ آئی

چاروں طرف درد کی شام چھائی

جائے کا دل سے نہ پیدار

رو کے زمانہ حصار

دکھ بن کے آئے کھار

لاگے دنیا اندھیری

جو دکھ بٹے ہیں

ہنس کے سہیں ہیں

اس چُرپ میں کتنے ہی

طوفان چھپے ہیں

سہمی ہے گی پکار

روئے دل بار بار

دکھ بن کے آئے کھار

لاگے دنیا اندھیری

فلم: گھر پالا گھر موسیقار: شاربزی

گلوکار: مہدی حسن



کیوں کہیں یہ ستم آساں نے کئے

آساں سے ہیں کچھ شکایت نہیں

دکھ ہیں جو دیئے اس جہاں نے دیئے

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی

پھین لینے ہیں جب چاہتے ہیں خوشی

اُونچے اُونچے گھر دلیں سے جو رستہ

بل رہے ہیں ہمارے لبو کے دیئے

لاکھ چلتی ہے یہ ہوائے بستم

بیپ بچنے نہ دیں گے محبت کا ہم

دیکھنا بیت جائے گی شامِ الم

بھی سہے ہیں یہی آسِ دل میں لئے

فلم: ساز و آواز موسیقار: حسن حلیف

گلوکار: نور جہاں



من میں اُمّی نئی ترنگ

ناپے مورا انگ انگ

پنچی تیرے سنگ سنگ

من چاہے اُڑ جاؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں

اے سکمی ناں ناں ناں !

آج میرے جیون میں کیسی رس پھی بل چل

بیبا رامو ادھر دکھ گیا ہو گئی یس بیکل

جانے کیا ہے یہ اُمنگ

کہنے ہوئے شرماؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں !!

اے سکمی ناں ناں ناں !

میرا اہسان محبت ہے، محبت کی قسم

ساری دنیا ترے قدموں پہ نچا دو کر دوں،

چاند تاروں سے مری جاں ترادامن بھر دوں،

تیرے خوابوں پہ کبھی چھاء کے شام الم

میرا اہسان محبت ہے

وہ جہاں ایک جہنم ہے جہاں تو نہ بے

جل کے مرجاؤں جو یہ سائے گیسو نہ بے

زندگی زہر بھرا جام ہے اب تیرے بغیر

تیری چاہت پہ ہیں قربان مرے لاکھ جسم

میرا اہسان محبت ہے

مسکرا جہاں بہاراں کہ سویرا ہو گا ! !

ختم صدیوں کے ردا جوں کا اندھیرا ہو گا !

شب کی تعذیر میں لکھا ہے گذر ہی جانا

راہ سورج کی کہاں روک کے اصلِ بتم

میرا اہسان محبت ہے

فلم : ناگ منی موسیقار : بشار بزمی

گلوکار : مہدی حسن



نگ بھرے نیسٹوا بولے نئی بولے

چُپے چُپے من کے میرے بید کوئی کھلے

بُھرتی ہو کے سنگ بادلوں میں کھو جاؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں !

اے سکمی ناں ناں ناں !

فلم : ناگ منی موسیقار : بشار بزمی

گلوکار : نور جہاں



زندانِ یادِ دھڑکی اکیٹھن سے اتر گیا میرا پید
پھر پردیس نہ جانے دوں گا جس اک بار

نشاخ ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے
بت سکون سے اب گردشِ ناز ہے

لوگ دیکھیں نہ تماشہ مری تنہائی کا
نفر فریاد میں ڈھل جائے نہ شبِ نائی کا

بھانے آئے تھے جو رسمِ دوستی ہم سے
اُنہی کے تیرِ ستم کا یہ دلِ نشانہ ہے

رات کتنی نہیں لے چاندیہ اُن سے ہنسنا
دن گند تپے تڑپ کر ترے سودا کی کا

غوشِ یکوں ہو، تباہ کہاں چلے جائیں
مہارے در کے سوا اب کہاں ٹھکانہ ہے
نغم : ماں، بہو اور بیٹا موسیقار: حسن لیلیف

سب کہیں گے کب مجھے چھوڑ گئے ہو تنہا
کیسے دیکھوں گی یہ عالم تری رسوائی کا

گلوکار: نور جہاں
*

ساجن پیار کیلے تو بھاتے رہنا
وے نہ ملنے یہ زمانہ تجھے ہر جانی کا

نغم : ماں، بہو اور بیٹا موسیقار: حسن لیلیف

گلوکار: نور جہاں



یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے

لے تھے بہت بسفرِ زندگی میں
ہنیں یاد کس کو بُن چھوڑ آئے

بہت ہیراں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں ہیراں چھوڑ آئے

ہر اک شب کسی زلف کے پہاں تھے
ہم کوئی گھٹا دے سماں چھوڑ آئے

جو دامن پر آئیں تو ہو جائیں مُعوا
کچھ ایسے بھی اشکِ دہان چھوڑ آئے

قلم : سماج موسیقار : اے سید

گلوکار : مہدی حسن



ابیں یقین ہے ڈھلے گی اک دنِ بزم کی شام اے فلسطین
اے فلسطین

شگردن کا نشان نہ ہوگا ہمارا خونِ راٹھیاں نہ ہوگا !
شہید ہو کر بھی اپنے لب پر ہے تیرا ہی نام اے فلسطین

وطن سے جب تک بڑا نہ لیں گے نشان ہم سامراجیوں کا
اُٹھم محمد کی غفقتوں کی نہ لیں گے آرام اے فلسطین

قلم : ذرتا موسیقار : رشید عطرے

گلوکار : نسیم بیگم، مزین حسین



یہ بھی وقت گزر جائے گا
 رات اگر غم کی آئی ہے
 دن خوشیوں کا بھی آئے گا
 یہ بھی وقت گزر جائے گا
 غم سے مت گھبرانا سہتی
 ہمت ہار نہ جانا سہتی
 ملے گی منزل کنے کی مشکل
 ہر دکھیا راسکھ پائے گا
 یہ بھی وقت گزر جائے گا
 جان ہے کیا شے آن کے آگے
 انسان کیا جو غم سے بھاگے
 ہر دکھ سہ جاد کی کہہ جا
 گیت یہ جگ تیرے گائے گا
 یہ بھی وقت گزر جائے گا

آنکھ کھلی تو دم تھے نفیس
 اب بھی ہے سب کچھ غیر کے بس میں
 سوگ ہے گھر گھر گنبد بے در
 اور الم کیا دکھلائے گا
 یہ بھی وقت گزر جائے گا
 مھل جائیں گے دریاں کے
 جاگ اٹھیں گے بھاگ انساں کے
 نیدہ پر خم پیار کا پرچم
 چاروں جانب لہرائے گا
 یہ بھی وقت گزر جائے گا

❀

یہ ہے موت کا نشہ

اے جو منہ لگائے گا

وہ زندگی سے جلے گا

یہ ہے موت کا نشہ

اے جو منہ لگائے گا

وہ زندگی سے جائے گا

صبح شام نسلِ نوح کا قتلِ عام دیکھئے

موت دے رہا ہے موت کا نظام دیکھئے

جل بجھی جیسا کہ شمع ایک دھواں سا رہ گیا

یہ دھواں نہ جلنے اور کتنے گھر جلائے گا

یہ ہے موت کا نشہ

اے جو منہ لگائے گا

وہ زندگی سے جائے گا

تیرگی کے تاجروں سے پاک یہ جہاں کر دو

بیچنے ہیں یہ جو زہرِ ان کو بے نشان کر دو

اسِ خوش گشتِ دُخوں کی ختمِ داستان کر دو

چہرہٴ حیات پر یوہنی نکھار آئے گا

بے بسی و بے کسی کا دور بیت جائے گا

یہ جہاں مکرائے گا



دشاق گذر کی فلمِ موت کا نشہ کا گیت

زندگی نہ مل سکے گی بار بار سوچ لو!

کر رہے ہو جانِ موت پر نثار سوچ لو!

سو گوار جن کو چھوڑے جا رہے ہو دہر میں

کون ان کے بوجھ کو تہلے لے لہا لٹائے گا

پنجابی فلمی نغمے

بن مٹیاں ایس دنیا اتہ ربیاں کون نہیں
دیوتا بن کے اتھے پھر دے بڑے بڑے ایلیں
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

بازِ ظلم توں آ ظالماں بازِ ظلم توں آ
اگلے پل دی خبر نہیں تینوں بن بن بہوں خدا

شام سویرے نوتاں دچکن دولت دے پیمار
پیر دھرم ایماں ایساں والا پیر مطلب دیکار
راتاں لے پر دے دچ کیدن غزتاں نال نبیشت
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

بسج تے جیہڑی رات سی آؤنی منتقل دے دچ آئی
واہ جیہڑا توں اک دھی دے ہر توں چُنی لائی
بجو بن کے بہ گیا کجسا زخمی ہو گئے چا
بازِ ظلم توں آ...

انساں دیاں لاشاں اُتے قاتل بھگڑے پون
لے ہتھ ستمگاراں دے مجبوراں دا کون
جیہڑا پچ وافرہ لاوے ظالم دیندے پس
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

جناں دی توں فلم کریں گا اچ اسان بہ جانا
بھائیوں توں سولی تے ٹٹکے پچ سماں کج جانا
موت زندگی ہتھ نہیں تیرے توں کہہ کوہنے را
بازِ ظلم توں آ....

سایاں شہراں تے چھائی لے اک ہشت دین برین
پتہ نہیں لگا اس دھرتی دا کوہیا کئے چین
حال وطن دا دیکھ کے میرے دل چوڑا مُدی نہیں
حسینہ چار سو بیس، حسینہ چار سو بیس

موسیقار: شقائق علی گلوکار: نورجہاں



فلم: حسینہ ۴۲، موسیقار: وجاہت عطریہ

گلوکار: نورجہاں



صاحبِ اسلوب افسانہ نگار



کے

۲۴ بے نظیر افسانوں کا مجموعہ



صدیاں توں لگا اے بزار دیکھ لے
 میں اں کہ توں کون گنہ گار دیکھ لے
 زخماں مے پھلاں دی بہار دیکھ لے
 عورتاں دا ہوندا کاروبار دیکھ لے

کچلے دی بجھی بجھی دھار دیکھ لے
 صدیاں توں لگا اے بزار دیکھ لے

ایہہ چھٹکدیاں رُسوائیاں
 کتاں نے پیریں پائیاں
 ایہہ اس دھرتی دیاں جائیاں
 آسمان توں نسبیں آیاں
 بن ڈولیاں بن شہنشاہیاں
 راتاں نوں ہون پرائیاں

کوئی ایسا مسیحا آدے
 دکھ دی سولی توں لا دے
 بے غیرت گکیاں ڈھا دے
 ٹلمساں دا راج مٹا دے
 اک فواں سماج بنا دے
 جگر ڈی زنجیراں دچ نار دیکھ لے
 صدیاں توں لگا ایہہ بزار دیکھ لے

نظم: زخمی عورت





نذیر جالب

افضل صدیقی

چمپا ہے چاند یہ کہہ کر جیب جالب سے
 گلے ملیں گے گل تر جیب جالب سے
 کوئی بھی حال ہو دیکھا سحر نہیں جاتا
 اداس شام کا منظر جیب جالب سے
 مہافت کا کوئی ایک حرف بھی نہ کہا
 خطا ہوئی تھی اکثر جیب جالب سے
 بت سے شعر کے ہیں بت سے لوگوں نے
 کہا نہ ایک بھی بستر جیب جالب سے
 تھی کہا ہے قصیدہ لکھو چارے لئے
 ملا ہے جب کوئی افسر جیب جالب سے
 ہزار منہ و منبر پہ جم کے بیٹھا ہو
 رہے گا پھر بھی وہ کم تر جیب جالب سے
 غریب ، غمزدہ ، بیمار ، خون تھوکتے لوگ
 سکون پاتے ہیں مل کر جیب جالب سے
 تمام صدق ہمیشہ خفا ہی رہتے ہیں
 تمام حاکم و افسر جیب جالب سے
 ہر ہو زعمی کیے اگر نہیں معلوم
 تو پوچھ لیجئے جا کر جیب جالب سے
 ابھی تو عمر ہی کیا ہے ، ابھی تو گزریں گے
 زندہ سبیل پھرتے جیب جالب سے



چائیاں دے عرش واناارا جالب جے
 تول کے دیکھو سبھ توں بہارا جالب جے
 ہر اک دور وا آسر جس توں ڈریا اے
 اچا سچا اودھ لکارا جالب جے
 سچے راگ الاپے نئے مگلی مگلی
 اس دھرتی اودھ ونجارا جالب جے
 دڈھ رہیا اے بیہرہ بیہرہ نیرے دے
 اکھاں کھول کے دیکھو آرا جالب جے
 کیہ ہودے گا آدن والے ویلے دج
 انج دی کردا پیا اشارا جالب جے



توقیر چغتائی

متاع جان واڈ پر لگا کر تو دکھ ہے
 تو زر پہ بکئے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے
 ترے اشعار لوگوں کی زباں سے جب نکلتے ہیں
 قصیدے لکھنے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے



صرف حبیب جالب کے یوم پیدائش پر

سلیبہ شاہد

مصلحت سے مفر جس کی تاکید ہے
 آج اس شخص کا یوم تولد ہے
 وہ اجالا ہے اور شب لب مگور ہے
 الاماں الاماں ہر طرف شور ہے
 اس کے شعروں میں اب بھی وہی زور ہے
 جس کا لہجہ غموش کی تردید ہے
 آج اس شخص کا یوم تولد ہے
 جس کے انکار میں ایک امید ہے
 جس کے الفاظ میں ایک خورشید ہے
 جس کی راتوں میں صبح کی تمہید ہے
 آج اس شخص کا یوم تولد ہے
 اک مسافر جو دن رات چلتا رہا



نذیرِ جالب

مستند کا ڈونجف ریسپی

وہ زینتِ زمین چڑھے ہیں ادھر
مفاہمت کی تباہی پڑے
اور ایک تم اپنے حق کی خاطر
سدا ہی لڑتے رہے جہاں سے
مگر جہاں بات ہو آدمی کی
وہاں تم اپنے حقوق سمجھو لے
بس آدمی ہونے کی دولت ملے رکھی
خود اپنی ہستی ملے رکھی
معبیوتوں میں بیت گردی
کبھی نہ کہہ کی سویدگی

نصاحت کی تباہی اور مٹی

حبیب جالب
تہلانا اس سے پتا کرنا
بس ایسے جیسے
کسی نے ہی کلام کر کے بہا دیا ہو
تہا سے تم میں قلم سے شعلہ تو جھوٹے ہیں
مگر تہا سے دکھوں کو میں نے
کبھی نہ پتی خوشی سے بدلا
میں اپنے اس جبرم پڑ ہوں نام
حبیب جالب
تہا ہی آنکھیں بنا دوڑوں کی مثل جلاتے
ہمارے مردہ ضمیر دلوں کو جگمگا رہا ہیں
رلا رہا ہیں
حبیب جالب



حبیب تہا تہا سے علم میں
تمام عالم دھواں دھواں ہے
ہر آنکھ بے خواب پر نشان ہے

تہا سے بچو کے ہاتھوں میں
تہا سے چہرے کے دھجے پناہ میں
تہا ہی آنکھیں بنا دوڑوں کے علم اٹھاتے
تمام عالم پر جھانکی تھیں
تہا سے چہرے کی سادگی میں تہا ہی آنکھیں
تمام تہا سے بک کی حامل بنی رہی تھیں

حبیب جالب

تہا سے کرواؤ کی بندگی
تہا سے انکار کی ملامت
تہا لانا اس سے پتا کرنا
میں کو جی ہوں تو حق توں کے لئے سے جلتے ہیں

چاروں جانب
ہر ایک چہرہ نصاحت کی ردا لپیٹے
مفاہمت کی تباہی پڑے
نہ جانے کتنے گروپ کھڑے ہیں
اور ہاتھ میں مشہور توں کے کا سے
نہ پس عزت نہ پاسِ حرمت
ان کی دولت سے اتھ خالی

نا اٹھانے اوب کو ہم نے
اوب کی مغل جھلکے دیکھا
دہانے کتنے ناشادوں کو
مشہور میں کلام پڑھتے ہوئے سنبھلے

(ماہنامہ فشتور کراچی اپریل ۱۹۹۳ء)

شان الحق حق

قطرہ تاریخ وفات حبیب جالب

قول حق پیش حاکم جابر
”مرد بے باک پاک، جادو لب“
یہ سعادت ہوئی تھی اس کو نصیب
جالب خوشنوا، حبیب لبیب“

۱۴۱۳ھ

(فنون لاہور جنوری، اپریل ۱۹۹۳ء)

شاہد شیدائی

مداقتوں کا حیر حبیب جالب ہے
بکا نہ جس کا قلم وہ حبیب جالب ہے
کبیرا ہی رہا زمزمے محبت کے
مرے چمن کا دکنی عذلب جالب ہے
سزا کے خوف سے احباب دور دور رہیں
بیش واسو رس کے قریب جالب ہے
جوں میں ایسے غریب الوطن بھی ہوتے ہیں
وطن میں رہتے ہوئے بھی غریب جالب ہے
نہ شاہ کا وہ صاحب نہ صاحبوں کا حنیف
افسا کے نگار جو اپنی صلیب جالب ہے ❖

میں خط لکھوں گا

میں خط لکھوں گا
 حبیب جالب کے نام اک دن
 میں اس کی خدمت میں عرض کر کے
 سلام اک دن
 اسے سناؤں گاحال اپنا
 میں اس کو بھجوں گا اپنی تصویر
 اسے دکھاؤں گا جسم اپنا
 کہ جس پر کوڑوں کے داغ اب تک
 چراغ سا جگمگا رہے ہیں
 اُسے سناؤں گا وہ کہانی
 جو اُمریت کی مہربانی سے آج تک بے زیاں رہی ہے
 جو قید و بند کی صعوبتوں میں لکھی تھی میں نے
 اُسے سناؤں گا نظم اپنی
 میں خط لکھوں گا
 حبیب جالب کے نام اک دن
 مجھے یقین ہے
 وہ میرے خط کا جواب دے گا
 بطور شاباش اپنی تازہ کتاب دے گا

از کجا آید ایں آواز دوست (رومی)

حب دلیس کی قسمت پر سیاہی چھائی
 حب تیغ ستم تابہ افق لہرائی
 حب خلق کے ہونٹوں کی ہونی بخیر گری
 سچے چہ سروں پر اُدا سی چھائی
 گوئی ہے صد ایک کر دل کھل سے گئے
 یہ دوست کی آواز کہاں سے آئی
 وہ نے کی طرح وقت کے ہونٹوں میں دیا
 کرتا ہے حکایت غم جاناں کی بیان
 جہور کے پندار کا حاصل ہے سخن
 ہر شعر کی ٹھوکریں ہیں اقلیم جہاں
 حالب تجھے معلوم نہ ہوگا شاید
 ہے غیرت جہور ستم چڑ میں
 نادار کی جرات تیرے پور میں دھلی
 ارباب ستم دیکھ کے پھراتے ہیں
 تاریخ کبھی ہم سے جو ملے گی حساب
 ہم پیش کریں گے تیرے نعروں کی کتاب
 کیا بخت سیہ اپنا وطن لایا تھا
 کس طور گزار ہے سلسل یہ عذاب
 تاریخ نے خلقت کو تو قاتل ہی دیئے
 خلقت نے دیا ہے اُسے حالب سا جواب

محسن مہوپالی

نذرِ جیبِ جالب

تذلیل کے حربوں سے رنجور نہیں ہوتا
تحسین کے جلوں سے مغرور نہیں ہوتا
جو کچھ بھی کہا اس سے انکار نہیں ہوتا
اور خوفِ حراست سے مستور نہیں ہوتا
حق بات بھی کہتا ہے بھر ظلم بھی سمہتا ہے
اور ملک میں رہتا ہے، مضرہ نہیں ہوتا
(جشنِ جالب کی تقریب منعقدہ ۲۴ مئی ۸۴ کو لاہور میں پڑھا گیا)



دہی روش ہے کو ہی دور ہے مگر چپ ہیں !
خرد ہے مہربان، صاحبِ نظر چپ ہیں !
وہ کون سا ہے ستم کل تھا اور آج نہیں
کسی کے لب پر مگر حرفِ احتجاج نہیں
وطن کے دوش پہ ہیں پیرِ تسمہ پا کی طرح
خدا کے ملک پہ قادر ہیں جو خدا کی طرح
کوئی نہیں ہے انھیں بڑھ کے روکنے والا
کوئی نہیں ہے انہیں بڑھ کے روکنے والا
سرِ بساطِ سخن یوں تو ہم نوا ہیں بہت !
نہیں ہے ایک بھی جالبِ غزل سرا ہیں بہت
(ماہنامہ تخلیق لاہور فروری ۹۴)

ابھی تو موسم ہے عاشقوں کا حبیب جالب کا لوح

ابھی تو پچھلے غنوں کا لوح
جو قریب قریب مسک رہا ہے
جو گرمیوں کی حرارتوں سے
بدن کی ہر آنکھ سے رواں ہے
اُسی سے فرصت کہاں
کہ ہم تیری فرقتوں کو
قبول کرتے
ابھی تو کچھ دیر اور مکتے حبیب جالب!
ابھی تو کچھ دیر اور مکتے
ابھی تو سکتے ہیں میرے
یار و لوح گر بھی
کیجن کی آنکھیں زبان بن کر
کھڑے اندھروں کو دیکھتی ہوں
ابھی تو زنجیرِ نوحہ گر ہے
ابھی تو ظلم و ستم کے مالک
ابھی تو پچھلے غنوں کا لوح
جو قریب قریب مسک رہا ہے
جو گرمیوں کی حرارتوں سے
بدن کی ہر آنکھ سے رواں ہے
اُسی سے فرصت کہاں
کہ ہم تیری فرقتوں کو
قبول کرتے
ابھی تو کچھ دیر اور مکتے حبیب جالب!
ابھی تو کچھ دیر اور مکتے
ابھی تو سکتے ہیں میرے
یار و لوح گر بھی
کیجن کی آنکھیں زبان بن کر
کھڑے اندھروں کو دیکھتی ہوں
ابھی تو زنجیرِ نوحہ گر ہے
ابھی تو ظلم و ستم کے مالک

(غنوں لاہور جنوری - اپریل ۱۹۹۳ء)



مظفر وارثی

امراز رس ہے تعلیم دار ہے جالب
 ہر دورِ ستم کے لئے دیوار ہے جالب
 الفاظ کی حرمت ہے کہ ہے حکمت غار
 یا حوصلہ و جرأتِ انکار ہے جالب
 تصویرِ سیاست میں بھی اک رنگ ہے اس کا
 تاریخِ ادب کے لئے کردار ہے جالب
 آئینے سے بھی کوئی رعایت نہیں کرتا
 خودِ گھر ہے خود آگاہ ہے خود دار ہے جالب
 ہے جان اصولوں کی اطاعت نہیں کرتا
 دیوانگی ہے جہد ہے ایثار ہے جالب
 کذابِ خداؤں سے محبت نہیں کرتا
 سچائی کی صورت کا پرستار ہے جالب
 انصاف کا غالب ہے بے شک نہیں کرتا
 بیٹے کے لئے مرنے کو تیار ہے جالب
 اے تہمت ، روانیو ، اے خواہش ، خواہ
 بکے کے لئے آؤ خریدار ہے جالب
 تاروں سے تعلق ہے نہ سوزاپ سے ناٹ
 جو ریت سے اٹھتی ہے وہ بھکار ہے جالب
 وہ سچ میں بھی ، چاروں طرف بھی دہی اپنے
 اک نقطہ مرکز ہے کہ پرکار ہے جالب
 اموزہ کو پھر اس سے رقابت نہ ہو کیونکر
 فردا کی محبت میں گرفتار ہے جالب
 راہوں میں اندھیرا کسی سینہ تو ہے روشن
 تقدیر ہے سوئی ہوئی ، بیدار ہے جالب
 آواز میں کلیں کے چٹکتے کی صدا ہے
 ہو نذوقِ سماعت تو شرر بار ہے جالب
 یہ نذرِ خشن اس کے لئے کم ہے مظفر
 شاعر تو سبھی کا ہے ، مرا یار ہے جالب



نجیب احمد

دھنک سے خواب تھے کیا کیا پلک حنائی ہوئی
 نہ شب ڈھلی نہ در صبح تک رسائی ہوئی
 انہی کا خوں . روئے مقتل کی آہو ٹھہرا
 جو بات روک نہ پائے لبوں تک آئی ہوئی
 درِ نجات کھلے خنجر ہے خلقِ خدا
 بس ایک جاں ہے سو ہے داؤد پر لگائی ہوئی
 دلوں کی بات دلوں نے قبول ہی کب کی
 لبوں سے توڑ کے ناطہ کہاں پر آئی ہوئی
 نہیں کہ صرف گزشتہ عذاب تو نے سے
 کہ یہ گمزی بھی ہے جالب بھی پہ آئی ہوئی
 قدم دھرے تو زمین نے مجلس دیا ہے نجیب
 چلے تھے گھر سے تو سر پر گھٹا تھی چھائی ہوئی



حبیب جالب کی نذر



نقاش کاظمی

تو لفظوں کا جادوگر
تو تھا آوازوں کا شور
تجھ میں سکواروں کی کٹ مٹی
اور زنجیروں کی جھنکار
تو تھا سچائی کے پستے دریاؤں کا زور
تو نے وقت کی مصلحتوں کے
میںخانوں سے دور
زندانیوں میں
میدانوں میں
اپنی بزم سجائی
فن کاروں کی
سکواروں کی
تھا شمع جلائی
تو نے کہیوں کھلیانوں کے پتھوں بچ

جوشیے گیتوں کے بچ پھلوں کا پودا
سب سے الگ لگایا
سب کا بوجھ اٹھایا
ہم کو یاد ہے جالب تو نے
اک دن آکے "سر قتل"
قاتل ہاتھ کو پہنچوایا
لو کا سپ جلايا
تو نے اپنے لیے میں
ساحر اور پالیڈ کی کھن گرج سے لے کر
جوش کے ج جج
فیض کے سوز و ساز کا رنگ جلايا
اور گریبانوں کا پرچم
اونچا بہت اڑایا
اونچا بہت اڑایا



آج سے لگ بھگ ساڑھے چار ہزار سال پہلے مہابھارت
کی خونریز جنگ کے دوران
فلسفہ حیات و مرگ کی تشریح تو مین کے لئے
اٹھارہ ادھیواؤں پر مشتمل عظیم صحیفہ

گیتا

کی تخلیق ہوئی

اور آج کے ”مہابھارت“ میں
جبکہ ہماری سیاسی اور سماجی اقدار رو بہ تسنل ہیں
اور مذہب کا مقصد انسانی استحصال
اور دوسرے مذاہب کے خلاف نفرت و حقارت کی تشہیر و تبلیغ ہے

نند کشور و کرم پیش کرتے ہیں

انیسواں ادھیائے

جس میں موجودہ دور کے حالات و واقعات کے تناظر میں
تجزیہ حیات کیا گیا ہے۔

پبلیشرز اینڈ ایڈورٹائزرز

بے ۶ کوشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۱

تسلیم



الطاف حسین قریشی

حبیب جالب کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا اس نے اس نے نچلے طبقوں کے حقوق کی بات کی۔ اس کی شاعری میں انسانیت، انسان کے دکھ، سامراج کے خلاف مزاحمت کرنے اور ذہنی آزادی حاصل کرنے کا پیغام ہے وہ طبقاتی سوچ رکھنے والا، نڈر بہادر اور ایمان دار شاعر تھا۔ اگرچہ فیض احمد فیض بہت اہم اور بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انقلاب اور انسان پرستی کی سوچ اور فلسفہ کو پھیلانے کا کام کیا ہے لیکن ان کے خیالات صرف درمیانے اور پڑھے لکھے طبقے تک پہنچے ہوئے ہیں جبکہ حبیب جالب کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس نے فلسفہ اور انقلاب کا درس عوام کی روزمرہ کی بول چال کی زبان میں دیا لہذا وہ کھیت مزدور کسان، صنعتی کارکن اور دوسرے نچلے طبقوں کا شاعر ہے اس نے مزاحمت، انقلاب اور طبقاتی جدوجہد کا پیغام گھر گھر پہنچایا جو ساری عمر بری روایات کو مٹا دینے

اور حکمرانوں کے خلاف لڑتار باعوام کو اپنے اشعار کے ذریعے بیدار کرتا رہا اس نے عوام کو اپنی سیاسی شاعری کے ذریعے ظالم طبقات کے خلاف لڑنے کی جرات بخشی اور یہ لڑائی خود بھی شریک پر لڑی۔ اس نے اپنی پیڑ پر لاشیاں کھائیں لیکن ظلم کا پردہ چاک کرنے کی عادت کبھی ترک نہ کی یہی وجہ ہے کہ غالب آج بھی پاکستان کے عوام کی دل کی دھڑکن ہے۔

رشید مصباح

حبیب غالب عوام کا شاعر تھا وہ لفظ کی حرمت اور عوام کی ترجمانی کی علامت تھا۔ اس نے تمام زندگی جبر کی طاقتوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے بسر کی اس نے بچہ کہنے اور بچہ کی آواز بلند کرنے کا فریضہ سرانجام دیا وہ دانشوروں اور عوام کے درمیان ایک مضبوط رابطے کی حیثیت رکھتا تھا۔ بچہ بولنے، مزاحمت کرنے اور اپنے اشعار کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کے جرم میں حکمرانوں نے ہمیشہ اس کی زندگی عذاب بنائے رکھی لیکن اس نے ہر حال میں حق بات کہی۔

ضیاء علیگ

حبیب غالب سے میری ملاقات کراچی میں اس وقت ہوئی جب وہ بحیثیت شاعر نہ معروف تھے نہ مقبول۔ وہ اکثر شام کو صدر بازار کے کافی ہاؤس (اوپر کی منزل) تشریف لاتے تھے۔ جہاں روزانہ حاضری دینے کا میرا بھی معمول تھا۔ نہ میں حبیب غالب سے اس وقت متعارف تھا اور نہ ہی وہ مجھے جانتے تھے۔ مگر یہ تماشا وہ ہر شام ضرور دیکھتے تھے کہ میز کے ارد گرد کچھ معافی، کچھ ادب، اور شعراء بیٹھ کر خوش گپوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ خود ہی اجازت لے کر ہماری میز پر آگئے۔ اپنا تعارف کرایا۔ پھر سب سے پہلے مجھ سے ملے۔ اس کے بعد ان کا اٹھنا بیٹھنا ہم ہی لوگوں کے ساتھ ہونے لگا۔ ان دنوں وہ مالی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور نہ رہنے کا کوئی معقول ٹھکانہ تھا۔ میں نے رتن تالاب گورنمنٹ گرلز کالج کے عقب میں ایک فلیٹ چھ سو روپے بجٹی دے کر لے لیا تھا۔ جہاں ایک پرانی مسبری اور چند کرسیاں اور ایک میز شلام گھر سے لا کر ڈال دی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مکان کے تعلق سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔ میرے فلیٹ چلے آؤ، وہاں میں اور میرے کزن رہتے ہیں۔ ان کے پاس ایک بچھو تھا اور ایک لوہے کا صندوق، وہ تین مہینے کے لگ بھگ اسی طرح میرے

فلیٹ میں رہے کہ رات کو کسی وقت اگر اپنا بستر مسہری کے بچے سے نکال کر فرش پر بچھا کر سو جاتے تھے۔ جب اٹھتے تھے تو ہنادھوکر تلاش معاش میں نکل جاتے تھے۔ کبھی دن میں آجاتے تھے۔ (ایک کبھی انہیں کے پاس تھی) تو کرسی پر دراز ہو کر شعر کہتے تھے۔ یا خط و خطہ لکھا کرتے تھے۔ ہم ایک دن وہ کہیں اور منتقل ہو گئے۔ اُس کے بعد پنجاب واپس چلے گئے۔ میری اُن سے عرصہ تک ملاقات نہ ہوئی۔

ایک بار جب میں انجمن ترقی اُردو، سندھ ہراجے کی طرف سے مشاعرہ کرنے والا تھا۔ تو کراچی سید محمد جعفری کے پاس گیا جن کے ذکر کراچی کے مشاعروں کو مدعو کرنا، مشاعرہ گاہ تک لانا اور نذرانہ وغیرہ کی بات ملے کر نکلتا۔ اس بار انہوں نے حبیب جالب کا نام تجویز کیا تو میرا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ جعفری صاحب بچا نہیں گئے۔ مجھے یقین دلا کہ وہ مشاعرے کا شاعر ہے۔ تمہیں اور تمہارے سامعین کو مایوسی نہیں ہوگی۔ تم اُسے ملا کر تو دیکھو۔ میں نے مدعو کر لیا۔ ریاست خیر پور میں بھی ایک دن پہلے مشاعرہ تھا۔ وہ ان تمام شعراء کے ساتھ (ادیب سہارن پوری، محشر بدایونی وغیرہ) کے ساتھ حیدر آباد سندھ تشریف لائے اور مشاعرے میں حصہ نہ لے سکے۔ ایک تو ان کا حسن ادا نیکی۔ دوسرے عوام پسند شعرا دوسرے کلام کا ٹیکھا ہوا ایک میں ہی کیا، سارے سامعین تھک چکے ہوئے اور کھو بی (یہ حبیب جالب کی اس شہر میں پہلی قدم رنجانی تھی) میرے سامنے ان کا جو ۸-۹ سال پہلے کا خاکہ تھا وہ اس سے بہت مختلف نکلے۔

افسوس کہ حبیب جالب سے پھر پاکستان میں میری ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ وہ اُردو کے حلقہ شاعروں کی دعوت پر ایک بار کینیڈا اور تشریف لائے، وہ بھی تنہا یعنی دوسرے ادباء اور شعراء کے ساتھ نہیں۔ ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام صرف انہیں کی خاطر ہوا کہ باہر کا کوئی اور شاعر مدعو نہیں تھا۔ مجھے کاوی عالم تھا جو ان مشاعروں میں ہوتا ہے۔ دس بارہ شاعر برصغیر سے تشریف لاتے ہیں۔ انہیں یہاں آنے کا ویزا بڑی مشکل ملے تھا۔ کئی اور نشستیں اُن کے اعزاز میں ہوئیں۔ مگر وہ ڈرنٹو سے بالا بالا ہی نکل گئے۔ یہ باہر سے آیا ہوا پہلا شاعر تھا جو صرف اپنے اعتقادات میں گم۔ اپنے Convictions سے لوٹا ہوا۔

اپنی شاعری میں گم۔ جیسے یہ مجھ کو ابش نہ تھی کہ ریٹا گرافا زہی دیکھ لے اس ملک میں جہاں اہل علم، اہل قلم، اہل دانش و بینش کی بے حد تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں بقول حبیب جالب ہے۔

کبھی گریباں چاک ہوا کبھی ہوا دل خون
ہمیں تو بونہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بچے
جسم پر جو زخموں کے نشان ہیں اپنے تئیں ہیں
ملی ہے ایسی دلاؤ دھاتی کے سڑک کے بچے

حیف مدحیف

فیض احمد فیض جہدِ بہاں آئے تھے تعریف و شاموں کا ذکر محبت سے کرتے تھے۔ احمد فراز اور حبیب جالب۔
(تخلیق لاہور اگست ۱۹۹۳ء)

فیروز مکرچی

افروز خالدي کا نگاہانی موت کے چند دن بعد ہی حبیب جالب بھی ہمیں الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی موت پر پاکستان کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا اس کا اندازہ میں کر سکتی ہوں اور میرے خیال ہے حبیب جالب جیسے شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کر کے ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اپنی سنگ دلی اپنی بے مہرئی اپنی تن آسانی کے لئے ان جیسی شخصیتوں سے معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ اب وہ ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں انہیں ہماری رفاقت ہماری دولت ہماری ہمدردی کی ضرورت نہیں رہی وہ اس سے بہت بلند ہو گئے۔ اب ہم صرف الفاظ سے ہی اپنی بے اعتنائی کا مداوا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ اور اس خراج عقیدت میں صداقت بھی ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں ان کی بلندی اور ان کی قربانیوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ حبیب جالب جیسے انسان اب پیدا نہیں ہوں گے کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے سیاسی حالات بدل گئے ہیں اور ہماری قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ وہ صرف حساس دل و دلکش ترنم اور سیاسی شعور کے ہی مالک نہیں تھے میرا خیال ہے ہمارے عہد کا کوئی بھی شاعر اس طرح عوام کے قریب نہیں آیا جس طرح وہ آئے تھے اور اپنی زندگی انہوں نے ان کے ساتھ مدغم کر دی تھی وہ گفتار کے غازی تھے اور کردار کے بھی اسی لئے برطانیہ کے آردو ادیبوں اور آردو برادری نے جس طرح انہیں خراج عقیدت پیش کیا وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ ہمارے جذبات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنا وطن چھوڑ کر دیارِ غریب آکر بس گئے ہیں لیکن اپنے وطن کی یادیں ابھی ہمارے دل میں تازہ ہیں وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ وہ مدغم نہیں ہوئی ہیں بلکہ اپنی ذہنی دنیا میں ہم ان کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ جو نقش ہمارے ذہن میں ہے اس میں تبدیلی ہمارے لئے آسانی سے قبول کرنا مشکل ہے۔ ان میں صرف وطن کی گلیوں اور عریضوں کی یادیں ہی شامل نہیں ان ہستیوں کے نقش بھی شامل ہیں جو عہد ساز تھیں اسی لئے ان کی موت کا اثر ہم پر شدید ہوتا ہے۔ جب ہاتھ اچکھتی ہیں کہ ظلم و تشدد، لوٹ کھسوٹ، مزدوروں کا غم، سرمایہ دارانہ نظام کا عذاب، غریبوں کا دکھ دیکھ کر کڑھنے والا شاعر انقلاب اپنے پیچھے ایک پیغام چھوڑ گیا اور عوام کو ایک سہارا دے گیا تو وہ ہمارے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شش لاشاری نے بالکل صحیح کہا کہ حبیب جالب کے خاندان کی سرپرستی کرنا ہمارا اور ہماری قوم کا فرض ہے

اس سلسلے میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی قہر مند منوجھائی کی ہے۔ انہوں نے کھری کھری ہاتیں کی ہیں انہیں حبیب حالیہ کی موت ہی نہیں زندگی میں ان کی اور ان کے خاندان کی شکایت پر غم و فتنہ بھی ہے۔

حبیب حالیہ کی بیوی نے پاکستان کے وزیر اعظم کے سوال پر۔ وہ بڑی تلخی سے لکھتے ہیں کہ کشور ناہید نے تو کسی سے نہیں پوچھا تھا کہ حبیب حالیہ کے جیل میں بند ہونے کی صورت میں ان کی بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ انہوں نے حبیب حالیہ سے دوستی کا دم بھرنے والوں پر ایک جرمانہ عائد کر دیا تھا اور اس وقت تک عائد کر رکھا تھا حبیب نکسہ وہ جیل سے باہر نہیں آئے تھے حبیب حالیہ کے بیوی بچوں کی ایک چھت کی حفاظت کے لئے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہاں کہاں نہیں گئیں بیگم حالیہ کے سامنے دوستی اور انسانیت کی یہ مثالیں تھیں اس نے انہوں نے بڑی خود داری سے نواز شریف کے سوال کا جواب دے کر گورنمنٹ کی مدد کو رد کر دیا۔ حبیب حالیہ کے یہاں تہذیب تلخ اندھیرا نہیں ہے اس نے اس خاتون کے بار کو ہلکا کرنا ہم سب کا ہی فرض ہے۔ ہمارے سامنے شیر شاہ قریشی کی فراغ دلی کی مثال ہے جنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ حالیہ ٹرسٹ کے لئے پانچ ہزار پونڈ دیں گے۔ ایسی رقم دینا ہم سب کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جس طرح کشور ناہید نے حبیب حالیہ کے دوستوں پر جرمانہ عائد کر دیا تھا ہم بھی اپنے اوپر کر سکتے ہیں اور ہر مہینے ایک رقم حالیہ ٹرسٹ کے لئے مقرر کر سکتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اب کمیٹی قائم کی جائے۔ جس کے سپرد یہ کام ہو کہ وہ ایک فہرست تیار کریں۔ جس میں اس شخص کا نام شامل ہو جو اردو ادب سے شغف رکھتا ہے جو حبیب حالیہ کی شاعری ان کی شخصیت ان کی قربانیوں سے متاثر ہوا ہے لیکن چندہ جمع کرنے کے لئے اردو کے اخبارات اور مفتہ وار رسالے اور ماہنامے ذمہ داری لے لیں تاکہ برطانیہ کے سارے اردو داؤں کی وجہ اس طرف مہذول کرائی جائے کتنی ہی کم رقم ہو لیکن حالیہ ٹرسٹ کے لئے کسی ایک پتہ پر بھیجیں اور کمیٹی کسی بھی بینک میں حالیہ ٹرسٹ کا ایک اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کرتی رہے یہ کام ایسا مشکل نہیں ہے کہ اگر ہم کو شمش کریں تو کیا نہ جاسکے اس ملک میں اس قسم کا کام ہوتا رہتا رہتا ہے اس کے علاوہ ہمارے سامنے کشور ناہید جیسی مشہور معروف ہستی نے ایک مثال قائم کر دی ہے میر انبال ہے کہ یہ کام لگن سے کرنا ہو گا اور بار بار لوگوں کو یاد دلانا ہو گا کہ حبیب حالیہ کا ہم پر کیا فرض ہے۔ حبیب حالیہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے ساری زندگی دیر پر گزار دی اگر فیض جتوئی کے لئے فیض میڈر کے ان کے اس 'بین الاقوامی دوستی اور حقوق انسان کے پیغام کو زندہ رکھا گیا ہے تو برطانیہ میں اردو ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ حالیہ کی قربانی 'عام انسانوں کے حقوق کے لئے سید سپر کے لڑنے کی' جیلیوں میں محبتیں اٹھانے کی داستانوں کو بھول نہ جائیں اب کون آئے گا جو ہانگ واپل جرات زندان سے اعلان کرے کہ:

میں بھی خالک نہیں تختہ دار ہے
میں بھی مصلحتوں ہوں کہہ دو اعتبار ہے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار ہے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

کیا ہم اس آواز کو بھلا سکتے ہیں؟ اگر نہیں بھلا سکتے تو ہمیں خود سے سوال کرنا ہے کہ اسے زندہ رکھنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

(اقتصاد: ماہنامہ مشورہ کراچی اگست ۱۹۹۳ء)

قتیل شفائی

حبیب جالب پاکستان میں عوام کی فکری آزادی کا سب سے بڑا نمائندہ اور سپاہی تھا جو ہمیشہ انقلاب اور آزادی کے گیت گاتا رہا۔ ظالم طبقوں کے چہرے ننگے کرتا رہا اس نے اپنے افراد خانہ کی تربیت بھی اسی رنگ میں کی۔ اس کی وفات ہر کسی نے جالب کے بیٹے سے کہا کہ جالب اتنا اہم اور قدر آور شاعر تھا لیکن حکمرانوں میں سے کوئی بھی اس کی وفات پر تعزیت کے لئے نہیں آیا۔ تو اس کے بیٹے نے کہا کہ ان کا نہ آنا ہی ہماری عزت افزائی ہے کہ وہ حکمرانوں کا نہیں عوام کا شاعر تھا۔

شوکت چوہدری

عظیم شاعر حبیب جالب عوام کا ہی ایک حصہ تھا۔ وہ عوام انقلاب اور جدوجہد کے فلسفے پر یقین رکھنے والا ایک انقلابی تھا اس نے جدوجہد کے راستے پر مسلسل ڈنڈے کھائے مگر عوام کے ساتھ کدھے سے کدھا جوڑ کر چلا۔ جالب کا یہ درس ہے کہ حکمرانوں اور سامراج کے خلاف جدوجہد جاری رہے۔ اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عوام خود حکمران نہیں بن جاتے۔

قمریوش

جالب پاکستان کے لکھنے والوں کے لئے قلم اور عمل کے ذریعہ جدوجہد کرنے

کا بہت بڑا ستارہ ہے۔ اس نے تلخ سے تلخ زندگی گزار لی مگر ایک بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے بیچے بسر کیا لیکن کلہر سنی ہر جگہ اس کی زبان پر رہا۔

یوسف حسن

حبیب جالب نے اپنے قلم اور عمل دونوں سے جو کارنامے انجام دیئے ان کے لئے پاکستان کے جمہوریت پسند اور روشن خیال عوام، دانش ور اور اہل قلم اُن کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے، اور اُن کی تحسین کا پورا حق شاید کبھی ادا نہ ہو سکے۔ اُن کے ساتھ وہ سارے اہل قلم بھی اپنے اپنے درجے پر سرسبز جانے کے لائق ہیں، جنہوں نے اس آمریت کی موافقت کرنے والے اہل قلم کے مقابلے میں قلم سے یا قلم اور عمل دونوں سے کسی نہ کسی سطح پر اس کی مخالفت اور جمہوریت پسند قوتوں کی معاونت کی، حبیب جالب اور ستار طاہر کے علاوہ مرحوم جن میں سے فیض احمد فیض، منظور عارف، ظہور نظر، حمزہ لکھیاؤی، خاور رضوی، سیف زلفی، احمد شمیم، تنویر جیلانی، اور سبط علی صبا کے نام یاد آ رہے ہیں۔ یہ سارے اہل قلم بنیاد پرست آمر کے نقطہ نظر کی رو سے ”تیسرے دھارے“ سے تعلق رکھنے والے ”اسلام دشمن“ اور ”پاکستان دشمن“ اہل قلم تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں آمریت دشمنی اور جمہوریت پسندی کا اظہار کیا۔ بنیاد پرست آمریت کے گیارہ سالوں میں پاکستان کو جو کچھ بنادیا گیا اور پھر اس دور میں جمہوریت پسند سیاسی اور ادبی قوتوں نے جو کام کئے اور جو عذاب سہہ اس کا ابھی تک جامع جائزہ سامنے نہیں آیا۔ خاص طور پر جمہوریت پسند اہل قلم کی خدمات کا قلمی اعتراف تو کیا یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہوا، کہ اس دور میں کتنی مطبوعات ضبط ہوئیں اور کتنے اہل قلم نے مختلف سزائیں جگمگتے عہدِ آمریت کے بارے میں ممتاز صحافی اور ادیب احمد یسیر نے لکھا ہے:-

”اس طویل سیاہ رات کے دوران قوم کو غیر سیاسی بنایا گیا۔ تشدد قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا بن گیا۔ اسلام کو مسخ کیا گیا۔ فرقہ پرستی کو ریاستی تحفظ دیا گیا۔ عورتوں اور اقلیتوں کی تحقیر کی گئی۔ پولیس کو خاموش کر دیا گیا۔ بیرون نے گھروں اور درکشاپوں پر بیخاری، پولیس کی دہشت گردی قابل قبول ٹھہری، عدلیہ کو بدعنوان بنایا گیا، انتظامیہ کو شخصی جاگیر بنایا گیا، معیشت زمین بوس ہو گئی۔ نسل پرستی اور علاقہ پرستی نے پاکستانی

قوم پرستی کی تفسیح کردی۔ اور قوم اپنے مستقبل پر یقین کھو بیٹھی۔“

(ترجمہ) (دی فریڈ پریس پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء)

اور یہ سب کچھ ہوا اُس کے نام پر جو اسلام کے مقدس نام پر جو مسادات و مواخات اور عدل و آزادی کی سب سے زیادہ تعلیم دینے والا مذہب ہے۔ مگر اس دور میں آمریت کی موافقت اسلام دوستی اور پاکستان دوستی ٹھہری اور جمہوریت پسندی اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی قرار پائی۔!

اکادمی ادبیات کی ایک اہل قلم کانفرنس (مستقلہ ۱۹۸۵ء) میں جن جمہوریت پسند اہل قلم کی تحریروں کے اقتباسات اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے طور پر پیش کئے گئے ان میں سے تین نام احمد فراز، اختر حسین جعفری اور احمد جاوید کے ہیں۔ حبیب جالب کے علاوہ جمہوریت پسند اہل قلم کسی نہ کسی طرح کم یا زیادہ زیر عتاب آئے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ محمود شام، نواز ملک، شفقت تنویر مرزا، سجاد حیدر ملک، سجاد شیخ، فہیدہ ریاضی، اور تنویر سہرا۔

(تخلیق لاہور۔ اگست ۱۹۹۳ء)

یونس ادیب

وہ ادیب جو انعام و اکرام، ایوارڈ، شہرت اور چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے حکمرانوں کے پٹھوں پکے ہیں انہیں حبیب جالب کی زندگی سے سبق سیکھتے ہوئے اس کی راہ پر چلنا چاہیے اور حکمرانوں سے رشتہ توڑ کر عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہیے کہ اسی میں ان کی عظمت ہے۔ انہوں نے کہا کہ حبیب جالب نے کبھی اپنے فن کو بچا نہیں بلکہ اپنی شاعری کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کیا اور عوام کے دشمنوں کو کبھی چین کی نیند سونے نہیں دیا۔ وہ عوام کی اسگوں اور خواہشوں کے لئے سچے خواب بناتھا اور ان خوابوں میں اپنے خون سے رنگ کبر تاتھا جو نیچے طبقوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ❀❀



Regd. No. 43755/83

Registered with the Registrar of Newspapers in India

Phone : 2247619

Alami Urdu Adab 1994

(The only Reference Journal in Urdu)

Habib Jalib Number

اردو کا ادب عالمی ادب

عالمی ادب

Price

(Inland) Rs. 150/-

(Foreign) US Dollar 30

Place of Printing Sanjeev Offset Printers, Delhi.
Statement about ownership and other particulars about

FORM IV

(As required by Rule 8 of Press Registrar's Act)

Place of Publication	Delhi
Periodicity of Publication	Half Yearly
Printer's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.
Publisher's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.
Editor's Name	Nand Kishore Vikram
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.
Owner's Name	Nand Kishore Vikram
Address	J-6 Krishan Nagar, Delhi - 110051.

I, Nand Kishore Vikram hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Nand Kishore Vikram
Publisher.

بابت فارم ۴
رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق
بیان بابت ملکیت و جملہ تفصیلات
۱۔ سالانہ عالمی اردو ادب
۲۔ مقام اشاعت: جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
۳۔ وقفہ اشاعت: ششماہی
۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔



یوگا سب سے زیادہ فروخت ہونیوالا ہفت روزہ

دنیا کے مضامین آج یورپ، مشرق وسطیٰ اور پاکستان کے اردو اخبارات میں عام طور پر اور انگریزی، عربی، فرانسیسی اخبارات میں وقتاً فوقتاً نقل کئے جاتے ہیں۔

دنیا کے انداز تحریر، سٹنگ اور سرخیوں کی نقل کرنا ہندوستان و پاکستان کے اخبارات و رسائل باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔

دنیا کو آج پوری دنیا میں اقلیتوں کے جذبات و احساسات کا بیباک ترجمان تسلیم کیا جاتا ہے۔

دنیا نئے نئے مضمون، اشتہارات، کاروبار کے ترقي کے ضمانت مہر ہے۔

اُدھے جہاں **نئی دنیا** ہے وہاں

NAI DUNYA
WEEKLY

2, FF, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013